نالۂ شب گیر
(ناول)
مشرف عالم ذوقی

نالۂ شب گیر

مشرف عالم ذوقی

کوئی تو نالۂ شب گیر پہ باھر نکلے
کوئی تو جاگ رھا ھوگا دیوانے کے سوا

—نعمان شوق

نالۂ شب گیر

ناول

مشرف عالم ذوقی

زیراہتمام

ذوقی پبلیکیشنز

D-304 تاج انکلیو،لنک روڈ، گیتا کالونی دہلی-110031

NALAYE SHAB GEER (Novel)
WRITER : MUSHARRAF ALAM ZAUQUI
Edition : 2015
Rs. : 500/-

نام کتاب : نالۂ شب گیر (ناول)
مصنف : مشرف عالم ذوقی
رابطہ : D-304، تاج انکلیو، گیتا کالونی دلّی۔110031
09899583881,09958583881
کمپوزنگ : سعید احمد معروفی 9560062765
تعداد : 500
صفحات : 400
سن اشاعت : 2015
قیمت : 500روپے
مطبع : نیو پرنٹ سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی۔
ڈسٹری بیوٹر : محمد سلیم (علیگ) ادب سلسلہ (سہ ماہی)، آر202
: گلی نمبر، 10رمیش پارک، لکشمی نگر۔ دہلی-92
: حالی پبلیشنگ ہاؤس، 275/6 للتا پارک، لکشمی نگر، دہلی۔

Published by

ZAUQUI PUBLICATIONS
D-304 Taj Enclave, Geeta Colony, Delhi-110031
E-mail : zauqui2005@gmail.com
Ph : 9899583881,9958583881

ہر اس لڑکی کے نام

جو باغی ہے

اور اپنی شرطوں پر

زندہ رہنا جانتی ہے

فہرست

کچھ ’نالۂ شب گیر کے بارے میں‘

’’وہ اپنے جسم کے تنے سے اپنے گرے پتّے اُٹھاتی ہے
اور روز اپنی بند مٹھی میں سسک کے رہ جاتی ہے/
وہ سوچتی ہے
کہ انسان ہونے سے بہتر تو وہ گندم کا ایک پیڑ ہوتی /
تو کوئی پرندہ چہچہاتا تو وہ اپنے موسم دیکھتی/
لیکن وہ مٹی ہے، صرف مٹی
وہ اپنے بدن سے روز کھلونے بناتی ہے/
اور کھلونے سے زیادہ ٹوٹ جاتی ہے....../
وہ کنواری ہے، لیکن ذلت کا لگان سہتی ہے/
وہ ہماری ہے
لیکن ہم بھی اُسے اپنی دیواروں میں چُن کے رکھتے ہیں/
کہ ہمارے گھر اینٹوں سے بھی چھوٹے ہیں/

____ **سارا شگفتہ**

نالۂ شب گیر — سوچتا ہوں، آخر مجھے اس ناول کو تحریر کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی — اقبال نے کہا تھا۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

لیکن کیا سچ مچ ایسا تھا؟ صدیوں میں تصویر کائنات سے مردوں نے تتلیوں جیسے اس کے رنگ کو ’کھرچ‘ کر صرف استعمال اور استحصال کا ذریعہ بنا دیا تھا — حقیقت یہ ہے کہ شروع سے مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ مرد آزادی اور بڑے بڑے فلسفوں پر گفتگو کرنے کے باوجود عورت پر پابندیاں لگاتا ہے — گھر کی عورت پہروں، بندشوں اور گھٹن کا شکار کیوں رہتی ہے — خصوصی طور پر پاکستانی عورتوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ راز بھی افشاں ہوا کہ وہاں اگر ایک لڑکی انجینئرنگ یا میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ ڈاکٹر یا انجینئر بن بھی جائے — کیونکہ اس کی تقدیر کا فیصلہ وہ کرے گا، آئندہ اس کی زندگی میں آئے گا — کچھ عورتیں مجازی خدا، شوہر اور شریک حیات کے ناموں سے بھی خفا نظر آئیں۔ یہ حال صرف پاکستان کا نہیں، ہندوستان کا بھی ہے۔ بنگلہ دیش کا بھی ہے — میٹروپولیٹن شہروں کی باتیں چھوڑ دیں تو عورت آج بھی وہی ہے — گھٹن اور بندش کا شکار — جہاں اس کے پاس کوئی شناخت نہیں اور وہ مدتوں سے اپنی آزادی کے احساس کو ترس رہی ہے —

عورت آج برانڈ بن چکی ہے۔ ایک ایسا برانڈ، جس کے نام پر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اپنے پروڈکٹ کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لئے اس کی مدد لیتی ہیں۔ چاہے وہ جنیفیر لوپیز ہوں، ایشوریہ رائے یا سشمتا سین۔ سوئی سے صابن اور ہوائی جہاز تک، بازار میں عورت کی مارکیٹ ویلیو، مردوں سے زیادہ ہے۔ سچ پوچھئے تو تیزی سے پھیلتی اس مہذب دنیا، گلوبل گاؤں یا اس بڑے بازار میں آج عورتوں نے ہر سطح پر مردوں کو کافی پیچھے چھوڑ دیا ہے— یہاں تک کہ ڈبلیو ڈبلیو ایف میں بھی عورتوں کے حسن اور جسمانی مضبوطی نے صنف نازک کے الزام کو بہت حد تک رد کر دیا ہے۔ یعنی وہ صنف نازک تو ہیں لیکن مردوں سے کسی بھی معنی میں کم یا پیچھے نہیں۔ صدہا برسوں کے مسلسل جبر وظلم کے بعد آج اگر عورت کا نیا چہرہ آپ کے سامنے آیا ہے تو یقیناً آپ کو کسی غلط فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عورت آپ اور آپ کی حکومت کی بیڑیاں توڑ کر آزاد ہونا چاہتی ہے— اور اب آپ اُسے روک نہیں سکتے۔

سینکڑوں، ہزاروں برسوں کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو عورت کا بس ایک ہی چہرہ بار بار سامنے آتا ہے۔ حقارت، نفرت اور جسمانی استحصال کے ساتھ مرد کبھی بھی اُسے برابری کا درجہ نہیں دے پایا— عورت ایک ایسا 'جانور' تھی، جس کا کام مرد کی جسمانی بھوک کو شانت کرنا تھا اور ہزاروں برسوں کی تاریخ میں یہ 'دیوداسیاں' سہمی ہوئی، اپنا استحصال دیکھتے ہوئے خاموش تھیں— کبھی نہ کبھی اس بغاوت کی چنگاری کو تو پیدا ہونا ہی تھا۔ برسوں پہلے جب رقیہ سخاوت حسین نے ایک ایسی ہی کہانی 'مرد' پر لکھی تو مجھے بڑا مزہ آیا۔ رقیہ نے عورت پر صدیوں سے ہوتے آئے ظلم کا بدلا یوں لیا کہ مرد کو، عورتوں کی طرح 'کوٹھری' میں بند کر دیا اور عورت کو کام کرنے دفتر بھیج دیا۔ عورت حاکم تھی اور مرد آدرش کا نمونہ— ایک ایسا 'دو پایا مرد'، جسے عورتیں، اپنے اشاروں پر صرف جسمانی آسودگی کے لئے استعمال میں لاتی تھیں۔ میں رقیہ سخاوت حسین کی اس کہانی کا دلدادہ تھا اور بچپن سے کسی بھی روتی گاتی مجبور و بے بس عورت کو دیکھ پانا میرے لئے بے حد مشکل کام تھا— سچ پوچھئے تو میں عورت کو کبھی بھی دیوداسی، بڑنی، سیکس ورکر، نگر بدھو، گنیکا، کال گرل یا بار ڈانسر کے طور پر دیکھنے کا حوصلہ پیدا ہی نہ کر سکا۔ بادشاہوں یا راجاؤں مہاراجاؤں کی کہانیوں میں بھی ملکہ یا مہارانی کے 'رول ماڈل' کا میں سخت مخالف رہا۔ میں نہ اُسے شہزادی کے طور پر دیکھ سکا، نہ ملکہ عالم یا مہارانی کے طور پر وہ مجھے مطمئن کر سکیں— کیونکہ ہر جگہ وہ مردانہ سامراج کے پنجوں میں پھنسی کمزور اور ابلا نظر آئیں۔ خواہ انہوں نے اپنے سر پر ملکہ کا تاج یا شہزادیوں سے کپڑے پہن رکھے ہوں۔ تاریخ اور مذہب کی ہزاروں برسوں کی تاریخ میں، خدا کی اِس سب سے خوبصورت تخلیق کو میں لاچار، بدحال اور مجبوری کے 'فریم' میں قبول نہیں کر سکتا تھا— ایسا نہیں ہے کہ یہ سب لکھ کر میں ان لوگوں کی سخت مخالفت کر رہا ہوں، جو عورت کی حمایت میں صفحات در صفحات سیاہ کرتے رہے ہوں۔ ممکن ہے، بلندی پر پہنچی عورت کے لئے وہ اپنی طرف سے بھی ایک لڑائی لڑ رہے ہوں، مگر آج کی زیادہ تر کہانیوں میں یہی عورت مجھے اتنی مجبور و بے بس نظر آتی ہے، جیسے آپ بیچ سڑک پر اُسے ننگا کر رہے ہوں— چلئے مان لیا۔ بے حد مہذب، آزاد ہندستان کے کسی گاؤں، قصبے میں ایک ننگا ناچ ہوتا ہے— اجتماعی عصمت دری یا کوئی بھی ایسا جرم سرزد ہوتا ہے، جس میں ایک کمزور، بے سہارا عورت کا دامن تار تار ہو جاتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہی ہے، ایک بار وہ اپنی عصمت دری کا ماتم کر چکی ہے۔ یہ کیسی فنکاری ہے کہ بار بار ایک جھوٹی تخلیق کے لئے آپ اس کو مزید عریاں کرنے پر آمادہ ہیں— شاید زمانہ قدیم سے افسانوں کا یہی سب سے بہتر اور پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ جس پر آزادی کے بعد کی ترقی پسندی نے بھیانک، دانشورانہ انداز میں سعی کی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بہار، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، راجستھان یا ہندستان کے قبائلی علاقوں یا گاؤں میں ایسے حادثے نہ ہوتے ہوں— لیکن بے حد ذائقہ دار انداز میں اُنہیں پیش کرنا بھی عریانیت کی حدود پار کرنا ہے۔ ہماری کہانیاں مادام باواری یا اناّ کارنینا کی سطح پر ہے۔ عورت کو دیکھنے سے ہمیشہ گریز کرتی رہی۔

ایسا کیوں ہے، یہ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا— لولیتا سے دی اسکارلیٹ لیٹر تک، ایسا نہیں ہے کہ عورتوں پر ہونے والے ظلم اور استحصال کے خلاف وہاں نہیں لکھا گیا، مگر مغرب میں ادب سے متعلق زیادہ تر موضوعات کا محور یا مرکز صرف یہ جسمانی استحصال نہیں ہے۔ لیکن ہمارے یہاں اردو ہندی دونوں زبانوں میں محض ایک کمزور اور ظلم سہتی ہوئی عورت کا تصور ہی رہ گیا ہے— کیا آج ایسا ہے—؟ صرف چھوٹے موٹے گاؤں، قصبوں میں ہونے والے واقعات کو درکنار کیجئے— آپ کہہ سکتے ہیں، بڑے شہروں میں بھی اس طرح کے واقعات عام ہیں— جیسے سیکس اسکنڈلس سے لے کر عورتوں کو زندہ جلائے جانے تک کی داستانیں ابھی بھی مہذب دنیا کا مذاق اُڑانے کے لئے کافی ہیں—

اس حقیقت کو تسلیم کئے جانے کے باوجود مجھے احساس ہے کہ یہ وہ موضوعات ہیں، جنہیں پریم چند سے منٹو تک ہزاروں لاکھوں بار دہرایا جا چکا ہے — اور اس سے بھی بڑا ایک سچ ہے کہ نئے ہزارہ کا سورج طلوع ہونے تک عورت نے اپنی ہر طرح کی بیڑیاں توڑ کر آزاد ہونے کی بھی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ جہاں تک میری بات ہے، نہ میں اُسے غلام دیکھ سکتا ہوں، نہ کمزور — نہ وہ مجھے شاہ بانو کے طور پر قبول ہے اور نہ ہی عمرانہ کے طور پر — میں اُس پر قدرت کی صناّعی دیکھتا ہوں اور یہی چیز میرے ادب کے لئے نئی نئی فنتاسیوں کو جنم دے جاتی ہے —

یعنی وہ ہے ایک پُراسرار ترین مخلوق —

رائیڈر رز ہیگرڈ کی 'شی' کی طرح — ایک چونکا دینے والی حقیقت — '

'جسم — ' جسم سے جسم تک — وہ ایک آگ ہے، شرارہ ہے۔ وہ اپنی خوبصورتی اپنے جمال سے آپ کو 'بھسم' کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے —

تو آپ اپنی کہانیوں میں اس عورت کو کیوں نہیں تلاش کرتے!'

میرے ساتھ مشکل یہی ہے کہ میں عورت کے لئے ہمدردی کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ میرے سامنے اُسے دیکھنے اور محسوس کرنے کے لئے دوسرے فریم بھی ہیں۔ میں عورت کو صرف مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا — وہ مجھے فنتاسی کے لئے اتنی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یہ نام آتے ہی کسی دوسری دنیا کی مخلوق یا جنت کے دروازے یا 'پری لوک' کا تصور سامنے آجاتا ہے۔ وہ محبت بھی کرتی ہیں اور ایسی محبت کہ اُس کی محبت کے آگے نہ صرف سجدہ کرنے کی خواہش ہوتی ہے بلکہ آپ سو بار مر کر سو بار زندہ ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک نہ ختم ہونے والا 'اسرار' ہے۔ اُس کی خوبصورتی آپ الفاظ میں قید نہیں کر سکتے۔ اُس کا خوبصورت جسم آپ کے سارے تصورات سے زیادہ شیریں اور غیر یقینی حد تک آپ کے الفاظ کو کھوکھلا اور بے معنی بناتا ہے، کیونکہ وشوامتر کی اس مینکا کو آپ الفاظ کے ذریعہ باندھ ہی نہیں سکتے۔ یعنی، عورت ہر بار میرے لئے طلسم ہوشربا کی ایک ایسی ساحرہ بن کر آتی ہے، جسے پلٹ کر دیکھنے والا انسان پتھر کا ہو جاتا ہے۔ ناقابل یقین، حسن کا مجسمہ اور تخلیقی محرکات کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ۔

وہ ندی بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ کوئی سونامی لہر، کوئی جوار بھاٹا، کوئی سیلاب شرارہ، سیلاب، جھومتا گاتا آبشار۔ وہ سب کچھ ہے اور نہیں بھی ہے۔ وہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی 'پری کتھا' ہے۔ وہ دنیا کی ساری غزلوں، نظموں سے زیادہ خوبصورت اور 'پُراسرار بلا' ہے۔ جو آج کی ہر تلاش وتحقیق کے ساتھ نئی اور پُراسرار ہوتی چلی جاتی ہے۔

'عورت' — کائنات میں بکھرے ہوئے تمام اسرار سے زیادہ پُراسرار، خدا کی سب سے حسین تخلیق — یعنی اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ عورت کو جان گیا ہے تو شاید اُس سے زیادہ شیخی بگھارنے والا یا اس صدی میں اتنا بڑا جھوٹا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ عورتیں جو کبھی گھریلو یا پالتو ہوا کرتی تھیں۔ چھوٹی اور کمزور تھیں۔ اپنی پُراسرار فطرت یا مکڑی کے جالے میں سمٹی، کوکھ میں مرد کے نطفے کی پرورش کرتیں۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی وہ محض بچہ دینے والی ایک گائے بن کر رہ گئی تھیں — مگر شاید صدیوں میں مرد کے اندر دہکنے والا یہ نطفہ شانت ہوا تھا یا عورت کے لئے یہ مرد آہستہ آہستہ بانجھ یا سرد یا محض بچہ پیدا کرنے والی مشین کا محض ایک پُرزہ بن کر رہ گیا تھا...... عورت اپنے اس احساس سے آزاد ہونا چاہتی ہے...... شاید اسی لئے اس ناول کا جنم ہوا...... یا اس لئے کہ عورت جیسی پُراسرار مخلوق کو ابھی اور کُریدنے یا اُس پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے ابھی بھی مہذب دنیا میں اسے صرف پاک ناموں اور رشتوں میں جکڑ رکھا ہے۔

ماں، ماں ہوتی ہے۔ بہن کی ایک پاکیزہ اور مقدس دنیا ہوتی ہے۔ بیوی کی دنیا ایک الگ دنیا ہوتی ہے۔ یہ سب صرف پاکیزہ رشتے اوڑھے ہوتی ہیں، عورت کا جسم نہیں۔ ان رشتوں میں کہیں جسم کا تصور نہیں آتا (ممکن ہے، بیوی کے رشتہ میں آپ اس جسم کو تلاش کرنے کی کوشش کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورت سے بیوی بنتے ہی اُس میں شردھا اور تقدس کے پھول بھی کھل اٹھتے ہیں)۔ وہ تصور جو اچانک 'عورت' کہتے ہی، آپ کے آگے ایک خواب رنگوں والے اندر دھنش کی خوبصورتی بکھیر دیتی ہے۔ اس لئے عورت کے نام کے ساتھ ان پاکیزہ رشتوں کا تصور نہیں آتا۔ صرف دل کو لبھانے والا جسم، یعنی ایک ایسا جھنجھنا کر بجنے والا جسم، جس کے صرف خیال سے آپ کسی ہوائی گھوڑے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ حقیقت میں عورتوں سے متعلق بڑی بڑی باتیں کرنے کے باوجود ہم وہیں ہوتے ہیں ___ اپنی تنگ نظری کا دھواں پیتے ہوئے۔

''عورت'' — ہزاروں برسوں کے اس سفر میں کہاں کھو گئی ہے عورت؟ پہلے بھی کہیں تھی یا نہیں؟ قدیم گرنتھوں میں دروپدی، کُنتی، سیتا،

ساوتری، پاروتی، دمینتی، شکنتلا، میتری وغیرہ— عزت سے پکاری جانے والی، الفی کے آخر تک لکس کا عریاں اشتہار کیسے بن گئی؟ یا وہ اشتہار نہیں بنی۔ 'لرل' اور 'لکس' کے اشتہاروں سے آگے نکل کر اور بھی مورچے سنبھالے ہیں اس نے— کہا جائے تو ایک پڑاؤ W.W.F. بھی ہے۔ آنے والے وقت میں کہاں کھو گئی یہ عورت؟

'خدائے ستّار
عصمتوں کو ہزار پردے میں رکھنے والے/
صفات میں تیری عدل بھی ہے/
تو پھر میرے اور میرے محرم کے بیچ
تفریق کا سبب کیا—؟'

— عشرت آفریں

ادب تحریر کرنے والی عورتوں کے لئے ایسے سوال کوئی نئے نہیں ہیں۔ کہ اے خدا، اگر تو انصاف پسند ہے تو مرد اور عورت کے درمیان اتنا فرق کیوں؟ اسی لئے آج کی عورت جب اڑان کے لئے اپنے پر کھولتی ہے تو کبھی کبھی 'جوناتھن سی گل' کی طرح اپنے دائرے کو توڑتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ ہم اُسے کسی بھی نام سے پکاریں لیکن آخر اسے ایسا کرنے کا حق بھی ہم نے ہی دیا ہے۔

یہ مت بھولئے کہ صدیوں کے ظلم اور مردوں کی غلامی سے نجات کے بعد، اپنی آزادی کا استعمال کرتے ہوئے وہ اپنی ایک نئی دنیا بھی بنا سکتی ہے۔ اس نئی دنیا کو تنگ نظری کی آنکھوں سے مت دیکھئے— وہ اڑنا چاہتی ہے تو اُڑان کے نتیجے میں کچھ 'حادثے' بھی ہو سکتے ہیں— مگر یہاں سب سے اہم بات یہی ہے کہ وہ اب اپنی اُڑان کے لئے مکمل طور پر آزاد ہے— میرے لئے یہ کوئی چونکنے والی بات نہیں تھی کہ صدیوں سے استحصال کا بوجھ اٹھاتی عورت اپنے وجود، اپنے جسم اور اپنے حقوق کی لڑائی لڑتے ہوئے کہاں کہاں لہولہان یا شکست کا سامنا کر سکتی ہے یا پھر کہاں کہاں وہ مردوں کو شکست دے سکتی ہے۔

عورت: خوف سے مکالمہ اور احتجاج

''اور بالآخر وہ ایک دن
اپنے مذہب کے خلاف چھیڑیں گی جہاد/
جس مذہب نے قید کر دیا تھا اُنہیں
ایک بند، گھٹن اور حبس سے بھرے
اندھیرے کمرے میں/

— صدیزدانی (سندھی شاعر)

عورت نام آتے ہی گھر کی چہار دیواری میں بند یا قید، پردے میں رہنے والی ایک 'خاتون' کا چہرہ سامنے آتا ہے۔ اب سے کچھ سال پہلے تک مسلمان عورتوں کا ملا جلا یہی چہرہ ذہن میں محفوظ تھا۔ گھر میں موٹے موٹے پردوں کے درمیان زندگی بسر کر دینے والی یا گھر سے باہر خطرناک برقعوں میں اوپر سے لے کر نیچے تک خود کو چھپائے ہوئے— عرصہ پہلے پارٹیشن پر لکھی ہوئی کسی مشہور 'ہندو افسانہ نگار' کے ایک افسانہ میں ایسی ہی ایک برقعہ پوش خاتون کا تذکرہ ملتا ہے— ''ہم انہیں دیکھ کر ڈر جایا کرتے تھے۔ کالے کالے برقعہ میں وہ کالی کالی 'چڑیل' جیسی لگتی تھیں، تب ہم سڑکوں پر شاپنگ کرتی ان عورتوں سے صرف ڈرنے کا کام لیا کرتے تھے۔''

وقت کے ساتھ کالے کالے برقعوں کے رنگ بدل گئے— لیکن کتنی بدلی مسلمان عورت یا بالکل ہی نہیں بدلی— قاعدے سے دیکھیں، تو اب بھی چھوٹے چھوٹے شہروں کی عورتیں برقعہ تہذیب میں ایک نہ ختم ہونے والی گھٹن کا شکار ہیں۔ لیکن گھٹن میں بغاوت بھی جنم لیتی ہے اور مسلمان عورتوں کی بغاوت کی لمبی داستان رہی ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ 'مذہب کے اصولوں اور قوانین کو زندگی سے تعبیر کرنے والی' صوم

وصلوٰۃ کی پابند عورت نے ایک دن اچانک بغاوت یا جہاد کے لئے بازو پھیلائے اور کھلی آزاد فضا میں سمندری پرندے کی طرح اڑتی چلی گئی۔
'فرہنگ آصفیہ' میں بغاوت کا لفظی معنی نافرمانی اور سرکشی کے آیا ہے۔ نافرمانی کی پہلی کہانی دنیا کے پہلے انسان یا پہلے پیغمبر حضرت آدمؑ کی بیوی حضرت حوّا سے شروع ہو جاتی ہے۔ اللہ نے سب سے پہلے آدم کو پیدا کیا اور پھر آدم کی تنہائی ختم کرنے کے لئے اُن کی پسلی سے حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ جنت میں سب کچھ کھانے پینے کی آزادی تھی، لیکن ایک درخت کے بارے میں حکم تھا کہ اس کا پھل کبھی مت چکھنا۔ 'نافرمانی' کی پہلی روایت یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ عورت پیدائش کے وقت سے ہی اپنی تجسس کو دبا پانے میں ناکام رہی ہے۔ اس کے اندر سوالوں کی ایک 'دنیا' پوشیدہ ہوتی ہے۔ حضرت آدمؑ نے لاکھ سمجھایا۔ لیکن آخر کار حضرت حوّا نے 'گندم' توڑ کر کھا ہی لیا اور اسی نافرمانی کے نتیجے میں آدمؑ اور حوّا کو جنت سے نکالا گیا اور وہ دنیا میں آ گئے۔
تو دنیا کے دروازے آدمؑ اور حوّا کے لئے کھل چکے تھے۔ وہ آپس میں مل کر رہنے لگے۔ حضرت حوّا جب پہلی دفعہ حاملہ ہوئیں، تو ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی ایک ساتھ پیدائش ہوئی۔ بیٹے کا نام 'قابیل' اور بہن کا نام 'اقلیمہ' رکھا گیا۔ دوسری دفعہ جب حاملہ ہوئیں، تو ایک بیٹا 'ہابیل' اور بہن 'یہودا' کی پیدائش ہوئی۔ شریعت کے مطابق ایک پیٹ کی بیٹی کو دوسرے پیٹ کے بیٹے سے رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنا تھا۔ یعنی شریعت کے مطابق 'قابیل' کی شادی 'یہودا' کے ساتھ اور 'ہابیل' کی 'اقلیمہ' کے ساتھ طے پائی تھی۔
یہ کیسی افسوسناک بات ہے کہ دنیا کے پہلے قتل کی وجہ بھی ایک عورت ہی بنی۔ پہلا قتل ایک عورت کے نام پر ہوا تھا۔ قابیل پہلی لڑکی یعنی اقلیمہ سے پیار کر بیٹھا۔ اس طرح عورت کے نام پر 'ہابیل' کو اپنی جان گنوانی پڑی۔
شریعت کا فرمان جاری کرنے والے اور اُس پر عمل کرنے والے مولویوں نے ہر بار مذہب کی حفاظت کی آڑ لے کر عورت کو اپنے پیر کی جوتی بنانے کی کوشش کی ہے۔ مسلسل ظلم، بیویوں کے ساتھ ناانصافیوں رواج، آزادی سے کچھ قبل تک بیوی کی موجودگی میں 'داشتہ' رکھنے اور کوٹھوں پر جانے کا رواج، اس بارے میں اپنی مردانگی کی جھوٹی دلیلیں، شہزادوں، نوابوں اور مہاراجاؤں کے ہزاروں لاکھوں قصوں میں عورت نام کی چڑیا سچ مچ مردوں کی بے محابا خواہشات کی تکمیل کے لئے کھیتی بن گئی تھی — مرد عورت کی 'زمین' پر ہل چلا سکتا تھا، رولر چلا سکتا تھا۔ زمین کو چاہے تو زرخیز اور چاہے تو بنجر بنا سکتا تھا — وہ مرد کی 'کھیتی' تھی اس لئے اُسے بولنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ مرد اُس کا کسی بھی طرح کا استعمال کر سکتا تھا۔
مسلم معاشرے نے عورت کو وہیں اپنایا، جہاں وہ مجبور تھی، جہاں اُسے مارا پیٹا یا سزا دی جا سکتی تھی۔ جہاں مرد عورتوں کو 'حلال' کر کے جبراً ان کے مالک بن سکتے تھے ___ ایسا نہیں ہے کہ دوسرے معاشروں میں یہ عورت راحت و آرام کی سانس لے رہی تھی۔ یہ عورت ہر جگہ بندشوں میں گھری ہوئی تھی۔ مذہب کی بیڑیاں توڑ کر عورت جب چیخی، تو اُس کی چیخ سے آسمان میں بھی سوراخ ہو گیا۔ دیکھا جائے تو عورت ہر جگہ قید میں تھی۔ تبھی تو سیمون دبوار کو کہنا پڑا — 'عورت پیدا نہیں ہوتی، بنائی جاتی ہے۔'
سیمون دبوار کی آپ بیتی کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ قاہرہ کے ایک سیمینار میں بولتے ہوئے سیمون نے مردوں پر عورتوں کے لئے حاکمانہ، زمیندارانہ اور ظالمانہ رویّہ اختیار کرنے کا الزام لگایا۔ وہاں تقریب میں شامل مردوں نے سیمون کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ عورتوں کی نابرابری اُن کے مذہب کا حصہ ہے اور قرآن میں اس کا ذکر ہے اور مذہب کا قانون دنیا کے ہر قانون سے اوپر ہے۔
یہاں میں صرف ایک مثال دینا چاہوں گا۔ صرف یہ دکھانے کے لئے کہ دیگر ملک یا معاشرہ میں بھی شروع سے ہی عورت کی یہی حالت رہی ہے۔ انگریزی ناول ایسی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ایم جی لیوس کا مشہور ناول 'دی میک......' جب 1796 میں شائع ہوا، تو ادبی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ دنیا بھر کے عیسائی طبقے میں اس ناول پر نا اتفاقی کی فضا پیدا ہو گئی۔ پادریوں نے خاص اعلان کیا کہ یہ ناول نہ خریدا جائے، نہ پڑھا جائے اور نہ گھر میں رکھا جائے۔ 'دی میک' میں عورتوں کو 'نن' بنانے والی رسم کے خلاف جہاد چھیڑا گیا تھا — مذہبی پادریوں کے، عورتوں کے جسمانی استحصال کے ایسے ایسے قصّے اس کتاب میں درج تھے کہ دنیا بھر میں اس کتاب کی ہولی جلائی گئی — سچ تو یہی ہے، جیسا کہ سیمون دبوار نے کہا تھا — ''عورتیں پیدا نہیں ہوتیں بنائی جاتی ہیں۔ وہ ہر بار نئے مردانہ سماج میں نئے نئے طریقے سے 'ایجاد' کی جاتی رہی ہیں۔''
کیا یہ بند بند سے معاشرے کا احتجاج تھا، یا مسلم مردانہ سماج سے صدیوں میں جمع ہونے والی بوند بوند نفرت کا نتیجہ۔ یہ مذہب کا کرشمہ تھا یا صدیوں قید میں رہنے والی عورت اور اُس کی گھٹن کا نتیجہ — برسوں سے گھر کی چہار دیواری میں قید عورت کو آخر ایک نہ ایک دن اپنا پنجرا تو توڑنا ہی

تھا۔ دیکھا جائے تو یہ بغاوت کے تیور معاشرے میں کم وبیش جنم لیتے رہے تھے۔ نبیوں کی روایت میں حضرت محمدؐ آخری نبیؐ ہیں۔ یعنی اُن کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ لیکن بہت بعد میں قرۃ العین طاہرہ نام کی ایک عورت نے اعلان کیا کہ میں ''نبیہ'' ہوں۔ اللہ نے یہ کہا ہے کہ مرد پیغمبر نہیں آئیں گے۔ یہ کہاں کہا گیا ہے کہ عورت پیغمبر نہیں آئیں گی۔ نتیجہ میں قرۃ العین طاہرہ کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اردو کے مشہور نقاد سجاد حیدر یلدرم کو کہنا پڑا— ''میں حشر کا قائل نہیں، مگر حشر کا منتظر ضرور ہوں۔ میں قرۃ العین طاہرہ کے قاتلوں کا حشر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

دراصل عورت اب عورت کے گندے ماضی سے لڑ رہی تھی— عورت تاریخ پر چابک برسا رہی تھی۔ وہ صدیوں میں سمٹے اُن پہلوؤں کا جائزہ لے رہی تھی، جب جسمانی طور پر اُسے کمزور ٹھہراتے ہوئے مردانہ سماج میں اُس پر ظلم وستم ایک ضروری مذہبی فریضہ بن چکا تھا۔

یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ دراصل بغاوت کی بیار زیادہ تر وہیں بہہ رہی تھی، جہاں بند شیں تھیں— دم گھٹنے والا معاشرہ تھا۔ شاید اسی لئے تقسیم کے بعد کے پاکستان میں حکومت کرنے والے علماء اور ملاؤں کے خلاف عورتوں نے بغیر خوف اپنی آواز بلند کرنا شروع کی۔ کہاں ایک طرف پردہ نشینی کا حکم اور کہاں دوسری طرف دھکا دھک سگریٹ پیتی ہوئی، الفاظ سے تلوار کا کم لیتی ہوئی عورتیں—

دراصل نئے اسلامی معاشرے میں نوکر شاہی اور سیاست کا جو گھناؤنا کھیل شروع ہوا تھا، وہاں مرد صرف اور صرف ظالم حاکم تھا۔ عورت نئی اسلامی جمہوریت میں، مذہب کا سہارا لے کر پیر کی جوتی بنا دی گئی تھی، درد بھرے انجام کو پہنچی عورتوں کی اسی کہانی پر تہمینہ درّانی نے اپنی آپ بیتی لکھنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستانی سیاست کے اہم ستون مصطفےٰ کھر نے سیاست اور مذہب کے درمیان ہم آہنگی قائم کرتے ہوئے اپنی بیویوں کے ساتھ ایسے ظلم کئے کہ آج کے مہذب سماج کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تہمینہ کی آپ بیتی 'میرے آقا' نے پاکستان کے سیاسی ادبی حلقے میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یہ عورت کے ظلم وستم کی داستاں تو تھی ہی۔ لیکن عورت اب بھی اپنے وجود کے لئے مرد کو نیچا دکھانے پر اتر آئی تھی۔

بقول سلوِ یا پاتھ—

'میں تو شبدوں کی پہیلی ہوں۔

ایک ہاتھ/
ایک طلسمی گھر/
ایک تربوز/
جو لڑھک رہا ہو/
ایک سرخ پھل ہاتھی دانت، صندل کی لکڑی/
وہ ریز گاری
جو ابھی ابھی تازہ، ٹکسال سے نکلی ہو،
میں ایک رشتہ ہوں
اسٹیج ہوں، گائے کا بچھڑا ہوں
میں نے سنہرے سیبوں کا بھرا تھیلا کھایا ہے
اور اب میں
اُس ٹرین میں سوار ہوں
جو کہیں رُک نہیں سکتی''

میں برابری اور آزادی کا قائل ہوں— اس لئے برسوں سے ایک ایسی کہانی کی تلاش میں تھا، جہاں اپنے تصور کی عورت کو کردار بنا سکوں— اس ناول میں دو کردار ہیں— صوفیہ مشتاق احمد ایک خوفزدہ لڑکی کی علامت بن کر سامنے آتی ہے یہاں مجھے ضرورت ایک ایسی عورت کی تھی، جسے صوفیہ مشتاق احمد کے ساتھ مضبوطی کی علامت بنا کر پیش کر سکوں— ناہید ناز کا کردار ایک ایسا ہی کردار ہے کہ جب ناہید کے کردار نے جنم لیا تو میری مشکل آسان ہو گئی۔ نہ وہ نفسیاتی مریضہ ہے نہ پاگل، مگر وہ صدیوں کے کرب اور غلامی سے آزاد ہونا چاہتی ہے— کیا یہ

آسان ہے! یا صرف ناول اور کہانیوں تک محدود؟ ہم جس معاشرے میں ہیں، وہاں آج بھی عورت کی آزادی کا تصور نہیں کیا جا سکتا—اس لیے ''نالۂ شب گیر'' صدیوں کی وہ درد بھری موسیقی ہے، جو شب کے بحر ظلمات کا سینہ چیر کر پیدا ہو رہی ہے...... مگر یہاں کون ہے جس کے پاس درد کی ان صداؤں کو سننے کے لئے وقت ہے۔ یہاں کی ہر عورت 'سیمون د بوار' ہے، جسے درد بھری آواز میں آخر کار یہی کہنا ہوتا ہے، عورت پیدا کہاں ہوتی ہے...... وہ تو بس بنائی جاتی ہے......

حصہ اول

دشت خوف

(صوفیہ مشتاق احمد)

نالۂ شب گیر

روز ازل سے اب تک کے فسانے میں ایک مرد ھے ایک عورت
لیکن غور کریں تو دونوں کی کہانی کتنی جدا ھے .
خدا نے مرد کا تصور کیا تو ساتھ ھی نا تراشیدہ خوفناک چٹانوں اور عظیم الشان پہاڑوں کی تخلیق میں مصروف ہو گیا.
خدانے عورت کا تصور کیا تو گدلے پانی میں گڈمڈ ہوتی آسیبی پرچھائیوں کو دیکھا. عورت کی تخلیق کے ساتھ گدلے پانی کو عالم بالا سے عالم سفلی کی طرف اچھال دیا......
اور وھاں خوف کی شکلیں نمودار ہو گئیں.

مرد چٹانوں پر شان کبریائی سے کھڑا تھا.

عورت گدلے پانی میں جھانکتی ہوئی خوف کی پرچھائیوں کے درمیان سہمی ہوئی کھڑی تھی. اور اس کی تقدیر اسی نالۂ شب گیر سے جوڑ دی گئی تھی.

خدائے لوح و قلم نے اسے مرد کے لئے لوح مشق بنا کر بھیجا اور روز ازل سے وہ ضرب کی جگہ تقسیم ہوتی ہوئی بے نشان بن چکی ہے—

مصنف کے نوٹس

ایک واھیات شب کے ساحل پر کھڑی لڑکی کا پورٹریٹ

XXXXXXXXXXXXXXXXXXXXXXX
XXXXXXXXXXXXXXXXXXXXXXX
XXXXXXXXXXXXXXXXXXXXXXX
XXXXXXXXXXXXXXXXXXXXXXX
XXXXX

ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ چونکنے کی ضرورت ہے، مندرجہ بالا سطور میں، میں نے کچھ لکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن لکھتے ہوئے احساس ہوا، یہاں ہر لمحہ ایک نئی دنیا بن جاتی ہے اور اوپر جو کچھ لکھا، وہ سب ماضی کا حصہ، بیکار یا واہیات ثابت ہو چکا ہوتا ہے۔ میری اس بات کو اس طرح سمجھیں کہ ابھی ایک زمین کے، ایک خالی حصہ کو کراس کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں اور واپس آتے ہیں تو یہاں ایک نیا شہر آباد رہتا ہے۔ نیا ہائی وے— فلک بوس عمارتیں— فلائی اورس کے جال— سڑک پر خطرناک ٹریفک اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی گاڑیاں۔ غور کریں تو اس سے زیادہ برق رفتاری کے ساتھ خیالات کا ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ ہم ایک لفظ لکھتے ہیں۔ اور دوسرے ہی لمحے اس کے نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو فیس بک، ٹوئیٹر اور اس طرح کے دوسری ماڈرن ویٹ سائٹس دیکھ لیں— اور اس ماڈرن ویب سائٹس کے ہائی وے پر اگر دو لوگ کھڑے ہیں تو آپ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ دو لوگ کون ہیں۔ آیا ان میں مرد کون ہے اور عورت کون—؟ ممکن ہے پہلی نظر میں جو عورت ہو وہ دوسری نظر میں مرد ثابت ہو— یا جو پہلی نظر میں مرد ہو وہ دوسری نظر میں انفارمیشن ٹکنالوجی سے نکلا ہوا ایک انقلابی بزنس ماڈل ثابت ہو...... اس لیے قارئین، سب سے پہلے مندرجہ بالا سطور میں جو کراس کے نشان ہیں انہیں پڑھنے کی کوشش کیجئے— یقینی طور پر وہاں کچھ لکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر اب نہیں ہے۔ اب وہاں صرف کراس ہے اور کراس پر غور کریں تو ایک اور نئی بات سامنے آتی ہے۔ جب ہم غصے میں تحریر کو کراس کرتے ہیں تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم ایک خیال میں رنگ بھرنے سے پہلے ہی اسے مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یا، خیال میں جو رنگ بھرنے کی کوشش کی گئی، اس میں رنگ بھرنے کے ساتھ ہی رنگوں نے اترنا بھی شروع کر دیا اور آپ غور کریں تو کراس میں دو لکیریں ملتی ہیں— اور کہتے ہیں دنیا بھی اس لیے آباد ہوئی کہ یہاں دو جنس کے لوگ تھے۔ ایک مرد، دوسری حوا— صرف حوا یا آدم ہوتے تو شاید دنیا کا عمل ہی سامنے نہ آتا۔ کراس کی ایک لکیر میں ایک حوا چھپی ہے۔ اور دوسری لکیر میں آدم...... آپ ملاحظہ کریں تو دونوں لکیریں ایک جیسی ہیں اور آپ کے لیے پہچاننا مشکل کہ آدم کون ہے اور حوا کون...... آپ ان دونوں لکیروں کو گھماتے جائیے...... مگر آخر تک یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ کون سی لکیر طاقت کا اشارہ ہے اور کون کمزوری کی علامت......

قارئین! ہماری اس کہانی یا اس نئی دنیا کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ عرصہ تک بلکہ صدہا صدی تک ایک لکیر، دوسری لکیر پر حاوی ہو کر صفحۂ ہستی پر اپنا تماشہ دکھاتی رہی۔ مگر اس درمیان دوسری سوئی ہوئی لکیر میں حرکت ہوئی اور پہلی لکیر کا تماشہ نہ صرف بند ہوا بلکہ انہیں دیکھنے والے فرشتے بھی دم بخود رہ گئے......

'نہیں......وہ اول لکیر والا......'

'آپ غلط سمجھے......وہ حوا ہے......'

'اور دوسری لکیر......'

'وہ بھی حوا ہے......'

ہنسنے کی آوازیں......'پھر آدم کہاں گیا؟'

'آدم کراس میں چھپا ہے۔ وہ دیکھیے......لیکن کراس میں تو حوا بھی ہے......تو پھر ان دونوں میں سے آدم کون ہے اور حوا کون......؟

قارئین، سچائی یہ ہے کہ حقیقت، فنٹاسی میں اور فنٹاسی حقیقت میں جذب ہوگئی ہے۔ یہ کنفیوژن، یہ الجھن، یہ سارا کچھ y2k سے پیدا ہوا ہے۔

y2k......؟ قارئین، چونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ابھی سے پندرہ سال پہلے عورت کی طرح، سیمون دبوار کے لفظوں میں کہوں، تو یہ دنیا نئی نئی سیپ سے برآمد ہو رہی تھی......ایک نیا گلوبل گلوب ہمارے سامنے تھا، جس میں ایک ساتھ یہ مکمل دنیا ایک دوسرے کو دیکھ سکتی، پہچان سکتی اور گلوبل مارکیٹ کا ایک حصہ بن سکتی تھی......سن ۲۰۰۰ — یعنی y2k......نئی صدی میں 'oo' کے اعداد کے ساتھ ایک غراتی ہوئی خوفناک بلی آگئی تھی......جو ایلس کی طرح ونڈر لینڈ کی فنٹاسی سے باہر چھلانگ لگا کر اس نئی دنیا میں غرا رہی تھی کہ اب دیکھو...... یہ 'oo' تمہاری دنیا میں ایک جھٹکے سے زلزلے کے آثار پیدا کر کے، نئے کھیل دکھانے والا ہے۔ ساری دنیا اور دنیا بھر کے انجینئر y2k کا حل تلاش کرنے میں لگ گئے۔ اور اس تلاش میں ہماری گول گول گھومتی اور لرزتی دنیا کو آئی ٹی کا جھنجھنا مل گیا۔ اس جھنجھنے کے ملتے ہی گلوبل طلسمی آئینہ سے جھانکتا ہوا ہندوستانی بازار ایک نئی انگڑائی لے چکا تھا — اور یہ سب y2k کی وجہ سے تھا۔ انٹرنیشنل مارکیٹ فارین شیئر، اسٹاک ایکسچینج، اسٹاک آپشن اور راتوں رات ایک بدلتی ہوئی زندگی تھی......خواب اور فنٹاسی گم تھے......انقلاب کا واسطہ حقیقت کی سرزمین سے تھا مگر کتنی عجیب بات، یہ سرزمین ابھی بھی عروج اور زوال میں کھوئی ہوئی تھی۔ ایک طرف ملٹی اسکائی بلڈنگس اور فلائی اوورس کے جال تھے تو دوسری طرف جھگی جھونپڑیاں بھی تھیں۔ ایک طرف لیپ ٹاپ، ڈیجیٹل موبائیل تھے، حیران کرنے والے شاپنگ مالس تھے، تو دوسری طرف ڈپریشن کا شکار اکانومی بھی تھی۔ ایک طرف گے، لیسبین، لیوان ریلیشن شپ کی حمایت کرنے والے تھے تو دوسری طرف عشق کے نام پر زندہ جلا دی جانے والی واردات اور رحم مادر میں ہی لڑکی کو پیدائش سے پہلے ہی ختم کر دینے جیسے خیالات بھی تھے۔ 'کنیکٹیویٹی' کے اس دور میں، y2k کے انقلاب کے پندرہ برسوں میں جدید و قدیم کا یہ سنگم حیران کرنے والا تھا۔ ہم اڑتے اڑتے بھی کیڑے سے بدتر تھے اور چلتے چلتے بھی کیڑے سے بدتر......

انقلاب کے ان پندرہ برسوں میں لفظ و معنی کی شکلیں بدلی تھیں۔ اور شاید یہیں سے اس کہانی کے پیدا ہونے کی کلبلاہٹ سنائی دینے لگی تھی......اور قارئین اس لیے آئندہ صفحات پر جو کہانی آپ پڑھنے جا رہے ہیں وہاں کی فضا کچھ کچھ انہی خیالوں سے مانوس ہے — بندر ڈگ ڈگی بجائے گا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک آدم قد بن مانس میں تبدیل ہو جائے گا۔ ترقی کی ریس میں سوشل انجینئرنگ ڈائنوسار جیسے انسان پیدا کرے گی اور سیاست سرکس میں تبدیل ہو جائے گی۔ ہم کراس اور تضاد کے پل پر سوار ہیں جہاں ہم شاخوں پر بیٹھے بھی ہیں اور اپنی ہی شاخوں کو کاٹ بھی رہے ہیں۔ جہاں ہم تیزی سے مارس اور پگھلا دینے والے سورج کی طرف قدم بڑھانے کے بارے میں غور کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہم سوائن فلو اور سارس جیسی بیماریوں کے شکار ہو رہے ہیں......ایک طرف ہم بھول گئے ہیں کہ کراس کی ایک لکیر مرد ہے یا عورت — اور دوسری طرف رشتوں کے سجے بازار میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی آج بھی پندرہویں صدی کے قید خانے میں قید ہے اور معاف کیجیے گا، آئندہ صفحات میں، ایک ایسی ہی لڑکی سے میں آپ کی ملاقات کرانے جا رہا ہوں، اور اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ایک واہیات رات، انقلاب کی تیز رسی پر پھسلتی ہوئی دنیا کے بارے میں جب یہ احمق غور کر رہا تھا، اور ہیٹ، گڈ نائٹ اور آل آؤٹ سے بھی نہیں مرنے والے مچھر مجھ پر حملہ کر رہے تھے، اور میں ایک خالی کینوس پر اس لڑکی کا پورٹریٹ بنانے کی کوشش کر رہا تھا — y2k کے 00 اچانک اچھل کر میرے سامنے آگئے۔ اور یہ لمحہ میرے لیے اذیت ناک تھا جب میں اچھلتا ہوا کورے کینوس اور پھر اس کہانی کا حصہ بن گیا تھا۔

کہنا مشکل ہے کہ کراس کی پہلی لکیر میں کس کا چہرہ چھپا تھا—؟ ناہید ناز کا یا صوفیہ مشتاق احمد کا؟ یا کسی دوسری عورت کا۔ جیسے یہ کہنا مشکل ہے کہ کراس کی دوسری لکیر میں کس کا چہرہ پوشیدہ تھا، کمال یوسف کا یا کسی اور مرد کا— جیسے یہ کہنا مشکل ہے کہ y2k انقلاب کے پندرہ برسوں بعد یہ دنیا مریخ پر اڑنے کی تیاری کررہی ہے...... یا دیگر صورت میں یہ دنیا پندرہویں صدی کے اندھیرے میں گم ہونے جارہی ہے......اور میری مجبوری یہ کہ یہ کہانی کسی ایسے موسم میں برآمد ہوئی جہاں لغات سے نکلے ہوئے لفظ، تتلی کے پروں کی طرح، رنگوں کو کشید کرتے ہوئے، پھڑ پھڑاتے ہوئے ہوا میں اس طرح بکھر گئے کہ کمال یوسف، ناہید ناز میں یا ناہید ناز، کمال یوسف کے قالب میں سما گئے اور اس طرح جیسے پلک جھپکی، عقاب نے پر پھیلائے اور دنیا چپکے سے تبدیل ہوگئی۔

معاف کیجئے گا، یہاں ایک مصنف کے طور پر میں نے کچھ نوٹس لیے ہیں اور جو حقیقت سامنے آئی، اسے اپنے طور پر بتانے یا سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے میری فکر کا دائرہ محدود ہو تو یہ آپ پر ہے کہ آپ اپنے طور پر تجزیہ کے پل صراط سے گزریں اور نئی صدی کی تاریخ کے صفحات سے گزرتے ہوئے، جو واقعات آپ کے سامنے رکھے جارہے ہیں آپ ان کا اپنی سطح پر نتیجہ برآمد کریں۔ یہ آپ کی صواب دید پر ہے کہ آپ میرے نظریہ کی حمایت کرتے ہیں یا مخالفت۔ یہ آزادی بہر صورت آپ کے اختیار میں ہے۔

اور ایک ایسے عہد میں، میں نے یہ کہانی سنانے کی ذمہ داری قبول کی ہے جہاں جدید و قدیم، فنتاسی اور حقیقت، نئے اور پرانے دماغ ایک دوسرے میں تحلیل ہورہے ہیں۔ سوشل نیٹ ورکنگ کی اس نئی اور چونکانے والی دنیا میں الفاظ نئے سرے سے خود کو دریافت کرنے کی کوشش کررہے ہیں......اور اسی نئی دنیا سے دو عورتیں برآمد ہوئی ہیں۔ ایک صوفیہ مشتاق احمد اور دوسری ناہید ناز......

اور اس وقت بھی وہ میلا سا کاغذ میرے ہاتھوں میں ہے، جہاں ایک بلی کی تصویر بنی ہوئی ہے اور اس کے پیٹ میں ایک چوہا ہے— میں زندگی کی نئی حقیقتوں کے تعاقب میں، اب بھی تصویر میں پوشیدہ مفہوم کو سمجھنے کی سعی کررہا ہوں......

تو ایک تھی صوفیہ......صوفیہ مشتاق احمد—

To be, or not to be: that is the question:

Whether 'tis nobler in the mind to suffer

The slings and arrows of outrageous fortune,

Or to take arms against a sea of troubles,

And by opposing end them? To die: to sleep;

No more; and by a sleep to say we end

The heart-ache and the thousand natural shocks

That flesh is heir to, 'tis a consummation

Devoutly to be wish'd. To die, to sleep.....

William Shakespeare

(1)

''میں ہر بار تمہارے گھر کی الگنی پر گیلے کپڑے کی طرح 'لٹکی' رہی۔ تم میرے لئے مٹھی مٹھی بھر دھوپ لاتے تھے۔ اور میں تھی، برف جیسی یخ ـــــ دھوپ تمہاری مٹھیوں سے جھڑ جھڑ جاتی تھی......سوکھتی کیسے میں......؟ تمہارے ہی گھر کی الگنی پر لٹکی رہی۔ دُکھ دینے کے لئے تمہیں۔''

وہ کچھ ایسا ہی سوچتی تھی۔ اپنے بارے میں ـــ وہ یعنی، صوفیہ مشتاق احمد۔ اُسے اپنے بارے میں کچھ بھی سوچنے کا حق حاصل تھا۔ جیسے یہ کہ راتیں کیوں ہوتی ہیں؟ جیسے یہ کہ آسمان پر ٹمٹماتے تاروں میں، اُس کی بھولی بسری عمر کیسے سما جاتی ہے......؟ جیسے یہ کہ صبح کیوں ہوتی ہے......؟ سورج کیوں نکلتا ہے......؟ دھوپ سے زندگی کا کیسا رشتہ ہوتا ہے ـــ؟

قارئین! مجھے احساس ہے کہ میں نے کہانی غلط جگہ سے شروع کردی۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسا میرے ساتھ اکثر ہوا ہے۔ مگر پیارے قارئین، مجھے اس بات کا اعتراف کر لینے دیجئے کہ مجھے اس کہانی کو لکھنے کا کوئی حق نہیں تھا اور یقین جانیے، اس کہانی کے کرداروں سے، ملنے سے قبل تک مجھے اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ زندگی سے وابستہ بے حد معمولی سچائیاں اتنی تلخ، اتنی سنگین بھی ہوسکتی ہیں ـــ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آج کے عہد میں، جس کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ مہذب ترین دنیا کا کوئی تصور اوبامہ کے پاس بھی نہیں ہے ـــ اور نیوکلیائی ہتھیاروں کی، انسانوں کے قتل عام کی اس سے بدصورت مثال شاید تاریخ کے بے رحم صفحوں پر بھی مشکل سے ہی ملے گی ـــ مجھے احساس ہے کہ انسانی بم، جینوم، کلوننگ اور نیوٹکنالوجی کے اس عہد میں میں آپ کو ایک ایسی کہانی سنانے جا رہا ہوں، جس پر چوتھی دنیا کے مہذب ترین لوگ شاید ہی بھروسہ کر سکیں ـــ انسانوں کو غلام بنانے والی کہانیاں اور غلاموں سے کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ بدترین سلوک کی فنتاسیاں، معاف کیجئے گا، لوگ بھولے نہیں ہیں ـــ تاریخ کے صفحات اذیت اور جبر کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں ـــ لیکن یقین جانئے، میں ایسی کوئی رس بھری، لذیذ داستان آپ کے سامنے رکھنے نہیں آیا ـــ اور آپ ہنسیں گے، یقیناً آپ کو ہنسنا چاہئے ـــ کہ خود کو مہذب ثابت کرنے کی ریس میں اگر آپ کو کوئی ایسا قصہ سنایا جائے کہ عظیم طاقتوں میں سے ایک بننے جا رہے ملک ہندستان میں، ایک مسلمان لڑکی اپنی شادی کے لئے، 'شاہزادوں' کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی اور اچانک ایک دن اُس نے ایک تنہا، اُداس کمرے میں ـــ آسیبی داستانوں کے مشہور زمانہ کردار **ڈراکیولا** کو دیکھ لیا ـــ تو چونکئے گا مت ـــ اور یقین جانیے، ہماری اس کہانی کی کردار صوفیہ مشتاق احمد کے ساتھ بھی یہی ہوا ـــ

●●

آدھی رات گزر چکی تھی۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ باہر خوفناک آندھیاں چل رہی تھیں۔ پتّے سرسرا رہے تھے۔ باہر کوئی جنگل نہیں تھا۔ پھر بھی چمگادڑوں، بھیڑیوں، الّو اور طرح طرح کی خوفناک آوازیں رات کے پُراسرار سناٹے کو اور بھی زیادہ خوفناک بنارہی تھیں اور یقیناً یہ دستک کی آواز تھی— نہیں۔ کوئی تھا، جو دیواروں پر رینگ رہا تھا— کیا ویمپائر— اُف، خوفناک آوازوں کا ریلا جسم میں دہشت کا طوفان برپا کرنے کے لئے کافی تھا۔ سہمی ہوئی سی وہ اٹھی۔ کاٹو تو بدن میں خون نہیں— وہ اٹھی، اور تھرتھراتی، کانپتی کھڑکی کی طرف بڑھی۔ لڑکھڑاتے کانپتے ہاتھوں سے کھلی کھڑکی کے پٹ بند کرنے چاہے تو ایک دم سے چونک پڑی— کوئی تھا جو دیواروں پر چھپکلی کی طرح رینگ رہا تھا۔ اُف۔ اُس نے خوفزدہ ہو کر دیکھا— یقیناً یہ ڈراکیولا تھا— ہونٹ انسانی خون سے تر— دانت، لمبے، بڑے اور سرخ— وہ اپنے 'تابوت' سے باہر آیا تھا۔ صبح کی سپیدی تک اپنے ہونے کا جشن منانے یا پھر انسانی خون کا ذائقہ تلاش کرنے...... وہ یکبارگی پھر خوف سے نہا گئی۔ کسی اسپائیڈر مین کی طرح ڈراکیولا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیوار پر آرام سے چھپکلی کی طرح— پنجوں پر اُس کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر...... رینگتا ہوا، ڈراکیولا، ایکدم، دوسرے ہی لمحے اُس کے کمرے میں تھا— اُس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی...... اور اُس کے نوکیلے دانت اُس کی نازک ملائم گردن کی طرف بڑھ رہے تھے...... اُس کی آنکھوں میں نیم بے ہوشی کی دھند چھا رہی تھی—

(2)

مصنف سے صوفیہ مشتاق احمد کی بات چیت

'اُف، ڈراؤنا خواب، لیکن اس صدی میں ڈراکیولا— آپ کتابیں بہت پڑھتی ہیں، ڈراؤنی کتابیں؟'

'نہیں پڑھتی۔'

'پھر یہ خواب'

'نہیں، یہ خواب نہیں ہے۔ دیکھئے......'

مصنف کے لئے یہ صبر آزما لمحہ تھا۔ یقیناً اُس کی گردن کی ملائم جلد کے پاس کئی داغ تھے— لیکن کیا یہ ڈراکیولا کے نوکیلے دانتوں کے نشان تھے، یا...... مصنف اِن 'اذیت گزار' لمحوں کے سفر سے، پھیکی ہنسی ہنستا ہوا اپنے آپ کو باہر نکالنے کا خواہش مند تھا—

’یقیناً یہ داغ......آپ سمجھ رہے ہیں نا، ایک صبح ہم اٹھتے ہیں۔ اور کیڑے نے...... کیڑا......آپ سمجھ رہے ہیں نا......؟‘

صوفیہ مشتاق احمد کا چہرہ اس وقت لیونا ڈو وی ونچی کی پینٹنگ مونالزا کی طرح ہو رہا تھا، جس کے تأثر کو آپ لفظوں کا لباس پہنا ہی نہیں سکتے۔ یقیناً...... وہ کیڑا ہی تھا۔ نوکیلے دانتوں والا ایک خوفناک کیڑا......اور آپ سے زیادہ بہتر کون جانے گا کہ اس صدی میں انسان سے زیادہ خوفناک کیڑا......دوسرا کون ہوسکتا ہے......‘

ہے...... ہے...... ہے......، مصنف پھیکی ہنسی ہنسنے پر مجبور تھا......’یہ سب تو دانشوری، دانشمندی کی باتیں ہیں۔ ہے...... ہے......‘

مصنف کے الفاظ کھو گئے تھے......لیکن وہم وگمان کی ایک بے نام سی کہانی یہ بھی تھی کہ مصنف نے وہ داغ دیکھے......اور یقیناً وہ داغ اُس کی گردن پر موجود تھے......

لیکن اس کہانی کے ساتھ، اس بے معنی گفتگو، ڈراکیولا اور صوفیہ مشتاق احمد کی گردن میں پڑے ڈراکیولا کے نوکیلے دانتوں کے نشان کا کوئی رشتہ نہیں ہے— لیکن اس گفتگو کے بعد ہی اس کہانی کی بنیاد پڑی تھی، اور یقیناً— اب جو کچھ میں سنانے جا رہا ہوں، وہ بیان کی شکل میں ہے اور اس بیان میں، میں شامل ضرور ہوں، لیکن یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ اس کہانی میں، اپنی طرف سے میں نے کوئی اضافہ یا الٹ پھیر نہیں کی ہے......اس سے پہلے کہ الگ الگ بیانات کا سلسلہ شروع ہو، مختصراً اس کہانی کے کرداروں سے آپ کا تعارف کرادوں۔ دلّی جمنا پار رہائشی علاقے میں ایک چھوٹی سی مڈل کلاس فیملی— بڑی بہن ثریا مشتاق احمد۔ عمر پینتیس سال۔ ثریا کے شوہر اشرف علی— عمر چالیس سال۔ نادر مشتاق احمد، ثریا کا بھائی۔ عمر 30 سال۔ اور ہماری اس کہانی کی ہیروئن (نہیں معاف کیجئے گا، بڑھتی عمر کے احساس کے ساتھ ایک ڈری سہمی سی لڑکی ہماری کہانی کی ہیروئن کیسے ہوسکتی ہے):صوفیہ مشتاق احمد، عمر 25 سال۔

تو اس کہانی کا آغاز جنوری کی 8 تاریخ سے ہوتا ہے۔ سردی اپنے شباب پر تھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ دانت ٹھنڈی لہر سے کٹکٹا رہے تھے۔ لیکن جمنا پار، پریہ درشنی وہار، فلیٹ نمبر بی 302 میں ایک ناخوشگوار حادثہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔

کوئی تھا، جو تیزی سے نکلا— پہلے لڑکھڑایا، پھر باہر والے دروازہ کی چٹخنی کھولی اور تیز تیز، سرد رات اور کہاسوں کے درمیان، سیڑھیوں سے اُترتا ہوا، بھوت کی طرح غائب ہوگیا—

’وہ چلا گیا......‘ یہ جیجو تھا۔ صوفیہ مشتاق احمد کا جیجو، آنکھوں میں خوف اور الجھن کے آثار— وہ چلا گیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے......‘

نادر مشتاق احمد نے نظریں اٹھائیں۔ منظر کچھ ایسا تھا جیسے ویتنام اور ناگاساکی، ایٹم بم کے دھماکے کے بعد ندیوں سے اٹھتے ہوئے آگ کے شعلے آسمان چھو گئے ہوں— ’کیا ہوا، اُسی سے پوچھتے ہیں۔‘

’لیکن، کیا پوچھیں گے آپ— ثریا جیجو کی طرف مڑی۔ پھر ایک لمحے کو نظر اٹھا کر اُس نے نادر کی طرف دیکھا— جذبات پر قابو رکھو، اُف، دیکھو......وہ کیا کر رہی ہے......‘

’شاید وہ آرہی ہے......‘ جیجو نے ہونٹوں پر انگلی رکھی—

’کوئی اُس سے کچھ بھی نہیں پوچھے گا۔‘ یہ ثریا تھی—

’تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو باجی۔ کوئی اُس سے بھلا کیا پوچھ سکتا ہے۔ وہ بھی اس ماحول......اور ایسے عالم میں۔ لیکن...... کچھ......‘

’کچھ نہیں ہوگا۔‘

’ہم نے فیصلہ کرنے میں......‘

ثریا مشتاق احمد نے ایک لمبا سانس لیا۔ آواز ڈوبتی چلی گئی— ’کہہ نہیں سکتی......مگر— اُس نے اپنے شوہر اور نادر مشتاق احمد کی طرف ایک گہری نظر ڈالی— ’’ہم نے آپس میں بات کی تھی۔ اس کے سوا ہمارے پاس دوسرا راستہ ہی کیا تھا۔‘‘

’وہ آرہی ہے اور اب ہمیں خاموش ہو جانا چاہئے— اور یقیناً ہمارے تأثرات ایسے نہیں ہونے چاہئیں کہ اُسے کسی بات کا شک ہو کہ ہم اُس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں— اور یقیناً ہمیں اُس کی نفسیات کو بھی سمجھنا ہوگا۔‘

یہ جیجو تھا—

باہر کہاسا زمین پر گر رہا تھا۔ رات برف سے زیادہ ٹھنڈی ہوگئی تھی— دروازہ چر چرانے کی آواز ہوئی۔ برف پگھلی۔ دھند چھٹی۔ سامنے صوفیہ کھڑی تھی۔ صوفیہ مشتاق احمد۔ ایک لمحے کو وہ ان کے پاس آکر ٹھہری۔ لیکن رُکی نہیں— دوسرے ہی لمحے، وہ اپنے کمرے میں واپس لوٹ گئی—

پہلا بیان: ثریا مشتاق احمد

میں ثریا مشتاق احمد۔ پیدا ہوئی اتر پردیش کے بلند شہر میں۔ محلّہ شیخاواں۔ مسلمانوں کا محلّہ۔ زیادہ تر شیخ برادری کے مسلمان— پاس میں مسجد تھی۔ پاپا مشتاق احمد کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اسٹیشن روڈ پر۔ پنج گانہ نمازی— پیشانی پر سجدے کے داغ۔ چہرہ ایسا نورانی اور معصوم کہ میں نے زندگی میں آج تک نہیں دیکھا اور ممی تو جیسے گائے تھیں۔ نادر چھوٹا بھائی تھا۔ اُس سے پانچ سال چھوٹا اور صوفیہ اس سے دس سال چھوٹی تھی— بچپن میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں مٹکاتی تو اس کی شرارت سے سارا گھر خوشی سے جھوم جایا کرتا۔

کالج میں داخلے سے قبل ہی اشرف زندگی میں آگئے تھے— کیسے—؟ یہ لمبی کہانی ہے۔ چھوٹے سے شہر میں ایسی کہانیوں کے پر لگ جاتے ہیں۔ پھر کبوتر کی طرح پرواز کرتی یہ کہانیاں شیخاواں کے ایک گھر سے دوسرے گھر میں گونجنے لگی تھیں—

مما کو ہائپر ٹینشن تھا—

پاپا جلد گھر آجاتے تھے، طبیعت کی گرانی کا بہانہ بنا کر— پڑوس والی مسجد سے نماز کی صدا بلند ہوتے ہی، وہ تیز تیز لپکتے مسجد پہنچ جایا کرتے۔ وہاں سے آتے تو لفظوں کے تیر سے اُداس اور گھائل ہوتے— ممی اور وہ گھنٹوں اشرف کے بارے میں باتیں کرتے رہتے— مثلاً کیوں آتا ہے۔ کیا کام ہے— خاندان تو اچھا ہے نا— یہ لڑکی ناک تو نہیں کٹائے گی۔ صوفیہ تو کافی چھوٹی ہے—

نادر نے صرف ایک بار جلتی آنکھوں سے میری آنکھوں میں دیکھا تھا— 'بجیا، یہ کیا تماشہ ہے۔ چاروں طرف تم دونوں کے ہی ریڈیو بج رہے ہیں۔'

'تو بجنے دونا......'

تب گول گول آنکھیں نکال کر صوفیہ نے میری طرف دیکھا تھا۔

'ایک ریڈیو میرے لئے بھی لادونا......'

'پاگل، ایک ریڈیو نے ہی طوفان مچا دیا ہے......' نادر ناگواری سے بولا

لیکن میں یہ کہانی کیوں سنا رہی ہوں۔ میری اور اشرف کی کہانی میں اگر کچھ دلچسپ ہے تو صرف یہ کہ ہم نے لو میرج کی تھی۔ پھر اشرف دلّی آگئے اور میں بھی دلّی آگئی— اور جیسا کہ مہانگروں میں ہوتا ہے ایک دن خبر آئی۔ پاپا نہیں رہے۔ دوسرے سال خبر آئی۔ ممی نہیں رہیں۔ شیخاواں اُجڑ گیا۔ گھر ویران ہوگیا۔ بلند شہر سے رشتہ ٹوٹ گیا— نادر اور صوفیہ دونوں دلّی آگئے۔ کبھی کبھی احساس ہوتا، اشرف ان دونوں کی موجودگی سے پریشان تو نہیں ہیں۔ لو میرج کا یہ بھی ایک فائدہ تھا کہ اشرف کسی بھی بات پر بولتے یا ٹوکتے نہیں تھے۔ مگر من میں کچھ گانٹھیں تو پڑ ہی جاتی ہیں— کبھی جب اشرف کو، اُن کی اپنی دنیا میں قید اور اُداس دیکھتی تو دل کی بات ہونٹوں پر آجاتی......

'وہ......ایک دن پرواز کر جائیں گے......'

'ہاں......'

'کون جانتا تھا، ممی پاپا اس طرح ہمیں ذمہ داریوں سے باندھ کر......'

اشرف کہیں اور دیکھ رہے ہوتے—

'تم ان دونوں کی موجودگی کو لے کر......نہیں میرا مطلب ہے......'

اشرف گہرا سانس کھینچ کر کہتے ہیں — 'بچے ہیں......لیکن...... پرائیویسی کے یہی دن ہیں۔ یہ دن واپس نہیں آتے...... یہ دن چلے گئے تو......'

نہیں، مجھے احساس تھا، اشرف کی رومانی دنیا میں نئی نئی فنتاسی اور خوبصورت کہانیوں کی ایک بڑی دنیا آباد ہے......وہ اکثر اس کا ذکر بھی کیا کرتے......مثلاً ہنسی ہنسی میں......'ثریا، یہ لباس کیوں بنایا گیا......شادی کے بعد گھر میں میاں بیوی کو لباس نہیں پہننا چاہئے...... نیچرل ڈریس......آخر ہم قدرتی لباس میں کیوں نہیں رہ سکتے......؟ بس یہی تو چار دن ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ سوئمنگ......ایک ساتھ......'

اشرف جب دن میں مجھے لے کر کمرہ بند کرنے کی کوشش کرتے تو وحشت سی ہوتی — صوفیہ کیا سوچے گی۔ بڑی ہو رہی ہے۔ پھر جیسے کمرے کے بند سناٹے میں کوئی کیڑا چپکے سے منہ نکالتا — اشرف ایکدم سے بوکھلا کر اُس سے الگ ہو جاتے۔ خود ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیتے......

'جاؤ۔ تمہیں آزاد کرتا ہوں۔'

(3)

مصنف سے ثریا مشتاق احمد کی مختصر سی گفتگو کے کچھ حصے

''تو گویا تم سمجھ رہی تھی......کہ کیڑے......'

'ہاں......'

'یقیناً یہ کیڑے صوفیہ نے بھی دیکھے تھے......؟'

'اور نادر نے بھی......'

'پھر؟'

'نادر کو اپنی خودداری کا احساس تھا — وہ ایک بوجھ کی طرح اس گھر میں رہنے کے خلاف تھا اور اسی لئے اپنے لئے ایک چھوٹی سی نوکری کا بندوبست کرتے ہی......'

'اُس نے یہیں تمہارے قریب ایک فلیٹ لے لیا۔'

'ہاں۔ اور پھر صوفیہ کو بھی لے گیا......'

'نہیں۔ شروع میں نہیں لے گیا۔ اُسے اپنی مجبوریوں کا احساس تھا۔ مگر......صوفیہ چپ چاپ رہنے لگی — سارا سارا دن گم صم — اپنے آپ میں کھوئی ہوئی۔ کسی سے بولنا چالنا تک نہیں۔ بس جی چاہا تو کبھی کبھی ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی۔ اُس کا بس چلتا تو سارا سارا دن بستر پر سوئی رہتی — مگر جیجو اور پرائے گھر میں رہنے کا احساس......اور اچانک اُس دن......وہی کیڑا......

'کیڑا......؟'

ثریا مشتاق احمد اپنے بیان میں گم ہو گئی تھیں۔

ثریا مشتاق احمد کے بیان کا دوسرا حصہ

مٹیا مارفوسس۔آپ نے یقیناً یہ کہانی پڑھی ہوگی۔نہیں، میں کیڑے میں، یا کیڑا مجھ میں تبدیل ہوگیا، ایسی کوئی بات نہیں۔مگر وہ تھا، یہیں — کمرے میں — صبح، سورج نکلنے سے پہلے ہی، بستر چھوڑتے ہوئے، میں نے اُسے اشرف کی آنکھوں کے پاس رینگتے ہوئے صاف دیکھا تھا۔نہیں، مجھے کہیں سے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔یقیناً وہ تھا۔اور میرے بھگانے سے پہلے ہی......

اُس دن ارم کا برتھ ڈے تھا۔ اِرم کون۔ میری بیٹی۔ اشرف کی آنکھوں کا تارا۔ پانچ برس کی ارم کو لے کر اشرف کی آنکھوں میں خوابوں کے اتنے جھومر اور فانوس دیکھے کہ ڈر ڈر جاتی...... وہ ایک خوبصورت شیشے کا ایکوریم تھا، جو اشرف اُس کے لئے خصوصی طور پر لے کر آئے تھے — شیشے کی رنگین دنیا میں تیرتی سپنیلی مچھلیاں...... 'یہ سون مچھریاں ہیں......' اشرف نے کہا تھا — ایک دن میری بٹیا اس سے بھی خوبصورت ایک سون مچھلی بن جائے گی — انسانی سون مچھلی۔ پھر اپنی ہی بات پر وہ زور سے ٹھہا کہ لگا کر ہنسے تھے۔گھر سے باہر نکلتے ہوئے شام کی پارٹی کے بارے میں وہ کچھ تفصیلات بتا کر گئے تھے۔بچوں کی فہرست بن گئی تھی۔ڈرائنگ روم خوبصورت ڈھنگ سے سجانے کے لئے کہہ گئے تھے......' کیڑا'......ایک بار پھر اشرف کے دروازہ کے باہر نکلتے ہی میں نے کیڑے کی جھلک دیکھی تھی۔کیڑا...... میں چیختے چیختے رہ گئی — تب تک اشرف باہر نکل چکے تھے......چار بجے شام میں وہ واپس آئے تو ڈرائنگ روم کو ویسے کا ویسا پا کر وہ چیخ اٹھے۔

'صوفیہ کہاں ہے......'

'وہ......سو رہی ہے......'

'سات بجے تک محلے ٹولے کے بچے آجائیں گے اور ابھی تک وہ سو رہی ہے۔اتنے سارے لوگوں کو پالنے کا ٹھیکا لے لیا ہے تم نے۔یہ سونے کا وقت ہے......اور تم......تم کیا کرتی رہی......'

اشرف غصے سے بول رہے تھے...... کیڑا اُن کی آنکھوں کی پتلیوں پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔کمرے سے باہر نکل کر دیوار سے سٹی ہوئی، تھر تھر کانپ رہی صوفیہ کو میں نے پہلی بار دیکھا — شاید اشرف نے بھی صوفیہ کا یہ رنگ دیکھ لیا تھا۔ایک لمحے کو وہ ٹھہرے۔پھر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔دروازہ زور سے بند کر لیا —

نادر مشتاق احمد کا بیان

نہیں۔میں اشرف بھائی کو قصوروار نہیں مانتا۔یقیناً ہم نے اُن کی زندگی میں سیندھ لگائی تھی۔تقدیر کی مجبوری اپنی جگہ، لیکن اپنے اپنے فیوچر کے لئے کسی کی زندگی میں جبراً ہمیں داخل ہونے کا کیا حق تھا — صوفیہ اُس دن کافی روئی تھی۔ مجھے احساس تھا۔شاید جان لیوا تنہائی کے اُداس مکالمے اُسے بار بار پریشان کر رہے تھے۔ مجھے اُسے ایک بھائی کی سطح پر، اس سناٹے سے باہر نکالنا تھا۔اور میں نے اُسے نکالا۔دوسرے دن، یعنی اس ناخوشگوار حادثے کے دوسرے دن میں اُسے اپنے گھر لے گیا اور ایک دو ماہ بعد اُس کا داخلہ کمپیوٹر میں کرا دیا۔شاید اُسے اپنی تنہائیوں کو بانٹنے کا موقع مل جائے۔میں جانتا تھا۔وہ کوئی دوست نہیں بنا سکتی۔بوائے فرینڈ تو بالکل نہیں۔لیکن بڑی ہوتی صوفیہ کی ذمہ داری سے آزاد ہونے کا خیال مجھے زیادہ ستائے جا رہا تھا۔کیونکہ مجھے امریکہ جانا تھا۔میرے خواب امریکہ میں بستے تھے اور پھر شروع ہوا آنکھ مچونی کا کھیل — نہیں صاحب۔پہلی بار احساس ہوا، کہ بجیا نے خود لڑکا پسند کر کے کتنی قابلیت دکھائی تھی — رشتہ دار، عزیز، جان پہچان والے، رشتہ گھر، شادی ڈاٹ کام، مہندی ڈاٹ کام..لڑکا دیکھنے کا سفر شروع ہوا تو جیسے ایک نئے بازار کو دیکھنے کا موقع ملا۔نہیں صاحب۔ مجھے معاف کیجئے۔یقیناً اس لفظ سے بہتر کوئی لفظ میرے پاس نہیں ہے۔بازار — ہر کسی نے اپنے اپنے جانور کو پال پوس کر تیار کیا تھا۔بقرعید کے موقع پر فروخت کرنے کے لئے — قیمتیں آسمان چھو رہی تھیں۔اُس پر گھر گھرانہ، شجرۂ نسب کی تفصیل — یہ بازار میرے لئے اور بجیا کے لئے نیا تھا۔صوفیہ ہمیں گاڑی میں آتے جاتے ہوئے دیکھتی۔بجیا کو فون پر باتیں کرتے ہوئے سنتی۔پھر واپس آ کر ہمارے خاموش چہرے پر اپنی ادھ کھلی آنکھیں رکھ کر، واپس اپنے کمرے میں لوٹ جاتی — بجیا کو کبھی کبھی غصّہ آجاتا......

’سب کے رشتے ہو جاتے ہیں۔مگر یہاں……‘

جیجو ایک لمبا سانس بھر کر کہتے……’فکر کیوں کرتی ہو،آسمان سے ایک دن……‘

وہ صوفیہ کے کمرے میں جاتے۔اُسے بانہوں کے سہارے واپس لے کر آتے—’’کیا کمی ہے اس میں……اور ابھی عمر کون سی نکلی جا رہی ہے……‘وہ ایک بار پھر ٹھنڈا سانس بھرتے۔ہر چیز کا وقت مقرر ہے۔کیوں صوفیہ۔ایک دن چپکے سے ایک شاہزادہ آئے گا اور ہوا کے رتھ پر بیٹھا کر……‘‘

’نہیں۔کوئی نہیں آئے گا‘صوفیہ مسکرانے کی کوشش کرتی۔

’آئے گا……‘جیجو میری طرف مڑتے۔’نادر، اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔صوفیہ سے زیادہ خوبصورت لڑکی میں نے کم ہی دیکھی ہے، اس کا اعتراف کرتا ہوں۔مگر کمی کیا ہے صوفیہ میں—‘جیجو ہنستے۔بس ایک کمی ہے۔خوبصورت کے ساتھ خوب سیرت بھی ہے۔اور خوب سیرت ’لڑکیوں کے بازار ذرا ٹھنڈے ہیں……‘

’میں کیا خوب سیرت نہیں تھی……‘ثریا آنکھیں تریرنے کی کوشش کرتی تو جیجو فلک شگاف قہقہہ بلند کرتے—’خود پر کیوں لیتی ہو۔صوفیہ مختلف ہے۔اور ایک دن……

میں سوچتا تھا۔ایک دن……ایک دن کیا ہوگا— کوئی معجزہ ہو جائے گا___ چمتکار۔امریکہ بار بار خوابوں میں منڈلاتا ہے۔نہیں ہنسیے مت—پریتی زنٹا، منموہن سنگھ اور ہمارے نیتاؤں سے زیادہ کلنٹن، بش اور کیری مجھے اپنے لگتے تھے۔جینفر لوپیز کے خیالوں میں، میں زیادہ ڈوبا رہتا تھا—ہاں، یاد آیا۔ایک لڑکا اور آیا تھا۔فریاد عارف۔لدھیانہ کا۔قد پانچ فٹ دس انچ۔عمر چالیس سال۔باہر رہنے کا دس برس کا تجربہ تھا۔عمر زیادہ تھی تو کیا ہوا۔یہ رشتہ ہمیں نیٹ سے ملا تھا۔صوفیہ کی تصویر اور بایوڈاٹا لڑکے کو پسند آیا تھا۔اُس کی تصویر بھی نیٹ سے ہم نے نکال لی تھی۔شکل اچھی نہیں تھی۔لیکن کیا شکل ہی سب کچھ ہوتی ہے……ہاں، اُس کے ہونٹوں کے پاس ایک داغ تھا……پتہ نہیں، کس چیز کا داغ تھا۔جلنے کا یا……مگر داغ تھا—ڈرتے ڈرتے ہم نے تصویر صوفیہ کے حوالے کی۔مگر تصویر دیتے ہوئے یقیناً ہمارے ہاتھ کانپ رہے تھے۔نظر جھکی ہوئی تھی۔

صوفیہ مشتاق احمد کا بیان

تصویر ہاتھ میں لیتے ہی میں ہنس پڑی تھی۔یہ پاپا کے کوئی دوست ہیں کیا……نہیں، کم از کم جیجو مجھ سے اتنا بڑا مذاق نہیں کر سکتے۔جیجو کے گھر سے باہر آنے کے بعد بھی میں جیجو کے لئے ذرا بھی خفا نہیں تھی۔یقیناً وہ سب سے زیادہ مجھے پہچانتے تھے۔اور میرے لئے سب سے زیادہ جنگ بھی، وہی لڑتے تھے اور خاص طور پر ایسے موقع پر، جب کمرے میں یکا یک کالی کالی بدلیاں چھا جاتیں……پھر جیسے تیز تیز آندھیوں کا چلنا شروع ہو جاتا۔نہیں، میں نے تصویر دوبارہ دیکھی……اور اچانک چہرے کا طواف کرتی آنکھیں داغ کے نشان کے پاس آ کر ٹھہر گئیں۔ہونٹ کے نیچے کا حصہ……تصور اور خیالوں کی وادیوں میں، بوسے کے لئے سب سے خوبصورت جگہ۔میں تو اس جگہ کا بوسہ بھی نہیں لے سکتی۔میں ہنس رہی تھی۔پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی۔کمرے میں دھند بڑھ رہی تھی۔شاید باہر جیجو، بجیا اور نادر بھائی نے میرے ہنسنے کی آوازیں سن لی تھیں……

’صوفیہ‘

دروازے پر تھاپ پڑ رہی تھی۔

نادر غصے میں تھے……’دروازہ کیوں بند کر لیتی ہو‘

بجیا کی آنکھوں میں ایک لمحے کو ناگواری کے بادل لہرائے……’ہم نے ابھی رشتہ منظور کہاں کیا ہے۔صرف تم سے رائے پوچھی ہے……

’نہیں۔وہ……کیڑا‘

دروازہ کھولتے ہوئے میری آنکھیں وحشت میں ڈوبی تھیں—جیجو نے سہارا دیا—صوفے تک لائے— کچھ ہی دیر میں مکالمے

بدل گئے۔

’مگر کیڑا......‘

نادر نے بجیا کی طرف دیکھا— ’کیڑے بڑھ گئے ہیں۔ کیوں۔ رات بھر کاٹتے رہتے ہیں۔ دوا کا چھڑکاؤ کرو۔ یا گڈ نائٹ لگاؤ۔ مگر کیڑے نہیں بھاگتے......‘

بجیا یعنی ثریا مشتاق احمد نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر ایک طنز بھری مسکان تھی۔

’آپ یقین جانیے، کوئی تھا۔ جو دیواروں پر رینگ رہا تھا۔ ایک دم سے کمرے کی دھوپ اُتر گئی۔ تاریکی چھا گئی...... کمرے میں کہاسے بھر گئے اور...... میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر...... میں نے دیکھا...... جیجو آہستہ آہستہ میری طرف دیکھ رہے تھے— پھر اُن کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ داخل ہوئی—

’ایک ستارہ آئے گا......‘

’’ستارے آسمان سے آتے آتے لوٹ گئے......‘‘ یہ بجیا تھی۔

’’ہاں، لیکن گھبراؤ مت، ایک ستارہ آئے گا اور یوں اچھل کر تمہاری جھولی میں جا گرے گا......‘ یہ جیجو تھے— ہونٹوں پر ہنسی۔ پھر وہ تمہاری آنکھوں میں، کبھی ہونٹوں پر آکر چپکے گا...... یہ میں ہوں۔ پاگل۔ پہچانا نہیں مجھے۔ تمہاری قسمت کا ستارہ......

’اُس کے چہرے پر دھوپ بہت تھی۔ تم نے دیکھا نا‘— بھائی نظر نیچی کئے بہن کو ٹٹول رہا تھا۔

’’میں جگنو تلاش کرنے گئی تھی۔ راستہ بھٹک گئی— ‘ یہ وہ تھی۔ اُس کی آواز اندر کے روشن دان سے بلند ہوئی اور اندر ہی اندر گھٹ گئی۔

جیجو کا بیان

دراصل اُس 40 سال کے ادھیڑ مرد کی تصویر دیکھ کر مجھے خود بہت غصہ آیا تھا— نادر اور ثریا، رشتہ کے لئے مجھے کم ہی لے جاتے تھے۔ دراصل وہ اس ’مہرے‘ کو آخری وقت کے لئے بچا کر رکھنا چاہتے تھے اور کسی خاص موقع پر ہی خرچ کرنا چاہتے تھے۔ یہ سب میرے لئے بھی نیا تھا۔ کیونکہ ہر برس بدلتے کلینڈر کے ساتھ ہی، میں صوفیہ کو دیکھ کر اُداس اور پریشان ہوا جا رہا تھا اور آپ سمجھ سکتے ہیں، خود صوفیہ کی کیا حالت ہوگی— میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ مسلمانوں کے یہاں، ایک خوبصورت جوان لڑکی کی شادی کو لے کر اتنی ساری الجھنیں سامنے آسکتی ہیں— گھر گھرانہ اچھا۔ خاندان سیّد۔ مگر کسی کو لڑکی کا قد کچھ کم لگتا۔ کسی کو عمر کچھ زیادہ۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ پوچھنے والوں کا گریبان پکڑ کر کہوں، کہ اٹھارہ سال سے رشتہ تلاش کرتے ہوئے تم لوگوں نے اسے 23 سال کا کر دیا ہے اور اب— شاید میرے اسی غصّے کی وجہ سے نادر اور ثریا مجھے کبھی اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ مگر...... کبھی کبھی اپنی بڑی ہوتی ارم کو دیکھ کر گہری سوچ میں گرفتار ہو جاتا۔ کیا میرے ساتھ بھی— اور ہوایوں کہ اچانک اُس دن ارم کو دیکھا تو چونک گیا— ارم غائب تھی۔ ارم میں صوفیہ آگئی تھی—

● ●

قارئین، ایک بار پھر مداخلت کے لئے معافی چاہوں گا۔ کہانی شروع ہوئی تو سوچ کے دائرے پھیلتے چلے گئے۔ یہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کیا یہ بھی کوئی کہانی ہوسکتی ہے۔ ایک مسلمان لڑکی کو لڑکے کی تلاش ہے۔ عمر 23 سال، خوبصورت، تعلیم یافتہ— تہذیب کی اتنی صدیاں پار کرنے کے بعد بھی، چوتھی دنیا کے ہتھیاروں کی ریس میں آگے نکلنے والے ایک بڑے ملک میں، یہ مسئلہ ایک کہانی کا جزو بن سکتا ہے، میں نے کبھی سوچا نہیں تھا—

اُس دن، میں دوبارہ نادر مشتاق احمد کے گھر گیا۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر بیل پر اُنگلی رکھی۔ دروازہ کھولنے والی وہی تھی۔

'آیئے۔'

'نادر؟'

'وہ باہر گئے ہیں۔'

صوفیہ، صوفے پر دھنس گئی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی—

'چائے بناؤں!'

'نہیں۔ ابھی رہنے دو۔'

میں آہستہ آہستہ آنکھیں گھماتا کمرے کی ویرانی کا جائزہ لے رہا تھا۔ دیوار پر قطار میں اُڑتی چار چڑیائیں کچھ اور ہی کہانی بیان کر رہی تھیں۔ تیسری والی چڑیا کی قطار ٹوٹ گئی تھی۔ تیسری چڑیا کیل سے جھول رہی تھی۔ پتہ نہیں کب سے۔ دیوار کے کنارے پر مشتاق احمد کی تصویر لگی تھی۔ تصویر پر ذرا بھی گرد نہیں تھی۔ جیسے ابھی ابھی گرد صاف کی گئی ہو۔ لیکن کمرے کی باقی چیزیں......

'اندھیرا ہے' میں آہستہ سے بولا۔ جبکہ دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ کھڑکی کے پاس پردہ پڑا تھا۔

'اِس گھر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے......' صوفیہ آہستہ سے بولی۔

'اور وہ ڈراکیولا......'

میں آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس بڑھا—

'نہیں، یہاں نہیں۔......' یہاں میرے ساتھ آیئے۔ میرے کمرے میں......'

وہ تیزی سے اُٹھی— مجھے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی— سنگل بیڈ کا دیوان پڑا تھا— چادر کئی دنوں سے بدلی نہیں گئی تھی— کمرہ بے رونق تھا اور یقیناً اس کمرے میں کھڑکی کے راستے گھنے کہرے، داخل ہو جاتے ہوں گے—

'یہاں...... یہاں سے۔ یہ دیوار جو ہے......آپ دیکھ رہے ہیں نا......'

'مگر یہاں تو کوئی قبرستان نہیں ہے۔'

'آہ۔ نہیں ہے......' صوفیہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی— 'میں نے کب کہا کہ یہاں قبرستان ہے۔ مگر بن جاتا ہے۔ رات کے وقت۔ اپنے آپ بن جاتا ہے— دھند میں ڈوبا ہوا ایک قبرستان۔ ڈھیر ساری قبریں ہوتی ہیں۔ ایک کھلا ہوا 'کوفن' ہوتا ہے۔ وہ یہاں...... یہاں دیواروں پر رینگتا ہوا، کھڑکی سے اچانک میرے کمرے میں کود جاتا ہے......'

'یقیناً، وہم......اور وہم کا تعلق تو......'

'مجھے پتہ ہے۔ وہم ہے میرا۔ مگر کیا کروں۔ وہ رات میں، آپ یقین کریں میرے کمرے میں ہوتا ہے......'

'کیوں؟'

'اب یہ بھی بتانا پڑے گا بھلا۔ خون پیتا ہے......یقین نہیں ہو، تو یہ داغ دیکھئے۔' اُس نے اپنی گردن دکھائی۔ گردن پر یقیناً نیلے داغ موجود تھے۔

'کوئی یقین نہیں کرتا۔ میں بھی مانتی ہوں، وہم ہے مگر۔ وہ ہے۔ وہ آتا ہے......اور......'

میں نے کہانی بدل دی۔ 'اوہ......تم نے بتایا تھا۔ تم بار بار مرتی تھی—

'کون نہیں مرے گا ایسے— جب آپ بار بار اُسے سجا کر باہر لے جاتے ہوں۔ یا کبھی کبھی سج دھج کر گھر میں ہی نمائش یا میلہ لگا دیتے ہوں۔ ایک حد ہوتی ہے۔ کوئی بھی کتنی بار مرتا ہے۔ کتنی بار مر سکتا ہے کوئی۔ میں تو ہر بار، ہر پل......'

صوفیہ کہتے کہتے رُک گئی تھی—

'مگر اُس دن نہیں مری۔ اُس دن۔ میں نے سوچ لیا تھا اور مطمئن تھی۔'

'اُس دن......'

’ارے وہی۔ اِن ڈسنٹ پروپوزل۔‘ وہ کہتے کہتے رُکی — ایک ہنسی چہرے پر شعلے کی طرح کوندی۔ پروپوزل، کبھی بھی ان ڈسنٹ نہیں ہوتا۔ مگر بجیا اور بھیا کسی ساتویں عجوبے کی طرح اُس پروپوزل کو لے رہے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں پہلی بار کمرے میں کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

’اب مزہ آئے گا۔‘ وہ ٹھہری — پھر بولی۔ اب کسی کو کیا پتہ۔ میرے جسم میں کتنے انگارے اکٹھا ہو گئے ہیں۔ اب تو شاید سرد بھی ہونے لگے ہوں یہ انگارے — نہیں، سرد نہیں۔ بڑھتے بڑھتے پورے جسم میں پھیل گئے ہیں۔ پھیلتے پھیلتے...... آپ نہیں سمجھیں گے۔‘ اُس نے گہرا سانس لیا۔

’لیکن پروپوزل۔؟‘

’’وہ بھی نیٹ سے برآمد ہوا تھا۔ صوفیہ کے ہونٹوں پر ہنسی تھی — ’عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ تھکے ہارے لوگوں کے لئے یہ بھی ہاتھ آیا ایک موقع تھا مگر — جس وقت بجیا اور بھائی اُس سے ملنے ہوٹل گئے، وہ ہوٹل کی لابی میں بیٹھا سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔ یہ بجیا نے ہی بتایا۔

(5)

اِن ڈسنٹ پروپوزل

ہوٹل کی لابی میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ نادر اور صوفیہ اُس کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔ ظاہر ہے، وہ لڑکی کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ لیکن اُس نے ملنے کا تجسس نہیں دکھایا تھا۔ سگریٹ کے گول گول مرغولے کے درمیان اُس کے چہرے کے تأثر کو پرکھا نہیں جا سکتا تھا —

نادر نے گلہ کھکھارتے ہوئے اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی اُنگلیوں میں، مہنگی سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ عام طور پر مسلمان مردوں میں سونا پہننے کا رواج نہیں ہے۔ گلے میں بھی سونے کا ایک چین پڑا تھا۔ یقیناً اُس کی منشا یہ تھی کہ سامنے والا اُسے کسی رئیس سے کم نہ سمجھے۔

ثریا نے پہلو بدلا اور ناگوار آنکھوں سے نادر کو دیکھا — اُس نے سگریٹ آرام سے ختم کیا۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے باقی ٹکڑے کو مسلا۔ پھر مسکرایا —

’معاف کیجئے گا۔ سگریٹ میری مجبوری ہے۔‘

’کیوں نہ ہم معاملے کی بات کریں۔‘ نادر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وہ ایک بار پھر مسکرایا— 'مجھے بھی جانے کی جلدی ہے۔ دراصل میں سوچ رہا تھا— نہیں، جانے دیجئے۔ کسی بھی چیز کو تاڑ کی طرح کھینچنے میں میری دلچسپی نہیں ہے۔ بھاگتی دوڑتی دنیا میں الجبرے کے فارمولے کی طرح میں نے زندگی گزاری ہے۔ دو پلس دو برابر چار— سمجھ گئے نا۔ میرا پروپوزل ہوسکتا ہے، آپ کو پسند نہیں آئے۔ مگر سوچئے گا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ نہیں پسند آئے تو آپ جا سکتے ہیں۔ کوئی جہیز لیتا ہے۔ کسی کی کوئی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ کسی کی کوئی— میرے پاس سب کچھ ہے۔ خود سے حاصل کیا ہوا— اس لئے مجھے کچھ نہیں چاہئے۔' وہ ایک لمحے کو ٹھہرا اور دوسرے ہی لمحے جیسے نشانہ سادھ کر اُس نے گولی داغ دی......

''ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے بہتر ہے کہ ہم ایک رات ساتھ ساتھ گزاریں۔''

اُس نے ہمارے تأثرات کی پرواہ نہیں کی۔ جملہ ختم کرتے ہی اٹھا اور دوسری طرف منہ کرکے دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ لائٹر کی خوبصورت ٹیون کے ساتھ ایک شعلہ لپکا تھا، جس کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی ہم نے ضرورت محسوس نہیں کی—

صوفیہ کا جواب

واپس گھر لوٹنے تک جیسے یہ دنیا ایک چھوٹے سے سیپ میں بند ہو چکی تھی۔ صوفے پر برسوں کی بیمار کی طرح ثریا دھنس گئی۔ دوسرے صوفے پر نادر نے اپنے آپ کو ڈال دیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ دل و دماغ پر پتھراؤ جاری تھا— کب کس وقت صوفیہ آکر قریب میں بیٹھ گئی، پتہ بھی نہیں چلا۔ مگر جیسے ساری دنیا الٹ پلٹ ہو چکی تھی— سیپ کے منہ کھل گئے تھے۔ یا سیپ، لہروں کی مسلسل اُچھال کے بعد ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی تھی۔

'کیوں، کیا ہوا......؟'

یہ صوفیہ تھی۔ معمول کے خلاف اُس کے ہونٹوں پر ایک ہنسی بکھری ہوئی تھی— جیسے وہ یقیناً اس موسم کی عادی ہو چکی ہو......!

جیجو پاس میں آکر بیٹھ گئے۔ صوفیہ نے جیجو کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

'یہ آتش بازی بھی پھس ہوگئی۔ کیوں جیجو......؟'

لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ نادر مشتاق احمد اور ثریا مشتاق احمد کی آنکھوں میں حساب کتاب کا سلسلہ جاری تھا—

'بتا دوں؟' یہ نادر مشتاق احمد تھا۔

'نہیں، جیجو نے درد کی تاب نہ لاکر آنکھیں بند کرلیں—

'بتانے میں حرج ہی کیا ہے......' ثریا کی آواز دبی دبی تھی......

'نہیں۔ مجھے بتایئے۔' صوفیہ اور قریب آگئی۔ میں جانتی ہوں مجھے کوئی پسند نہیں کرسکتا۔ میں کتنی بار آپ لوگوں سے کہہ بھی چکی ہوں۔ مگر— اللہ کے واسطے بتایئے ہوا کیا ہے......'

اور پھر، جیسے ایک کے بعد ایک آتش بازی چھوٹتی چلی گئی۔ آتش بازیوں کا کھیل رُکا تو دوسرا بم کا گولہ صوفیہ نے داغ دیا۔

'میں تیار ہوں۔ اُسے آنے دیجئے۔ کب بلایا ہے— ' ثریا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، اُس نے اپنا فیصلہ سنا دیا— میں تھک گئی ہوں۔ اب حوصلہ نہیں ہے، اب یہ کھیل ختم ہو جانے دیجئے۔ اب ایک آخری کھیل— ہم سب کے فائدے کے لئے۔ وہ پھر رُکی نہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی—

● ●

قارئین۔ کوئی دنیا اس سے زیادہ خوبصورت اور کوئی دنیا اس سے زیادہ بدصورت نہیں ہوسکتی۔ یہ میرا ماننا ہے۔ اور شاید یہ اسی لئے بطور مصنف میں اس کہانی کا گواہ رہا— بطور مصنف میں نے اپنے آپ کو بھی اس کہانی میں شامل کیا— مجھے نہیں معلوم، ثریا اور نادر نے صوفیہ کی

رضامندی کو اپنی منظوری کی ہری جھنڈی کیسے دے دی۔ یا پھر صوفیہ اس پروپوزل کے لئے مان کیسے گئی۔ اس ترقی یافتہ ملک میں شادی کے اس بھیانک بازار کا تصور میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ شاید اسی لئے اس خوفناک کہانی کا انت سنانے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے اور اسی لئے اب میں آپ کے درمیان سے رخصت ہوتا ہوں — دسمبر کی بھیانک سردی اپنے عروج پر تھی۔ اُس دن کی صبح عام صبح جیسی نہیں تھی۔ مگر صوفیہ مطمئن تھی۔ وہ شان سے گنگناتی ہوئی اٹھی ___ دوپہر تک سرد لہری میں اضافہ ہو چکا تھا —

گھڑی کی تیزی سے بڑھتی سوئیاں ایک نئی تاریخ لکھنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

●●

ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کو گھیر کر سب بیٹھ گئے تھے۔ جیسے کسی میّت میں بیٹھے ہوں۔ جنازہ اٹھنے میں دیر ہو — ایک ایک لمحہ برسوں کے برابر ہو۔ پھر جیسے ہونٹوں پر جمی برف، بھاپ بن کر پگھلی —

'آہ، یہ نہیں ہونا چاہئے تھا......، یہ جیجو تھا۔

'کیا ہوگا؟' ثریا کی آنکھوں میں اُڑ کر وہی کیڑا آ گیا تھا —

نادر نے بات جھٹکی — رات میں یہ کیڑے پریشان کر دیتے ہیں'۔

'شی......وہ آ رہی ہے......' جیجو نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی...... 'اور جان لو، وہ کوئی کیڑا نہیں ہے'۔

اور جیسے وقت تھم گیا — صوفیہ ایک لمحے کو اُن کے سامنے آ کر رُکی —

'آپ لوگ......آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں'۔

نہیں۔ یہ وہ لڑکی تھی ہی نہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈر جانے والی — پتوں کی طرح بکھر جانے والی — اُس کی ساری تیاریاں مکمل تھیں —

وقت آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔

اُس نے پلٹ کر جیجو کی طرف دیکھا — نہیں یہ جیجو نہیں تھے۔ جیجو کی جگہ کوئی لاش تھی۔ کاٹو تو خون نہیں۔ آنکھیں بے حرکت......

اُس نے پلٹ کر بھائی کی طرف دیکھا۔ بھائی ہمیشہ کی طرح نظریں نیچی کئے، اپنے آپ سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا —

بہن نے چہرہ گھما لیا تھا۔ اس لئے وہ بہن کے جذبات کو نہیں دیکھ سکی —

پھر جیسے کمرے میں ایٹم بم کا دھماکہ ہوا —

'پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں بس، وہ آتا ہوگا — میں کمرے میں ہوں۔ آپ اُسے کمرے میں ہی بھیج دیجئے گا'۔

اُس کی آواز نپی تلی تھی۔

پھر وہ وہاں ٹھہری نہیں۔ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی —

●●

کوئی امتحان ایسا بھی ہو سکتا ہے، اُس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اپنی خاموشی کے ریگستان میں چپ چاپ سلگتی رہی۔ کسی نے اُس کے اندر کی آواز کو کب سنا تھا۔ کسی نے بھی اُس کے اندر کی لڑکی کو کب دیکھا تھا۔ خود اُس نے بھی نہیں۔ نہیں۔ یہ سچ ہے۔ ایک عرصہ سے وہ اپنے آپ سے نہیں ملی۔ کمپیوٹر کو چننگ سے گھر اور گھر سے اپنے اُداس کمرے کا حصہ بنتے ہوئے بس وہ خلاء میں ڈوبتے ابھرتے بھنور کو دیکھنے میں ہی صبح سے شام کر دیتی — کمرے کے آسیب اُسے گھیر کر بیٹھ جاتے — اُسے سمجھنے والا کون تھا۔ اُسے پڑھنے والا کون تھا — وہ عشق نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے لئے کوئی لڑکا پسند نہیں کر سکتی تھی۔ انٹرنیٹ پر چیٹنگ کرتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپتے تھے۔ کسی لڑکے سے دو منٹ چیٹنگ کے بعد ہی اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنی شروع ہو جاتی۔ بدن کانپنے لگتا۔ سائبر کیفے کی ایک ایک شئے گھومتی ہوئی نظر آتی۔ وہ بدحواس

پریشان سی گھر آتی تو.....'

لیکن گھر کہاں تھا۔ ماں باپ ہوتے تو گھر ہوتا۔ بہن اور جیجو کا گھر، گھر کہاں ہوتا ہے۔ بھائی کا گھر، گھر کہاں ہوتا ہے۔ گھر میں تو سپنے رہتے ہیں۔ سپنوں کے ڈھیر سارے ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار— یہ چھوٹے چھوٹے تارے تو ہتھیلیوں سے چھوٹ چھوٹ کر گرتے رہے۔ اندھیرے کمرے میں آسیبی مکالمے رہ گئے تھے—

'کھانا بنایا—؟'

نہیں۔

'کیوں؟'

خواہش نہیں ہوئی—

'خواہش یا.....؟'

ہونٹوں پر ایک ناگوار سا تأثر اُبھرا۔ کیا بس اِسی کام کے لئے رہ گئی ہوں—

''ہوسکتا ہے۔ بھائی نے یہی سوچا ہو۔''

'نہیں۔ بھائی اُس محبت کرتا ہے۔

'سارے بھائی محبت کرتے ہیں مگر.....'

'میرا بھائی'......وہ کہتے کہتے رُک جاتی......

تمہارا بھائی ہر لمحہ تمہارے اندر رہتا ہے۔ جانتی ہو کیوں۔؟

'نہیں۔'

'اُس کے پاس سپنے ہیں.....'

'تو.....؟'

'وہ اُڑنا چاہتا ہے۔ اُڑ کر اپنے لئے بھی سپنے دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر تم۔ افسوس۔ تم نے اُس کے سپنوں کو راکچھس کے ان دیکھے قلعے میں نظر بند کر رکھا ہے۔ وہ تم سے چھٹکارا چاہتا ہے—'

'نہیں۔' ایک جھٹکے سے اُٹھ کر وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی— ' جھوٹ بولتے ہو تم۔ کوئی چھٹکارا نہیں چاہتا۔ سب پیار کرتے ہیں مجھ سے۔ ہاں، بس، عمر کے پنکھ پرانے پڑ رہے ہیں۔ پنکھ پرانے ہو جائیں تو کمزور ہو جاتے ہیں۔ میں ایک بے ارادہ سڑک بن گئی ہوں۔ کوئی گزرنا ہی نہیں چاہتا۔'

'نہیں ڈرو مت۔'

کمرے کے آسیب اُسے گھیر رہے ہیں۔ خود سے باتیں کرتے ہوئے سارا دن گزار لیتی ہو۔ پتہ ہے بہن کیا کہتی ہے؟

'نہیں۔'

'بھائی پر ناراض ہوتی ہے۔ اسی لئے تو تمہیں وہاں سے نکالا گیا۔ تم کوئی کام ہی نہیں کرتی تھی۔ بس سوتی رہتی تھی۔'

'سوتی کہاں تھی۔ میں تو خود میں رہتی تھی۔ خود سے لڑتی تھی۔'

'کیا ملا۔ بہن نے بھائی کے یہاں بھیج دیا۔'

'بھیجا نہیں۔ میں خود آئی.....' کہتے کہتے ایک لمحے کو وہ پھر رُک گئی......

'دراصل تم ٹیبل ٹینس کی بال ہو.....سمجھ رہی ہونا، چھوٹی سی ٹن ٹن...... بجنے والی بال......لیکن اس بال کو راستہ نہیں مل رہا ہے......

'کیا کروں میں.....'

'افسوس، تم ابھی کچھ نہیں کرسکتی— تم صرف آگ جمع کرتی رہو۔ سن رہی ہونا۔ آگ......اپنے آپ کو برف کی طرح سرد مت پڑنے

دو۔ سرد پڑ گئی تو...... لاش کو اپنے گھر کون رکھتا ہے۔ وہ بھی بدبودار لاش......'

••

ٹیبل ٹینس بال کی طرح ادھر اُدھر لڑھکنے کا سلسلہ جاری رہا — پتہ نہیں، وہ کتنی بار مری۔ پتہ نہیں وہ کتنی بار زندہ ہوئی۔ بہن اور بھائی کے ہزاروں سوالوں سے لاتعلق، آسیب سے لڑتی لڑتی تھک گئی تو اُس 'اِن ڈسنٹ پرپوزل' کے لئے اُس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اور یہ حیرت کرنے والی بات تھی — پہلی بار اُسے لگا۔ کمرے میں آسیب اکٹھا نہیں ہوئے ہیں۔ پہلی بار لگا، اُس کے اَن کہے مکالموں کی بھاپ سے کمرے میں 'کہاسے' نہیں جمع ہوئے ہوں — کمرے میں خوف کی چادر ہی نہیں تنی ہو — کمرے میں ڈھیر سارے چمگادڑ نہیں اکٹھا ہوئے ہوں۔ جیسے بہن، دھیرے سے ہنستی ہوئی ایک دن بھائی سے بولی تھی — آسیب، وہاں آسیب رہتے ہیں سمجھاؤ اُسے۔ کمرے کو اپنی خاموشی سے اُس نے آسیب زدہ بنا دیا ہے اور یقیناً اُسے بھائی کا چہرہ یاد نہیں۔ بھائی نے ہمیشہ کی طرح نظریں جھکا کر کچھ دھیرے دھیرے کہنے کی کوشش کی ہوگی۔

مگر آج —

آوازوں کے تیر غائب تھے۔ شب خونی ہوا کا پتھراؤ گم تھا — آئینہ میں وہ پاگل لڑکی موجود نہیں تھی۔ جسے بار بار بہن کی پھٹکار سننی پڑتی تھی۔ نہیں لڑکی۔ ایسے نہیں۔ مانگ ایسے نکالو۔ لباس، کپڑے کیا ایسے پہنے جاتے ہیں۔ زلفیں کیا ایسے سنواری جاتی ہیں۔

وہ دھیرے سے ہنسی —

آئینہ والی لڑکی جو بھی ہنسی —

پھر وہ تیز تیز ہنستی چلی گئی —

••

کمرے کی دیوار گھڑی پر ایک اُچٹتی نظر ڈال کر وہ کمرے سے ملحق باتھ روم میں چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ اُس نے بھیڑ دیا تھا تاکہ 'اُس کی' آہٹ کی اطلاع اُسے باتھ روم میں مل سکے۔ باتھ روم کا ٹائلس ذرا سا گندہ ہو رہا تھا۔ اُس نے شاور کے نیچے کے دونوں نل کھول لیے۔ گیزر چلا دیا۔ گرم گرم پانی جب تلووں سے ہو کر بہنے لگا تو وہ ٹائلس کو اپنے بے حد ملائم گورے ہاتھوں سے تیز تیز رگڑنے لگی۔ ٹائلس کے چاروں طرف صابن کے جھاگ پھیل گئے تھے۔ اُس نے اپنے لئے ایک بے حد خوبصورت اور سینسیشنل نائیٹی کا انتخاب کیا تھا۔ یہ نائیٹی سیاہ رنگ کی تھی۔ جو اُس کے گورے 'جھنجھناتے' بدن سے بے پناہ میچ کھاتی تھی۔ نائیٹی اُس نے باتھ روم کے ہینگر میں ٹانگ دی۔ صابن کے گرم گرم جھاگ اور فواروں سے، وہ کچھ دیر تک اپنے ننگے پاؤں سے کھیلتی رہی — پھر مدہوشی کے عالم میں ٹوٹتے بنتے جھاگوں کے درمیان بیٹھ گئی — ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں۔ دوسرے ہی لمحے کپڑے اُس کے بدن سے آزاد ہو کر اُڑتے چلے گئے۔ اُس نے نل بند کیا۔ جسم میں مچلتے طوفان کا جائزہ لیا — صابن کے جھاگوں کو ہاتھوں سے اُڑایا — یا پھر اپنے ننگے بدن کے ساتھ وہیں لیٹ گئی —

کمرے کا دروازہ چرمرایا تو اچانک وہ، جیسے خواب کی وادیوں سے لوٹی — منہ سے بے ساختہ آواز بلند ہوئی —

''آپ انتظار کیجئے — آ رہی ہوں۔''

ایک لمحے کو وہ حیران رہ گئی — کیا یہ اُس کی آواز تھی — ؟ صوفیہ کی آواز — جس کے بارے میں مشہور تھا کہ صوفیہ کے تو منہ میں زبان ہی نہیں۔ کیا یہ وہ تھی...... آج سارے موسم جیسے بدل گئے تھے — وہ بدل گئی تھی —

ایک لمحے کو باتھ روم کی کنڈی پر ہاتھ رکھ کر وہ ٹھٹھکی —، دروازہ بند کروں یا — نہیں — بند نہیں کروں گی — بند کرنے سے کیا ہوگا — آئینہ کے سامنے برقع پہننے سے کیا حاصل۔ شرط رکھنے والے کو تو سب کچھ دیکھنا ہے۔ اُسے پورا پورا۔ ایک وقت آتا ہے، جب مانگیں جسم سے آگے نکل جاتی ہیں۔ جسم کی ساری حدود توڑ کر۔ آگے۔ بہت آگے...... اُس نے ہلکی سی انگڑائی لی۔ واش بیسن کے آئینہ میں اپنے عکس کو ٹٹولا...... نہیں وہ ہے۔ ایک مدہوش کر دینے والی 'صفت' کے ساتھ...... نہیں، یقیناً، وہ کسی بیوٹی کانٹسٹ میں شامل نہیں ہے۔ مگر...... ایک لمحے کو اُس نے پلکیں جھپکائیں — آئینہ میں گیزر چل رہا تھا۔ نہیں یہ گیزر نہیں تھا۔ یہ تو وہ تھی۔ مجسم، سرتاپا آگ......

اُس نے گیزر بند کردیا۔ ٹھنڈے پانی کا شاور کھول دیا...... شاور کی بوندیں آگ میں گرتی ہوئی دھواں دھواں منظر پیش کررہی تھیں۔ چاروں طرف سے آگ کی جھاس اُٹھ رہی تھی۔ ٹائلس سے — برہنہ دیواروں سے — آئینہ سے — اور — وہ ایک دم سے چونکی۔ کمرے میں کوئی انتظار کررہا ہے — آگے بڑھ کر اُس نے ٹوول کھینچا — ہینگر سے نائیٹی کھینچی۔ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی۔ آئینہ میں بھاپ جم گئی تھی۔ تولیہ سے بھاپ صاف کرنے لگی۔ پھر ایک بار اپنے آپ کو ٹٹولا...... اور دوسرے ہی لمحے دھڑاک سے اُس نے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا —

کمرے میں، یعنی وہ جو بھی تھا، دیوار کے اُس طرف منہ کئے کسی سوچ میں گم تھا۔ دروازہ بھڑاک سے کھلتے ہی وہ یکا یک چونکا۔ اُس کی طرف مڑا اور یکا یک ٹھہر گیا —

سلیولیس نائیٹی میں صوفیہ کا جسم کسی کمان کی طرح تن گیا — 'آئی ایم صوفیہ مشتاق احمد۔ ڈاٹر آف حاجی مشتاق احمد۔ عمر پچیس سال۔ پچیس سے زیادہ لوگ تم سے پہلے مجھے دیکھ کر جا چکے ہیں — تمہارا کا نمبر۔

'مجھے اس سے زیادہ مطلب نہیں......' یہ لڑکا تھا۔ مگر آواز میں کپکپی برقرار — جیسے پہلی بار جرم کرنے والوں کے ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں......

'بیٹھئے۔' وہ آہستہ سے بولی۔

لڑکا بیٹھ گیا۔ اُس نے لڑکے کے چہرے پر اپنی نظریں گڑا دیں۔ چہرہ کوئی خاص نہیں۔ گیہواں رنگ۔ ناک تھوڑی موٹی تھی۔ بدن دبلا تھا۔ قد بھی پانچ فٹ سات انچ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ وہ آسمانی جینس اور میرون کلر کی ٹی شرٹ پہنے تھا۔ مینئل سفاری شوز اُس کے پاؤں میں بالکل نہیں جچ رہے تھے — لڑکا اُس سے آنکھیں ملانے کی کوشش میں پہلی ہی پائیدان پر چاروں خانے چت گرا تھا۔

'دیکھو مجھے......' وہ آہستہ سے بولی۔

'دیکھ رہا ہوں......' لڑکے نے اپنی آواز کو مضبوط بنانے کی ناکام سی کوشش کی۔

'نہیں تم دیکھ نہیں رہے ہو، دیکھو مجھے — نائیٹی کیسی لگ رہی ہے......'

اس بار لڑکے نے ایک بار پھر اپنی مضبوطی کا جوا کھیلا تھا — 'اچھی ہے......'

'اچھی نہیں۔ بہت اچھی ہے......' وہ مسکرائی — کیسی لگ رہی ہوں میں......'

لڑکا ایک لمحے کو سہم گیا — وہ دھیرے سے ہنسی...... نظر جھکانے کی ضرورت نہیں ہے...... دیکھنے پر ٹیکس نہیں ہے۔ اور تم تو...... کسی بازار میں نہیں، اچھے گھر میں آئے ہو...... یقین مانو۔ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ اسی لئے تمہاری شرط کے بارے میں سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا — تمہارے لئے یہی بہت ہے کہ تم مرد ہو۔ مرد ہو، اس لئے تمہارے اندر کا غرور بڑھا جا رہا تھا۔ پہلے تم نے جہیز کا سہارا لیا۔ رقم بڑھائی، رقم دگنی سہ گنی کی اور پھر...... یقین مانو، میرے گھر والوں نے سوچا تھا کہ یہ موم کی مورت تو بُرا مان جائے گی۔ مگر میں نے ہی آگے بڑھ کر کہا...... بہت ہو گیا...... آخری تماشہ بھی کر ڈالو......'

باہر رات گر رہی تھی۔ نہیں، رات جم گئی تھی۔ جنوری کی ٹھنڈی لہریں جسم میں تیزاب برپا کررہی تھیں۔ لیکن وہ جیسے ہر طرح کے سرد و گرم سے بے نیاز ہو کر ٹک ٹکی باندھے اُسے دیکھ رہی تھی۔

'بستر پر چلو یا......'

اتنی جلد...... اتنی جلدی کیا ہے......' لڑکے کی آواز گڑبڑائی تو وہ پوری قوت لگا کر چیخ پڑی —

'جلدی ہے۔ تمہیں نہیں۔ لیکن مجھے ہے۔ تم سے زیادہ بھوکی ہوں میں۔ کتنے بھوکے ہو تم — پتہ ہے یہاں آکر، اس کمرے میں آکر مجھ سے نظریں ملاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے تمہیں — بس اتنے بھوکے ہو نہیں۔ باہر...... باہر والوں کی پرواہ مت کرو۔ وہاں ایک بھائی ہے، جب تک میں باہر نہیں نکلوں گی۔ تیر کی طرح زمین میں گڑا، اپنے ناکارہ ہونے کے احساس سے مرتا رہے گا، سہمی سہمی سی ایک بہن ہوگی اور سہمے سہمے سے سوال ہوں گے — نہیں اُن سوالوں کی پرواہ مت کرو — میں کرتی تو اس وقت نائیٹی پہن کر تمہارے سامنے نہیں ہوتی — اُنہیں بس

یہی پڑی تھی کہ میری شادی ہو جائے— پھر تم ملے۔ تم مجھے بستر پر آزما کر، میرے بدن کو منظوری دینے والے تھے۔ سچ، ایک بات بولنا۔ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے یا میرے بدن سے......'

'وقت—' لڑکے نے پھر مضبوط لفظوں کا سہارا لیا— 'وقت بدل رہا ہے۔'

'وقت—' وہ زور سے ہنسی— 'بدل رہا ہے نہیں۔ بدل گیا ہے۔ لیکن تم کیوں کانپ رہے ہو۔ دیدار کرو میرا، دیکھو مجھے۔'

کمرے میں نور کا جھما کا ہوا—

ایک لمحے کو اُس کے ہاتھ پیچھے کی طرف گئے— نائیٹی کے ہک کھلے اور نائیٹی ہوا میں اُڑتی ہوئی بستر پر پڑی تھی—

لڑکا بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اُس کی پلکوں پر جیسے انگارے رکھ دئے گئے تھے— نہیں، انگارے نہیں— برف کی پوری سلی— وہ جیسے پلک جھپکانا بھول گیا تھا— ہوش اُڑ چکے تھے۔ آنکھیں ساکت و جامد تھیں...... ایک دھند تھی، جو روشندان چیرتی ہوئی کمرے میں پھیل گئی تھی۔

'دیکھو مجھے......'

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئینہ کے قریب آ گئی— ''دیکھو مجھے۔ میں نے کہا تھا، نا۔ تم سے زیادہ بھوکی ہوں— پچیس لوگ تم سے پہلے بھی مجھے دیکھے بغیر واپس لوٹ چکے ہیں— سمجھ سکتے ہو۔ پچیس بار تو یونہی مری ہوں— شادی کے ہر احساس کے ساتھ بدن میں انگارے پلتے تھے— جانتے ہونا، فرائیڈ نے کہا تھا، عورت مرد سے زیادہ اپنے بدن میں انگارے رکھتی ہے— اور میں تو بڑی ہوئی تب سے انگارے جمع کرتی رہی تھی...... فلم سے سیریل، ٹی وی، دوست سہیلیوں کی شادی— مجھ سے بے حد کم عمر لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہونے کے قصّے...... ہر بار انگاروں کی تعداد بڑھ جاتی۔ میں ہر بار انگارے چھپا لیتی...... وہ زور سے چیخی— رنڈی نہیں ہوں میں۔ بازار میں نہیں بیٹھی ہوں۔ تم نے سودا نہیں کیا ہے میرا۔ میں نے بھی تسلی کر لی ہے کہ اگر تم میرے شوہر ہوئے تو تمہیں تو پورا پورا مجھے دیکھنا ہی ہے— اور پھر...... میرے گھر والے یوں بھی تھک گئے ہیں۔''

اُس نے بے حد مغرور انداز میں آئینہ میں اپنی ایک جھلک دیکھی۔ جیسے قلوپطرہ نے اپنی ایک جھلک دیکھی ہو اور فاتحانہ انداز میں سر اٹھا کر اپنے ملازموں سے کہا ہو— یہ آئینہ لے جاؤ، اس کا عکس بھی مجھ سے کم تر ہے۔ کوئی ایسا آئینہ خانہ لاؤ، جو میری طرح نظر آ سکے۔

وہ مغرور اداؤں کے ساتھ مڑی۔ بستر سے نائیٹی کو اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے نائیٹی کے 'بدن' میں داخل ہو گئی—

لڑکا ابھی بھی تھر تھر کانپ رہا تھا......

'یہ کوٹھا نہیں تھا اور اتنا طے ہے کہ تم آج تک کسی کوٹھے پر نہیں گئے— دیکھو...... تم کانپ رہے ہو۔ نہیں، ادھر آؤ۔ اُس نے بے جھجک اُس کا ہاتھ پکڑا۔ مرر کے سامنے لے آئی۔ یو نو، تم کیسے لگ رہے ہو۔ جوناتھن سوئفٹ کے گھوڑے— لیکن نہیں۔ تم گھوڑے بھی نہیں ہو...... تم ایک ڈرپوک مرد ہو، جو ایک خوبصورت بدن کو آنکھ اُٹھا کر غور سے دیکھ بھی نہیں سکتا—'

لڑکا بے حس و حرکت تھا۔ ساکت و جامد۔ لاش کی طرح سرد—

صوفیہ مشتاق احمد کی آنکھوں میں برسوں کی ذلت چنگاری بن کر دوڑ گئی— بھوک، نفرت پر غالب آ گئی— 'دیکھتے کیا ہو— میں پوچھتی ہوں۔ اب بھی تم اس کمرے میں کھڑے کیسے ہو۔ تم تو شرط کا بوجھ اٹھانے کے قابل بھی نہیں ہو۔ نامرد کیڑے۔ نہیں۔ وہیں کھڑے رہو اور جانے سے پہلے میری ایک بات اور سن لو۔ میں نے کہا تھا نا تم سے زیادہ بھوکی ہوں میں مگر رنڈی نہیں ہوں۔ ارے، تمہاری جگہ میں ہوتی، میں نے شرط رکھی ہوتی تو کم از کم یہاں آنے کی جرأت کے بعد کم از کم تمہیں چھوا ضرور ہوتا۔ دھیرے سے، تمہارے ہاتھوں کو...... کہ بدن کیسے بولتا ہے— کیسے آگ اُگلتا ہے۔ لیکن تم...... تم تو بند کمرے میں، اپنی ہی شرط کے باوجود، چھونا تو دور اسے دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کر سکے......' ایک لمحے کو جیسے اُس کے اندر برقی لہر دوڑ گئی۔ بے حد نفرت کی آگ میں سلگتے ہوئے صوفیہ احمد نے اُسے زور کا دھکا دیا...... 'گیٹ لاسٹ۔'

لڑکا پہلے ہڑبڑایا۔ پھر سرعت کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک لمحہ کو صوفیہ مشتاق احمد مسکرائی۔ اپنا عکس آئینہ میں دیکھا— نہیں۔ اب اُسے مضبوط ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ باہر کہاسے گر رہے تھے۔ سرد ہوا تیز ہو گئی تھیں۔ کھڑکی کھلی رہ گئی

تھی۔ اُف، اس درمیان وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہوگئی تھی۔ تیز، جسم میں طوفان برپا کرنے والی سردی کو بھی— اُس نے اپنے ہی دانتوں کے کٹکٹانے کی آواز سنی اور اچانک ایک لمحے کو وہ ٹھہر گئی۔ وہی جانی پہچانی دستک— خوفناک آوزاوں کا شور۔ جیسے دیواروں پر کوئی رینگ رہا ہو۔ کیا ویمپائر......؟ ڈراکیولا......؟ باہر یقیناً اس پُر اسرار تماشے کا حال جاننے کے لئے اُس کے گھر والے موجود ہوں گے— اور اُس کا بے چینی سے انتظار بھی کر رہے ہوں گے—

مگر...... یہ دستک......خوفناک آوازیں...... دیواروں پر رینگنے کی آواز— جیسے ہزاروں کی تعداد میں چمگادڑیں اُڑ رہی ہوں۔ پیڑوں پر اُلو بول رہے ہوں۔ شہر خموشاں سے بھیڑیوں کی چیخ سنائی دے رہی ہو— وہی رینگنے کی آواز— برفیلی، تیز ہوا سے کھڑکی کے پٹ ڈول رہے تھے......وہ تیزی سے آگے، کھڑکی کی طرف بڑھی—

گہری دھند کے باوجود شہر خموشاں کا منظر سامنے تھا اور وہاں دیوار پر چھپکلی کی طرح رینگتا ڈراکیولا، اس بار اُسے بے حد کمزور سا لگا— شاید وہ شہر خموشاں میں واپس اپنے 'تابوت' میں لیٹنے جا رہا تھا۔

جبکہ صبح کی سپیدی چھانے میں ابھی کافی دیر تھی—

OOO

(6)

صوفیہ مشتاق احمد کے چہرے کا تاثر جاننا یا اس کی نفسیات پڑھنا میرے لئے آسان نہیں تھا...... ویسے بھی وہ ایک سپاٹ چہرے کے ساتھ میرے سامنے ہوتی تھی۔ یعنی ایک ایسا چہرہ جو ہر طرح کے جذبات سے عاری ہوتا ہے— ایک مصنف کے طور پر مجھے صوفیہ سے ہمدردی تھی۔ ممکن ہے اس سے میں ہمدردی کا اظہار کرتا تو وہ ناراض ہو جاتی۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمدری کی سطح سے بلند ہو کر اس چٹان کی طرح تھی، جس پر کوئی بھی لفظ اپنا اثر نہیں چھوڑتا— مثال کے لئے اگر میں روبرو ہوتا تو شاید وہ مجھے دیکھ کر بھی دیوار یا کھڑکی کی طرف بے نیازی سے دیکھ رہی ہوتی—

'کیا جاننا چاہتے ہیں آپ......' کھڑکی کے باہر درختوں کی قطار کو دیکھنا اسے پسند تھا۔ وہ اشارہ کرتی......اُس طرف سے......وہ آیا......اور اُس تابوت میں سما گیا......اب نہیں آئے گا......، وہ پلٹ کر کہتی......کیا کبھی آپ نے بند تابوت کا تصور کیا ہے؟ کبھی یہ خواہش ہوئی کہ تابوت کے اندر بند ہو کر دیکھا جائے کہ وہاں نیند کیسے آتی ہے......؟ اُف...... میں تصور نہیں کر سکتی......اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس طرح کے تابوت میں صندل کی لکڑیاں استعمال ہوتی ہیں اور— لاشوں کو آرام سے تابوت میں لٹایا جاتا ہے تو......،

میں یقین کے ساتھ صوفیہ کی آنکھوں کی چمک کا تصور کر سکتا ہوں......وہ بے نیازی سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہی ہوتی......

'تابوت میں لٹایا جاتا ہے تو؟'

'ہاں...... میں کہہ رہی تھی۔ صندل کی لکڑیاں اکثر سرد ہوتی ہیں۔ نرم اور ملائم— اندر آرام کرنے والے کو ایسا احساس ہوتا ہے جیسے وہ ایئر کنڈیشنڈ بستر پر لیٹا ہو— اور کیسی خوبصورت پناہ گاہ— آپ کو کچھ سوچنا ہی نہیں ہوتا۔ آپ ہر طرح کے تصور سے آزاد ہوتے ہیں۔ ہر طرح کی گھٹن سے......وہ دیکھیے......،

اس نے اشارہ کیا...... میں لیٹ جاتی ہوں...... آپ تابوت کو بند کر دیں گے...... میں ذرا دیر لطف لینا چاہتی ہوں...... اور ہاں...... ذرا دیر کیوں...... سمجھ رہے ہیں نا آپ......،

اور یہ وہی لمحہ ہوتا جب میں اوہنری کے بھوت کی طرح غائب ہو کر سہا ہوا خود کو اپنے کمرے میں محسوس کرتا۔ ڈرا کیولا، تابوت، صوفیہ، شہر خموشاں اور خوفناک مکالمے...... دیر تک کانوں میں گونجتے رہتے۔

آگے کی کہانی، جو آئندہ صفحات میں آپ پڑھنے جائیں گے، اُس کے لئے یہ مناظر آپ کے کام آئیں گے۔ کیونکہ اس سے قبل مجھے بھی یقین نہیں تھا کہ کیا میری صوفیہ سے دوسری بار بھی ملاقات ہوگی—یا اس حادثہ کے بعد بھی کئی سوالات ایسے تھے، میں جن کا جواب جاننے کا خواہش مند تھا—مثال کے لیے جب وہ اجنبی، جو اپنی شرطوں کے ساتھ (یہاں پر ناجائز شرط کا استعمال کرنے سے قاصر ہوں) صوفیہ کے کمرے میں اُس سے ملنے آیا تھا اور پھر صوفیہ سے ملتے ہی بھاگ کھڑا ہوا، تو بھاگنے کے بعد صوفیہ کے بارے میں اس کے کیا خیالات رہے ہوں گے—؟ اس سے بھی زیادہ ضروری سوالات یہ تھے کہ کیا صوفیہ سے اس کے گھر والوں نے دریافت کرنے کی کوشش کی کہ اندر کمرے میں کیا ہوا—؟ یا وہ اجنبی واپس کیوں گیا......؟ لیکن...... مجھے یقین ہے۔ صوفیہ سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا گیا ہوگا— کیوں کہ کہنا مشکل ہے کہ ان حالات میں کون زیادہ ڈرا ہوا ہوگا—صوفیہ تو بالکل بھی نہیں—پھر اس کی بہن! بہنوئی، بھائی......؟ شاید ان میں سے کوئی بھی صوفیہ سے کسی بھی طرح کا مکالمہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا اور اس کا تجزیہ بھی آسان ہے کہ آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے گفتگو تو ہوئی ہوگی۔ لیکن کوئی بھی صوفیہ سے کمرے کے اندر کا حال جاننے کا حوصلہ نہیں کر سکا ہوگا...... ہم ایک سرد معاشرے کا حصہ ہیں۔ ایک ایسے معاشرے کا جہاں گھر میں لڑکیاں ہیں تو آسیبی کہانیوں کو سنانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی...... خوف خود ہی گھر کا راستہ دیکھ لیتا ہے—

••

یہ بتانا ضروری ہے کہ صوفیہ کے ساتھ یہ غیر معمولی واقعہ یا حادثہ انہی دنوں پیش آیا جب دلی کے جنتر منتر پر شام کے وقت ہزاروں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جیوتی گینگ ریپ کے خلاف موم بتیاں جلائے قاتل کو پھانسی دیے جانے کی مانگ کر رہے تھے۔ یہ حادثہ انہیں دنوں پیش آیا، جب امریکہ کے وہائٹ ہاؤس سے یہ رپورٹ جاری کی گئی کہ دو کروڑ بیس لاکھ عورتوں کو ہوس کا شکار بنایا گیا ہے اور امریکہ کی ہر چار میں سے ایک لڑکی مرد کے غیض وغضب اور ہوس کا شکار بن جاتی ہے۔ اور ان میں زیادہ تر کیس میں لڑکی کے اپنے قریبی رشتہ دار ہی شامل ہوتے ہیں اور انہی دنوں ہمارے پیارے ایگریکلچر سائنٹسٹ البرٹ نپٹو اپنی تحقیق میں مصروف تھے کہ گدھوں کی طرح گوریا کی نسل ختم کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ معصوم سی گوریا جو گھروں میں اور درختوں پر اپنے گھونسلے بنا لیتی تھی۔ جو جھنڈ کی جھنڈ دانہ چگنے کے لیے ہر گھر کو اپنا گھر سمجھ لیتی تھی...... کنکریٹ کے مکانات بننے اور درختوں کے کٹنے کے بعد چڑے چڑیاں کی کہانیاں بھی جیسے وقت کے گمشدہ صفحات میں دفن ہوتی جا رہی ہیں......

ننھی منی سی معصوم گوریا کی یاد کیوں آئی، تو یہ کہانی بھی دلچسپ ہے—اس حادثے کے کچھ دن پہلے اور میں اسے محض اتفاق نہیں سمجھتا—میرے قدم خود بخود صوفیہ کے گھر کی طرف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کالونی کے چھت پر تھی۔ اس کے ہاتھ وورنگ ہائیٹس کے کردار ہیتھ کلف کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ ہیتھ کلف جو نیم شب اپنی محبوبہ کو کھڑکی کے راستہ بلایا کرتا تھا۔ وہ محبوبہ، جواب دنیا میں نہیں تھی۔ میں نے صوفیہ کو دیکھا...... اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے...... وہ چاروں طرف الجھن اور کشمکش کے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اور جیسے کسی کو بلانے کی کوشش کر رہی تھی...... میں بغور اس نئی نئی صوفیہ کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ تھم گئی۔ اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا......

آپ نے دیکھا ہے......؟

’کیا......،

’وہ...... اس نے آسمان کی طرف دیکھا......‘ اس کی آنکھوں میں چمک تھی...... پہلے ہم چھوٹے تھے۔ بڑا سا گھر ہوا کرتا تھا۔ تب گھر میں روٹیوں کے لیے پیکٹ میں آٹا نہیں آتا تھا۔ گیہوں کے بورے آتے تھے بازار سے۔ گیہوں پسارنے کئی بار میں اپنے خدمتگار کے ساتھ خود بھی جایا کرتی تھی۔ اور گھر میں چھت پر اماں گیہوں کے دانے پسار دیا کرتی تھیں......

’پھر......‘

گوریا آتی تھی...... جھنڈ کی جھنڈ...... ایک دانہ اٹھایا— پھر سے اڑ گئی...... پھر ایک دانہ...... میں ہنستی تھی تو اماں پیچھے سے آ کر غصہ کرتی تھیں۔ سارے گیہوں لٹوا دے گی یہ لڑکی۔ گوریا کو ہنکاتی کیوں نہیں......‘ وہ میری طرف پلٹی تھی...... اب گوریا نہیں آتی...... میں کئی دنوں سے لگاتار چھت پر آ کر انتظار کرتی ہوں...... آپ بتا سکتے ہیں...... اب گوریا کیوں نہیں آتی......؟‘

’نہیں۔‘

’یہی تو......‘ وہ ہنس رہی تھی— ’آپ بھی نہیں جانتے۔ میں بھی نہیں جانتی۔ اور گوریاؤں نے آنا بند کر دیا۔ کتنی عجیب بات۔‘

پھر وہ تیز تیز چھت کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی تھی۔

ان سطور کے لکھے جانے تک وہ چہرہ اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر اس چہرے میں کیا تھا، جو مجھے یاد رہ گیا۔ اسی کے بعد وہ حادثہ ہوا تھا۔ اور شاید اس کے بعد ہم نہیں مل سکے—

■■

مصنف کا نوٹ

(صوفیہ کی کہانی کو یہیں چھوڑ کر اب ہم ایک دوسری کہانی کی طرف بڑھتے ہیں— یہ زندگی بھی ایک ہائی وے ہے، جہاں اکثر کہانیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جایا کرتی ہیں......)

دوسرا حصہ

آتش گل

he whole of feminine history has been man-made. Just as in America there is no Negro problem, but rather a white problem; just as anti-Semitism is not a Jewish problem, it is our problem; so the woman problem has always been a man problem.

—Simone de Beauvoir

(1)

جیسا کہ پہلے صفحات سے آپ کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ میں ایک مصنف ہوں۔ لیکن میری مکمل شخصیت کسی جوکر کی طرح ہے—اور مجھے بار بار لگتا ہے جوکر کی طرح ہنستے ہنساتے ہوئے آپ سامنے والے شخص کے اندر اور باہر آرام سے جھانک سکتے ہیں—اسی طرح جیسے دوستوفسکی کا ایڈیٹ شرمایا ہوا شہزادی کے دل تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ مصنف کو بے شرم بننا پڑتا ہے۔ مگر اس کی موجودگی میں احمق اور جوکر دونوں کے کردار بیک وقت شامل رہتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی دونوں کرداروں کو ایک ساتھ انجام دیتا رہتا ہے۔ جنگل، پہاڑ، برف اور گلیشیئر کے پگھلنے سے الگ میں زیادہ تر رومانوی دنیا سے الگ ہی رہتا ہوں اور بیحد چھوٹی چیزیں بلکہ واہیات چیزیں مجھے زیادہ متاثر کر جاتی ہیں۔ مثال کے لئے خوبصورت وادیوں میں کوئی ٹھونٹھ درخت مجھے دکھ جائے تو حیران آنکھوں سے مجھے اس پر مسلط خزاں کا حساب لگانا زیادہ اچھا لگتا ہے اور اسی لیے افسانوں سے زیادہ گھوڑے یا بھری پڑی بستیوں سے زیادہ ویرانی، شہر خموشاں یا وحشت کے بجتے گھنگھروؤں کو سننا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اور شاید اسی لیے اس گھر میں صوفیہ مشتاق ہی میری توجہ کا مرکز بن سکی کہ اس کے کمرے میں اندھیرے جمع تھے۔ یا وہ اپنے احساس کی تپش سے جالوں، چمگادڑوں، چھپکلیوں سے لے کر ڈری سہمی آواز کی آسیبی موسیقی بھی کمرے میں پیدا کر لیا کرتی تھی۔ ایک کہانی کے بعد دوسری کہانی کی تلاش کچھ یوں ہوتی ہے کہ ہم پچھلے کرداروں کو بھول جاتے ہیں—انہی دنوں میری ملاقات نینی تال کے کمال یوسف سے ہوئی تھی—اور اس کہانی میں کئی کہانیاں یکا یک شامل ہوتی چلی گئی تھیں—

جیسے کمال یوسف کا اپنی بیوی اور چھ مہنے کی بیٹی کے ساتھ انڈیا گیٹ پر آنا۔ رات بھر یخ بستہ ہواؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انقلاب اور احتجاج کا حصہ بن جانا، اور میرا گر جانا— تعجب ہے نا، مصنف بھی گرتے ہیں— بلکہ میں تو یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اکثر مصنف بے خیالی میں گر جاتے

ہیں۔ کیوں کہ ان کی آنکھیں راستہ بنانے کی جگہ اپنے ہی خیالوں میں سفر کرتی رہتی ہیں۔ اور وہ سامنے کی رکاوٹ کو نہیں دیکھ پانے کی صورت میں بلاوجہ چوٹ کھا جاتے ہیں۔ لیکن کمال یوسف سے ملنے، میرے گر جانے اور صوفیہ کے اتفاقاً ملنے کی کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا——

یہ انہی دنوں کا تذکرہ ہے جب ہندوستانی سرزمین پر سیاست نے نئی کروٹ لی تھی۔ دلی کا انڈیا گیٹ ہزاروں لاکھوں کی بھیڑ میں انقلابی چوک میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ دبے پاؤں آنے والی انقلاب کی وہ آہٹ تھی، جو شاید اس سے قبل کبھی نہیں دیکھی گئی—— یہ وہی دور تھا جب دنیا کے کئی حصوں میں اس طرح کے مظاہرے عام تھے—— سیاسی چہروں کو یہ فکر دامن گیر تھی عوام کا غصہ جاگ گیا تو تخت و تاج کا کیا ہوگا—— بار بار تباہ و برباد اور آباد ہونے والی دلی آزادی کے بعد محض سوئی ہوئی، خاموش تماشائی بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن ایک حادثے نے دلی والوں کو نہ صرف جگا دیا تھا بلکہ دلی کے ساتھ ہی پورا ہندوستان بھی جاگ گیا تھا اور یہ معاملہ تھا جیوتی گینگ ریپ کا معاملہ—— ایک معصوم سی لڑکی جیوتی، جس کو میڈیا اور چینلس نے ابھیا، نربھیا جیسے ہزاروں نام دے ڈالے تھے۔ ایک کالج کی لڑکی جو صبح سویرے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک خالی بس میں بیٹھی اور بس میں سوار پانچ لوگوں نے بے رحمی کے ساتھ بوائے فرینڈ کی موجودگی میں اسے اپنی ہوس کا شکار بنا لیا اور چلتی بس سے دونوں کو باہر پھینک دیا—— یقینی طور پر ایسے معاملات پہلے بھی سامنے آئے تھے۔ لیکن بے رحمی اور درندگی کی نہ بھولنے والی اس مثال نے دلی کو احتجاج اور انقلاب کا شہر بنا دیا تھا—— جنتر منتر سے لے کر دلی گیٹ اور انڈیا گیٹ تک ہزاروں لاکھوں ہاتھ تھے، جو انقلاب کے سرخ پرچم کے ساتھ ہوا میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ بطور مصنف کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اکیسویں صدی کی نئی دنیا میں قدم رکھنے کے باوجود آج تک جبلت اور درندگی کے واقعات میں کوئی کمی کیوں نہیں آئی تو علم نفسیات کی موٹی موٹی کتابیں بھی ہانپ جاتی ہیں کہ نہ قدیم عہد میں کچھ بدل سکا اور اس انفارمیشن ٹکنالوجی اور سائنسی انقلاب کے عہد میں کچھ بدلنے کی امید ہے—— عورت کو اپنی حکومت کے طور پر محسوس کرنے والا—— اور صدی کے انقلاب کے باوجود برتری کا وہی پیمانہ ہے جو آج بھی عورتوں کو حاشیہ پر دیکھنے کا خواہشمند ہے۔ اور اسی لیے عورت ہونے کے تصور میں، مرد نے کبھی اس کے اڑان کا استقبال نہیں کیا بلکہ ایسی ہر اڑان اس کی مردانگی کو للکارتی رہی۔ سیمون دبوار سے تسلیمہ نسرین تک عورت جب یہ کہتی ہے کہ یہ گھر میرا ہے، یہ فرج میرا، یہ لیپ ٹیپ میرا اور یہ بدن میرا تو مرد کی آنکھیں تن جاتی ہیں۔ مرد نہ عورت کو برانڈ بنتے دیکھ سکتا ہے نہ سماج سے سیاست تک اس کے قد کو پھیلتے اور بڑھتے ہوئے—— یوروپی ممالک کی عورتیں بھی اس معاملے میں وہی ہیں، جو ایک عام ایشیائی عورت کا معاملہ ہے—— وہاں بھی زنا بالجبر اور زور زبردستی کی وارداتیں عام ہیں—— اور یہ وارداتیں ہر سطح پر ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ تہذیب کی اتنی صدیاں گزارنے کے بعد بھی ایک تعلیم یافتہ لڑکی رات کے اندھیرے میں سڑکوں پر سفر نہیں کر سکتی۔ دفتروں میں کام کرتے ہوئے اسے چوکنا رہنا ہوتا ہے۔ وہ گھر میں بھی محفوظ نہیں ہے۔ یہاں باپ سے بھائی تک کے قریبی رشتوں میں بھی سگ زار برادر شغال کی مثال ہی سامنے آتی ہے—— صرف ایک بدن کے قصور میں آزاد ہوتے ہوئے اور ترقی کے مینارے چڑھتی ہوئی عورت بھی زمانۂ قدیم کی داسی محسوس ہوتی ہے، جس کی ڈور روز ازل سے مرد کے پاس ہے اور اسے مرد کے اشاروں پر ہی ناچنا ہوتا ہے——

دسمبر کا مہینہ —— ٹھنڈک اپنے عروج پر تھی—— سرد ہواؤں کے باوجود پرجوش مظاہرہ کرنے والوں کے حوصلوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی—— یہ وہ لوگ تھے جو جیوتی گینگ ریپ کے ظالموں کو سزا دلوانے اور ایوان سیاست کو جگانے آئے تھے۔ سیاسی ہلچل تیز ہو چکی تھی۔ انڈیا گیٹ کے آس پاس کی سڑکیں رین بسیرے میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ سرد لہر، جنگلی پتنگوں کا اڑنا، مچھروں کا حملہ...... لیکن جاگتی آنکھیں امید سے پر کہ اب اس انقلاب کی آہٹ کو کوئی روک نہیں سکتا——

اور اسی مقام پر پہلی بار میں نے کمال یوسف کو دیکھا تھا۔ عمر یہی کوئی تیس بتیس کے آس پاس۔ گورا خوبصورت چہرہ۔ جینس کا پینٹ اور گرم جیکٹ پہنے—— اس نے ایک سفید شال بھی ڈال رکھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی، جس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ بھی تھا۔ لڑکی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ کمال یوسف نے ننھے شیر خوار کو گود میں لے لیا۔ میں نے خود کو تیار کیا، یہی موقع تھا جب میں اس سے گفتگو کر سکتا تھا۔

وہ محبت سے ملا۔ ہاتھ بڑھایا۔ اور اپنائیت سے بولا۔

'کمال یوسف۔'

اس بار چونکنے کی باری میری تھی۔

'مسلمان؟'

'کیوں؟' اس بار اس کے ساتھ والی لڑکی نے چبھتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا— 'مسلمان نہیں ہونا چاہیئے۔؟

'نہیں میرا مطلب ہے......' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا— 'عام طور پر اس طرح کے احتجاج میں مسلمان شامل نہیں ہوتے......'

کمال یوسف نے زور کا قہقہہ لگایا— کس نے کہا کہ مسلمان شامل نہیں ہوتے۔ کس دور میں جی رہے ہیں آپ؟' اس نے آگے بڑھ کر شرارت کے انداز میں میرے چہرے کے سامنے اپنا ہاتھ لا کر چٹکیاں بجائیں— 'تیس کروڑ کی آبادی ہے ہماری صاحب— مسلمان بھی اسی ملک کا حصہ ہیں۔ لیکن آپ انہیں حصہ ماننے پر تیار ہی نہیں'، وہ ہنس رہا تھا۔

'نہیں— میرا مطلب ہے......' میں گڑبڑا گیا تھا۔

کمال یوسف نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ میری بیوی ہے— ناہید ناز۔ ہم نینی تال سے آئے ہیں۔'

'ناہید ناز؟'

اس بار ناہید کا قہقہہ بلند ہوا— ناہید یوسف کہتی یا ناہید کمال، تب ہی آپ تسلیم کرتے کہ ہم میں کوئی رشتہ بھی ہے......'

'نہیں— ' میں مسلسل حملوں سے گھبرا گیا تھا۔

'میری اپنی شناخت ہے۔' ناہید ناز کا چہرہ سخت تھا۔' اس دنیا میں ایک لڑکی اپنی شناخت اور آزادی کے ساتھ کیوں نہیں جی سکتی— ؟ کمال سے شادی کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ میری شناخت کمال کی محتاج ہے۔ میری اپنی آئیڈینٹیٹی ہے، کمال کی اپنی آئیڈینٹی۔ ایک گھر میں دو لوگوں کو اپنی اپنی آئیڈینٹیٹی اور اپنی اپنی پرائیویسی کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق ہونا چاہیئے—

رات کے دو بج گئے تھے۔ اسٹیج سے وقفے کے بعد تقریروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کمال یوسف نے بیگ سے چادر نکال کر زمین پر بچھا دی— ہم چادر پر بیٹھ گئے۔ تھرمس سے چائے نکال کر اس نے ایک کپ میری طرف بڑھایا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ ناہید ناز بچے کو پتنگوں اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمال یوسف نے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرد تھا۔ سپاٹ۔

'مسلمان۔ دوسروں کے منہ سے اکثر یہ نام سنتے ہوئے پریشان ہو جاتا ہوں۔ ہاں بھائی مسلمان ہوں تو کیا ہوا۔ دوسرے مذاہب کے ناموں پر حیرانیاں کیوں نہیں پیدا ہوتیں۔ مسلمان، اس نام کے ساتھ اچانک ہم چودھویں یا پندرہویں صدی میں کیوں پہنچ جاتے ہیں۔ اور مسلمان کہاں نہیں ہیں؟ کرکٹ سے فلم اور سیاست تک۔ اور ہم جس مقصد سے یہاں آئے ہیں، وہ صرف ایک معاملہ نہیں ہے۔ یہ معاملہ کسی مذہب سے وابستہ نہیں ہے۔ یہ اس نفسیاتی خوف کا معاملہ ہے جہاں ایک لڑکی اپنے ہی گھر میں ڈر ڈر کر رہتی ہے اور بالغ ہونے کے بعد بھی مسلسل ڈرتی رہتی ہے۔'

ناہید ناز نے میری طرف دیکھا۔' اس کی آنکھوں میں آگ روشن تھی۔ بچے کو سلاتے ہوئے کہا— 'ابھی یہ صرف چھ مہینے کا ہے۔ دلی آنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ہم نے ایک لمحے کو نہیں سوچا کہ باشا کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ جانتے ہیں کیوں؟'

'نہیں۔'

'لڑکوں کو آزادی دیتے ہوئے آپ کی دنیا لڑکی کی آزادی کے پر کاٹ لیتی ہے۔ کبھی اسے چنری دی جاتی ہے۔ کبھی حجاب۔ کبھی اسے اپنوں سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ لڑکوں کے لیے کوئی شرط نہیں رکھی جاتی۔ لڑکی نہیں ہوئی عذاب ہو گئی— اور آپ ہی کے سماج نے اسے بے رحم نام دے رکھے ہیں۔ فاحشہ، طوائف، رنڈی، داسی، کلنکنی— یہ سارے نام مرد کو کیوں نہیں دیتے— ؟ سب سے بڑا دلال اور بھڑوا تو مرد ہے — فاحشہ، طوائف، کلنکنی یہ سارے نام مرد پر فٹ بیٹھتے ہیں۔ کیوں ساری زندگی، سہمی سہمی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہے ہمیں؟ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی وہ اپنی مرضی کی زندگی نہیں جی سکتی۔ اسے ایک مرد کا غلام بننا ہوتا۔ اس کے بچوں کو پالنا ہوتا ہے۔ مرد کیوں نہیں پالتا بچوں کو؟ کھانا کیوں نہیں بناتا؟ بیوی کو چائے کیوں نہیں پیش کرتا؟ گھر کیوں نہیں سنبھالتا۔ ہم آواز اٹھائیں تو آپ مذہب، شریعت اور موٹی موٹی آسمانی

کتابیں لے کر آجاتے ہیں۔ان کتابوں میں مرد کو کیوں نہیں بتایا جاتا کہ وہ عورت کے ساتھ خوش رہے۔عورت کو ہی بتایا جاتا ہے کہ شوہر کی خوشی میں ہی اس کی تقدیر کی تعویذ پڑی ہے۔کمال سے شادی کی تو تقدیر کی یہ تعویذ اتار پھینکی۔کیوں کمال؟'

کمال یوسف نے زور کا قہقہہ لگایا— شادی سے پہلے ملنا ہوا تو سوچتا تھا کہ ایسی پاگل اور عجیب وغریب لڑکی شاید دنیا میں نہ ہوگی۔ملاقاتوں کا سلسلہ طویل ہوا اور بات شادی تک پہنچی تو ناہید نے صاف طور پر کہہ دیا۔۸ بجے اٹھتی ہوں۔بیڈ ٹی مجھے تم دوگے۔ناشتہ میں بنالوں گی۔شادی کے بعد بھی ہم دو لوگ ہوں گے جن کی اپنی اپنی آزاد دنیائیں ہوں گی۔میں ٹھہرا، مذہبی گھرانے میں آنکھیں کھولنے والا۔ایسا گھرانا جہاں آج بھی بہشتی زیور کی حکومت چلتی ہے۔'وہ ہنس رہا تھا۔

مجھے یکایک احساس ہوا، کئی تصویریں ایک دوسرے میں منعکس ہونے لگی ہیں۔ایک چہرہ سرد کافن میں آرام کا تصور کرنے والی صوفیہ کا تھا، دوسرا چہرہ جیوتی کا اور تیسرا چہرہ ناہید ناز کا۔یہ سارے چہرے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ان چہروں میں کہیں صدیوں کی آگ روشن تھی تو کہیں آگ سرد پڑ گئی تھی......اور ان سے الگ بھی ایک چہرہ تھا۔کمال یوسف کا چہرہ۔مجھے یقین ہے خدا کی بستی میں عورتوں کو عزت دینے والے، آزادی دینے والے ایسے مردوں کا مشینی طور پر بننا شروع ہو چکا ہے۔تو کیا یہ صدیوں سے سفر کرتی ہوئی عورت کے احتجاج کی ہی شکل ہے کہ نئے سماج کی مشینوں نے نئے اذہان کے مردوں کو اگلنا شروع کر دیا ہے۔؟ یہ سمجھوتا ہے، وقت کی مانگ یا آنے والی تبدیلیاں ہیں—؟اس سے بھی بڑا سوال تھا کہ مرد اپنی خصلت کو کب تک پوشیدہ رکھ سکتا ہے؟اور اس سے بھی بڑا سوال تھا کہ اگر ایک دن کمال یوسف بھی وہی عام سا مرد ثابت ہوا تو؟ میں نے اس طرف توجہ دلائی تو ناہید ناز زور زور سے ہنس پڑی۔

'آپ کیا سمجھتے ہیں، کیا ایسی صورت میں، میں ایک منٹ بھی ان کے ساتھ رہ سکتی ہوں؟ بالکل بھی نہیں۔میں دھکے مار کر اسے گھر سے باہر نکال دوں گی۔دھکے مار کر— میں اس بات پر غور نہیں کروں گی کہ ہمارا کتنا پرانا ساتھ تھا۔اور اس بات کو بھول جائیے کہ میری آنکھوں میں ایک سکنڈ کے لئے بھی آنسو کا قطرہ چمکے گا— دراصل ہوتا یہ ہے کہ ہمیں شادی کے بعد مرد کو سونپنے والا معاشرہ ایک بیمار معاشرہ ہوتا ہے۔جو ہم سے کہتا ہے کہ دیکھو، یہ تمہارا مجازی خدا ہے اور اس کی خوشی میں ہی تمہاری زندگی کا سفر پوشیدہ ہے۔بڑی ہوتے ہی میں نے اس دقیانوسی کتاب کے چیتھڑے بکھیر دیئے۔مرد کو سمجھنا ہوگا کہ اُس کی خوشی ہماری ذات میں پوشیدہ ہے۔'

کمال یوسف آہستہ آہستہ مسکرا رہا تھا— جھینگر چیخ رہے تھے۔پتنگوں اور مچھروں کی یلغار بار بار پریشان کر رہی تھی۔اور یہاں میرے سامنے دو چہرے تھے۔صوفیہ جسے ایک ماحول نے سرد، بجھی ہوئی راکھ میں تبدیل کر دیا تھا اور اسی ماحول سے نکلی ہوئی ناہید ناز، جسے خود پر بھروسہ تھا۔اپنی ذات کے سہارے جینے پر یقین رکھنے والی اور مرد کی ہر طرح کی محکومیت سے انکار کرنے والی۔

فلیش چمک رہے تھے۔چینلس اور میڈیا کے لوگ بھی کافی تعداد میں تھے۔آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔مگر زیادہ تر آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔آزادی کے بعد کے تھکے ہوئے لوگوں میں اس انقلاب کو لیکر امید کی ایک موہوم سی کرن پیدا ہوئی تھی۔مجھے اس بات سے زیادہ غرض نہیں تھی کہ یہ انقلاب بھی ہزاروں انقلابوں کی طرح پھُس ثابت ہوتا ہے یا اس سے اچھے نتائج کی امید کی جاسکتی ہے— میرے لیے اس وقت اتنا کافی تھا کہ جمہوریت میں مرتے ہوئے لوگوں کے لیے ایک معصوم سی لڑکی کا قتل ایک بڑے انقلاب کا گواہ بن گیا تھا۔

کندھے پر جھولتے ہوئے بیگ سے کاغذ اور قلم نکال کر کچھ دیر ادھر اُدھر کے نوٹس لیتا رہا۔اس درمیان کمال یوسف اسٹیج کی طرف نظریں کئے بغور تقریر سننے میں محو تھا۔ناہید ناز کے ملائم ہاتھ سوئے ہوئے بچے کو تھپکیاں دے رہے تھے۔میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ناہید ناز کے ساتھ بھی ہوا ہوگا جس نے نینی تال سے دلی آنے میں مدد کی ہوگی— میں پھر اسی خیال کے رتھ پر سوار تھا کہ کتنی عجیب بات، ایک مہذب دنیا میں آج بھی معصوم لڑکیاں، بچیاں، عورتیں اپنی آزادی اور حق کا مطالبہ کر رہی ہیں اور ساری دنیا سوئی ہوئی ہے۔اپنے ہی گھر میں خوف کا پیچھا کرتے ہوئے، بڑے ہونے کا خوف، جوان ہونے کا خوف، شادی نہ ہونے کا خوف، شادی کے بعد کا خوف......طلاق کا خوف...... زندگی کے سمندر میں صرف خوف کے بھنور تھے اور الجھی ہوئی تھیں ہزاروں معصوم زندگیاں— مریخ پر راکٹ بھیجے جا رہے تھے۔سائبریا میں درخت اگانے کی مہم چل رہی تھی۔انسانوں جیسے انسان پیدا کئے جا رہے تھے۔موت پر فتح پائی جا رہی تھی اور سائنس کے ہزاروں حیرت انگیز کارناموں کے باوجود امریکہ سے ہندوستان تک خوفزدہ تھی تو عورت— پریشان تھی تو عورت— چار برس کی معصوم بچی بھی ہوس کا شکار ہو رہی تھی

اور ۹۰ سال کی بزرگ خاتون بھی مرد کی درندگی سے محفوظ نہیں تھی۔ انتہائی بدصورت اور ناکارہ لڑکوں کو بھی شادی کے بارے میں یا بڑھتی عمر کے بارے میں سوچنا نہیں پڑتا تھا اور حسین لڑکیوں کی شادیاں بھی معاشرے میں عذاب بن کر رہ گئی تھیں۔

ایک دوزخ سے نکل کر دوسری دوزخ میں داخل ہونے کا راستہ کھل جاتا تھا۔ میں نے دیکھا، ناہید ناز بغور میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی اور یہی لمحہ تھا جب میں نے اس سے دریافت کیا اور میں نے نرم نرم لہجے میں دریافت کیا کہ کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ کیا اس کی زندگی میں بھی آیا ہے......؟ وہ جیسے میرے اسی سوال کے انتظار میں تھی۔ چھوٹتے ہی اس نے دوسرا سوال میری طرف داغ دیا۔

'کیا دنیا میں کوئی لڑکی ان حادثوں سے محفوظ بھی ہے؟ کسی ایک لڑکی کا نام بتا دیجئے—' وہ ہنس رہی تھی— جب سے دنیا بنی ہے۔ ایسی کوئی لڑکی بنی ہی نہیں۔ لڑکیاں پیدا ہوتے ہی شہد کی طرح ایک جسم لے کر آ جاتی ہیں— اور سب سے پہلے اپنے ہی گھر میں اپنے میٹھے جسم پر چبھتی اور ڈستی ہوئی آنکھوں سے خوفزدہ ہو جاتی ہیں— جو عورت اس سچ سے انکار کرتی ہے وہ جھوٹ بولتی ہے۔' اس کا لہجہ تلخ تھا— 'مرد اپنی فطرت بدل ہی نہیں سکتا۔'

'اور آپ کے شوہر؟'

'وہ شوہر نہیں ہے۔ خدا کے لیے انہیں شوہر نہ کہیے...... وہ میری بیوی ہیں......' ناہید نے کھلکھلا کر جواب دیا۔ اور اب میری حراست میں ہیں۔ کیوں کمال......'

کمال یوسف نے قہقہہ لگایا۔

ناہید کے چہرے پر پھر سے شکن نمودار ہوئی تھی— 'لڑکے اپنے گھروں میں کیوں نہیں ڈرتے۔ پھر تو لڑکوں کو آزادی ملتی ہی چلی جاتی ہے۔ ناجائز آزادی۔ اور لڑکی۔ آپ اور آپ کا مذہب صرف ان پر ہی کیوں بندش اور پہرے بیٹھا تا ہے، اور مردوں کو بے لگام کر دیتا ہے۔'

میں نے پہلی بار ناہید ناز کے چہرے کا جائزہ لیا۔ ایک سانولا معصوم چہرہ۔ عمر یہی کوئی ستائس اٹھائیس کے قریب۔ قد پانچ فٹ دو انچ سے کچھ زیادہ۔ ستواں بدن۔ چہرے پر معصومیت کے ساتھ ایک کشش بھی تھی۔ کیا یہی وہ کشش تھی کہ مرد کے لیے عورت کا چہرہ اور وجود دیکھتے ہی دیکھتے ایک جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے—؟

ناہید کی آنکھیں نیلے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس نے پلٹ کر پھر میری طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی— 'وہ میرے باپ بھی ہو سکتے ہیں، بھائی بھی۔ اور یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہاں بھی دوسری لڑکیوں یا عورتوں کے لیے ایک چور مرد ضرور رہتا ہے— میرا احتجاج اسی بات پر ہے کہ وہ چور مرد آتا ہی کیوں ہے— عورت کا وجود ہی جسم کیوں بنتا ہے، مرد کا وجود جسم کیوں نہیں بنتا— آپ نے ابھی سوال کیا، کیا کوئی ایسا حادثہ میرے ساتھ بھی ہوا ہے...... ہاں ہوا ہے— نہ ہوا ہوتا تب بھی میں اس احتجاج میں ضرور شامل ہوتی......

کمال یوسف نے سگریٹ جلالی تھی۔ اب وہ دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔

'میں جس دفتر میں کام کرتی ہوں، وہاں کا حادثہ ہے یہ۔ شام کے سات بج گئے تھے۔ عام طور پر میں پانچ بجے دفتر چھوڑ دیتی تھی۔ باس نے مجھے روک رکھا تھا۔ آفس کے زیادہ تر اسٹاف جا چکے تھے۔ مگر آٹھ دس لوگ ابھی بھی اپنی اپنی سیٹوں پر موجود تھے۔ سات بجے باس نے مجھے طلب کیا۔ میں کمرے میں گئی تو پتہ نہیں کیا سوچ کر اُس نے دروازہ بند کیا— میں نے سمجھا کوئی خاص بات ہوگی۔ کوئی ایسی راز کی بات ہوگی جو باس اوروں سے خفیہ رکھنا چاہتا ہے۔ مجھے اس وقت تک اس کی نیت کا اندازہ نہیں تھا۔ میں مسکرا رہی تھی۔

'دروازہ بند کیوں کیا؟'

وہ مسکراتا ہوا سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا— 'آپ نہیں جانتیں کہ دروازہ کیوں بند کرتے ہیں......؟'

'نہیں۔' میں نے پھر مسکرانے کی کوشش کی— 'مجھے سچ مچ نہیں پتہ۔'

'اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا— 'اب آپ اتنی بھولی بھی نہیں کہ آپ کو بتانے کی ضرورت ہو......'

میرا ماتھا ٹھنکا۔ پہلی بار شدت سے مجھے خوف کا احساس ہوا۔ میں نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ پتہ نہیں کیا کیا اول فول بول رہا تھا...... میری پروموشن...... ترقی...... سیلری میں اضافہ...... میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اور اچانک اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کو

تھام لیا۔ یہ ایک غیر متوقع حملہ تھا اور میں اس کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔ میں نے اس کو دھکا دینے کی کوشش کی تو اس نے مجھے صوفے پر گرا دیا...... لیکن اپنا توازن کھو بیٹھا اور میرے لیے یہی لمحہ زندگی ثابت ہوا۔ خود کو بحال کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ میز پر کپ میں گرم چائے پڑی تھی۔ اور اس سے قبل کہ وہ اٹھ کر دوبارہ مجھ سے دست درازی کی کوشش کرتا میں نے گرم کھولتی ہوئی چائے اس کے چہرے پر اچھال دی.....'

ناہید ناز کے چہرے پر سلوٹیں نمایاں ہوگئی تھیں......

میں سانس روکے ناہید ناز کی کہانی سن رہا تھا۔

پھر کیا ہوا؟ پھر تو آپ دروازہ کھول کر بدحواسی کے عالم میں گھر روانہ ہوگئی ہوں گی؟'

'نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں کیوں گھر بھاگتی! میں نے کیا جرم کیا تھا۔ جرم اس بدذات نے کیا تھا۔ کھولتی ہوئی چائے نے اس کے چہرے کو جھلسا دیا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں تھام کر زور سے چلایا...... میں نے دروازہ کھول دیا۔ آفس میں موجود اسٹاف کے لوگ بھاگتے ہوئے کمرے میں آئے تو میں پولس کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

وہ صوفے پر چلاتا ہوا تڑپ رہا تھا۔ پانی......اُس کی آنکھیں گرم کھولتی ہوئی چائے سے جھلس گئی تھیں۔ میں خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسٹاف کو سمجھا دیا کہ اس بدذات کے ارادے برے تھے اور میں نے اس کی سزا دے دی.....'

سردی بڑھ گئی تھی۔ کمال یوسف کی سگریٹ بجھ چکی تھی۔ ہاتھوں کا تکیہ بنا کر چادر پر اس نے اپنے پاؤں پھیلا دیئے تھے۔ ناہید ناز کسی گہری سوچ میں گم ہوگئی تھی۔

ایک لمحہ کے لیے انقلاب سو گیا تھا اور کئی سہمے ہوئے چہرے آنکھوں کی اسکرین پر جاگ گئے تھے۔

(2)

اگلی صبح انقلاب نے پھر دستک دی تھی۔

انڈیا گیٹ کے چہار اطراف انسانی ہجوم نظر آ رہا تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں نعرے لگاتے ہوئے حکومت اور انتظامیہ کی دھجیاں بکھیر رہے تھے۔ کمال یوسف ناہید سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔

'اس موقع پر وحیدہ کو بھی لانا چاہئے تھا۔'

'وحیدہ کبھی نہیں آتی۔'

'کیوں۔'

'ایک تو اسے بھیڑ بھاڑ سے نفرت ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے.....' ناہید نے مسکرا کر کہا— 'یہاں آ کر بھی وہ تتلیاں تلاش کرتی.....'

مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ کل شب بھی گفتگو میں دوبار خاموشی سے وحیدہ کا نام آیا اور آج بھی ناہید نے بہت پیار سے اس کے نام کا ذکر کیا تھا۔ ممکن ہے وحیدہ ان کی کوئی پڑوسی رہی ہو۔ مجھے اس نام میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی مگر ناہید کے آخری جملوں نے مجھے چونکا دیا تھا— یہاں آ کر بھی وہ تتلیاں تلاش کرتی— ممکن ہے چھوٹی سی بچی ہو یا ممکن ہے کوئی الہڑ دوشیزہ جس نے ابھی ابھی شباب کی منزلوں میں قدم رکھا ہو اور اس کے قدم رنگ برنگے پروں والی تتلیوں کے تعاقب میں دوڑ رہے ہوں— لیکن وحیدہ کا نام آتے ہی کمال یوسف کے ہونٹوں سے

بھی ایک مسکراہٹ نمودار ہو جاتی تھی۔

ناہید نے شک کی آنکھوں سے میری طرف دیکھا— 'کیا لگتا ہے آپ کو—؟ یہ......اس انقلاب کا کوئی نتیجہ نکلے گا—؟ یا یہ انقلاب بھی دوسرے ہنگاموں کی طرح پھُس ہو جائے گا۔' اس کی آواز میں غصہ کی جھلک تھی— کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جہاں عورت محفوظ ہو۔ کھیل کی دنیا سے فلم انڈسٹری، کارپوریٹ انڈسٹری، آشرم، سیاست......اسکول سے کالج اور گھر کی چہار دیواری تک۔ عورت نہ ہوئی رس ملائی ہوگئی۔ زبان نکالے ہوا مرد ہوس بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے یہ زبان ہی کاٹ لوں......'

کمال یوسف نے پلٹ کر میری طرف دیکھا— 'اکیسویں صدی میں بھی عورت ترقی سے الگ اپنے تحفظ کی جنگ لڑ رہی ہے۔ کتنا بڑا المیہ ہے۔'

ناہید نے بات آگے بڑھائی— عورت ہونے کا مطلب ہے غلامی، دوزخ اور خوف کی زندگی۔ ساری زندگی خوف کا ساتھ۔ ملالہ کو دیکھئے......اسکول میں پڑھنے والی معصوم بچی پر اسلحے تانتے ہوئے طالبانی نامرد نہیں گھبراتے— اب اس پر الزامات کی بارش کر رہے ہیں۔ افغانستان میں دیکھئے۔ عورت یا تو گھر سے باہر نکل نہیں سکتی۔ نکلتی ہے تو لباس کی قید میں اس کے ہاتھوں کے انگلیوں کا بھی باہر نکلنا ممنوع ہے۔ کانگو جہاں عورتوں کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ پاکستان جہاں عورتیں مردوں کی برابری کر ہی نہیں سکتیں۔ اور ہمارے یہاں۔ دنیا کا چوتھا خطرناک ملک جہاں ہر وقفہ بعد ایک عورت ہوس کا شکار بن رہی ہوتی ہے۔ کمال پوچھتے ہیں کہ ناہید اتنا غصہ کیوں ہے تمہارے پاس— غصہ کیوں نہ آئے۔ یہاں تو بیٹیوں کو جسم کے اندر ہی مار دیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کی اسمگلنگ اور تجارت ہوتی ہے۔ اور بڑی تعداد میں نابالغ بچیوں کو جسم فروشی کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ رسم ورواج اور مذہب کے نام پر بار بار ان کا شکار کیا جاتا ہے۔'

تیز تیز ہنگامے کی آواز سن کر ہم چونک گئے تھے۔ میں نے دیکھا پولس بے رحمی سے بھیڑ کو منتشر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمال یوسف کے ساتھ حیرانی بھری آنکھوں سے ناہید نے بھی یہ منظر دیکھا اور آگے بڑھنے کی کوشش کی تو کمال نے ہاتھ تھام لیا—

'تمہاری گود میں بچہ ہے۔'

'پھر......بچہ تھام لو......'

'نہیں۔ اس کے باوجود تم نہیں جاؤ گی۔ پولس پتھراؤ بھی کر سکتی ہے۔'

دو چار عورتیں پولس سے الجھنے کے لیے آگے بڑھیں تو پولس کے آدمی نے ایک عورت کو دھکا دیا۔ دوسرا پولس والا ایک عورت کو بے رحمی سے کھینچتا ہوا دور لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کمال نے مضبوطی سے ناہید کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور ناہید غصے سے غرا رہی تھی۔

'خود کیوں نہیں جاتے پولس سے الجھنے کے لیے۔ چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ مجھے بھی نہیں جانے دیتے۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی، اس عورت کو زمین پر گھسیٹنے اور دھکا دینے کی۔ کیوں چھونے کی کوشش کی اس نے ایک عورت کو۔ یہ سالے ذائقہ لیتے ہیں۔ بہانہ کوئی بھی ہو، عورت کو چھُ کرنے کی کوشش کرتے ہیں سالے......'

'ناہید......' کمال اُسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

'یہاں اتنی بھیڑ ہے۔ یہ لوگ مار کیوں نہیں دیتے ان پولس والے بھیڑیوں کو— مردوں کو— نوچتے رہو عورتوں کو۔ ہوس کا شکار بناتے رہو۔ بسوں سے باہر پھینکتے رہو۔ گھر سے باہر نکلنے پر پابندیاں لگا دو۔ گدھ کی طرح للچائی نظروں سے گھورتے رہو— اور ہم خاموش رہیں۔ کیوں خاموش رہیں ہم......'

ناہید نے زور سے کمال کو دھکا دیتے ہوئے ہاتھ چھڑا لیا۔ زمین پر پڑا ہوا پتھر غصہ میں اس نے پولس والوں کی طرف اچھال دیا— مگر یہ تو اچھا ہوا کہ اس کی یہ حرکت کسی نے دیکھی نہیں— پولس والوں کے ارد گرد بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی......اسٹیج سے امن قائم رکھیں کا اعلان ہو رہا تھا۔ اس درمیان صرف اتنا ہوا کہ کمال یوسف ناہید کا ہاتھ تھامے اسے کنارے لے آیا تھا۔ یہ جگہ اسٹیج کے قریب تھی۔ اس چھوٹی سی کچھ گھنٹوں کی ملاقات میں، میں نے ناہید کا خوفناک چہرہ بھی دیکھ لیا تھا۔ میرے لیے یہ سوچنا مشکل نہیں تھا کہ کمال یوسف آخر کس طرح ناہید جیسی باغی عورت کو قابو میں

رکھنے کی کوشش کرتا ہوگا—؟ کیونکہ ناہید کا وجود ایک ایسی سونامی کی طرح تھا، جسے روکنا آسان نہیں تھا۔ میں اچانک چونک گیا تھا۔ ناہید کمال یوسف کا ہاتھ تھامے ہوئے پوچھ رہی تھی......

'تم کیا سمجھتے ہو، وحیدہ آتی تو اس کے لیے یہ سب کچھ دیکھ پانا آسان ہوتا؟'

'پتہ نہیں۔ لیکن اسے آنا چاہئے تھا۔ یہ انقلاب اس بات کی علامت ہے کہ ایک اکیلی لڑکی کو تنہا زندگی کا سفر کرنے کا حق کیوں نہیں ہے؟ تنہا چلنے کا' تنہا باہر نکلنے کا...... کسی بھی گھڑی...... کسی بھی لمحہ......'

'اب وہ اتنی تنہا بھی نہیں ہے۔' ناہید نے بھنویں سکوڑتے ہوئے کہا...... ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ زندگی جینا سیکھ رہی ہے۔'

'کچھ بھی کہو۔ لیکن وہ ہے ایک پراسرار لڑکی۔ وہ ایسے چلتی ہے جیسے اس کے ساتھ ساتھ ہزاروں پرچھائیاں چل رہی ہوں۔'

'پرچھائیاں نہیں۔ آسیب'— ناہید کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

'آسیب؟' میں اس بار زور سے چونکا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا، جب مجھے وحیدہ کے بارے میں جاننے کا تجسس پیدا ہوا تھا۔ کون ہے آخر یہ لڑکی، جس کے بارے میں اتنی ساری کہانیاں بنائی جارہی ہیں۔ جسے یہاں کے ہنگامی ماحول میں بھی بار بار یاد کیا جارہا ہے۔ آخر کچھ تو اس لڑکی میں خاص ہوگا۔

'کون ہے وحیدہ؟'

'جان کر کیا کریں گے آپ؟' ناہید ناز نے ناگواری سے پوچھا۔

'بس یونہی۔'

کمال نے قہقہہ لگایا— 'وہ قلوپطرہ کی طرح تو حسین نہیں۔ مگر مونالزا کی طرح گہری اور پراسرار ضرور ہے— ایک مستقل خوف ہے، جو اس کے چہرے پر نظر آتا ہے۔'

وہ شاید اس سے آگے بتانے کی کوشش کرتا لیکن تب تک منچ سے تقریر بھی شروع ہوچکی تھی اور وہ ناہید کے ہاتھوں کو تھام کر منچ کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ ابھی کمال یوسف اور ناہید مجھ سے اس قدر واقف نہیں ہوئے کہ مجھے کچھ زیادہ بتا پانے کی حالت میں ہوں۔ بلکہ میری طرف سے معاملہ یہ تھا کہ میں ان کے گلے پڑنے کی مسلسل کوشش کررہا تھا۔ اور اس درمیان نہ میں جوکر تھا اور نہ ہی دوستوفسکی کا ایڈیٹ۔ لیکن دلی گینگ ریپ کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ یہاں آنے والا ہر شخص خود کو ایک دوسرے سے وابستہ محسوس کررہا تھا۔ جیسے یہ ہجوم نہ ہو کر سب ایک خاندان ہوں اور حق وانصاف کے لیے بہری حکومت کے دروازے کھٹکھٹائے جارہے ہوں۔ میں نے ایسی ہزاروں تحریکوں اور انقلاب کو بے اثر ہوتے دیکھا تھا۔ اس لیے اس انقلاب سے بھی مجھے کوئی زیادہ امید نہ تھی—

اس وقت مجھے صوفیہ، وحیدہ اور ناہید میں کوئی زیادہ فرق نظر نہیں آرہا تھا۔ ناہید کی بغاوت بہت حد تک اضطراری کیفیت کی غماز تھی۔ اور مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ایک نامعلوم خوف اس کے وجود میں بھی سانپ کی طرح کنڈلی مار کر اندر تک بیٹھا ہوا ہے۔ کیا واقعی ایسا تھا؟ یا میں علم نفسیات کے خام مطالعہ سے اس کے اندرون میں جھانکنے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔

میں نے دیکھا، وہ دونوں دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ میں جگہ بناتا ہوا تقریباً ان دونوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔

کمال کہہ رہا تھا۔ اب ہمیں واپس لوٹنا چاہئے۔

'کیوں؟'

'کئی روز ہوگئے۔ ہماری وجہ سے بچہ بیمار ہوسکتا ہے،

'ایک پوری نسل بیماری ہوچکی ہے۔' ناہید نے تیور سے کہا۔

'لیکن یہ ہمارا بچہ ہے۔'

'وہ بھی کسی کی بچی تھی۔'

'میں نے یہ تو نہیں کہا۔'

’تم نے یہی کہا۔تم مردوں میں ہمارے معاملے میں ذرا بھی صبر نہیں——وہ غصہ میں تھی——
’پہلی بار ایک بڑی آواز ہماری حمایت میں اٹھی ہے تو تم اپنے قدم پیچھے کھینچ رہے ہو۔‘
’میں قدم پیچھے نہیں کھینچ رہا۔میں نے بچے کی صحت کو لیکر......‘
’بچے کی صحت ٹھیک ہے۔اور میں اس کی ماں ہوں۔تم سے زیادہ فکر ہے مجھے اس کی۔‘
جہنم میں جاؤ۔اس بار کمال یوسف غصے سے بولا اور دوسری طرف منہ کر کے سگریٹ کے کش لینے لگا۔

اس درمیان میں نے پہلی بار کمال یوسف کے چہرے پر جھنجھلاہٹ دیکھی تھی اور مجھے اس بات کا احساس تھا کہ نارمل سے نارمل انسان بھی مسلسل ایسے واقعات کا شکار ہو کر ذہنی الجھنوں میں گرفتار ہو سکتا ہے۔میرا دوسرا سوال تھا کہ اس وقت اس ماحول میں کمال یوسف پر کیا گزر رہی ہوگی——اور اسی سوال سے وابستہ ایک اور سوال تھا کہ ازدواجی زندگی میں محبتوں کو نبھاتے ہوئے یہ توازن کب تک قائم رکھا جا سکتا ہے——؟ یہ پتہ تو چل ہی گیا تھا کہ دونوں میں لو میرج ہوئی تھی۔عام طور پر تعلیم یافتہ ترقی پسند لڑکے ایام شباب میں ایسی بولڈ لڑکیوں کو پسند تو کرتے ہیں——پھر شادی بھی ہو جاتی ہے۔لیکن وقت کے ساتھ لڑکیوں کا یہ بولڈنیس ازدواجی زندگی کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے یا تو کھو جاتا ہے یا پھر شوہر کے نظریہ سے آہستہ آہستہ محبوب میں چور دروازے سے ایک ایسے مرد کی واپسی ہو جاتی ہے، جو اس بولڈنیس کو پسند نہیں کرتا۔اور اس کے بعد فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔میری فکر یہ تھی کہ کمال یوسف توازن کے ساتھ اس رشتہ کو کب تک نبھا پاتا ہے؟ یا کوئی جھنجھلاہٹ بھرا لمحہ اسے ہمیشہ کے لئے ناہید ناز سے دور لے جائے گا۔

پھر ناہید ناز کا کیا ہوگا؟

کیا کوئی دوسرا کمال یوسف اسے مل سکے گا؟ یا اگر فرض کر لیتے ہیں، ایسا ہوتا ہے تو ناہید کی بغاوت یا ناہید کے اندر کی باغی عورت پھر سے کسی کمال یوسف کو اپنی زندگی میں جگہ دے گی۔؟‘

یہ سوال ایسے تھے جن کا ابھی کوئی جواب میرے پاس موجود نہیں تھا۔ممکن ہے کمال یوسف اپنے مزاج کے مطابق اس رشتہ کو نبھانے میں کامیاب ہو جائے۔مگر مجھے یہ دشوار نظر آ رہا ہے——یہ میلان عام مردوں کا نہیں ہے اور ایسی عورتوں سے نباہ کرنا شاید آسان بھی نہیں ہوتا——ایسے ہزاروں سوال تھے لیکن ابھی مجھے وقت کا انتظار کرنا تھا——

’ایسی عورتوں سے نباہ کرنا آسان نہیں ہوتا،‘ کا سیدھا سا جواب ہے کہ عام طور پر مرد اساس معاشرے نے مردانگی کے ساتھ سختیاں، غیض و غضب، ظلم و ستم اور عیش و نشاط کی ساری کہانیاں خود تک محدود رکھی ہیں اور صدیوں کے فسانے میں مردوں نے ان خوبیوں سے خود کو جوڑ کر رکھا ہے۔اس لیے عورت کی ذرا سی بغاوت یا ’مردانگی‘ کے مظاہرے کو برداشت کرنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔’عورت پن‘ ایک کمزور سا احساس ہے اور ’مردانگی‘ مرد کی عیش پسند طبیعت اور فطرتاً سختی کی طرف اشارہ ہے اور آمر مرد بھی یہ قبول کرتا ہے کہ عورت میں یہ سختیاں نہیں ہونی چاہئیں۔اس کے برخلاف اگر عورت میں بغاوت کے تھوڑے بھی عنصر چھپے رہ جاتے ہیں تو مرد ہر طور اُسے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔صدیوں میں یہ روایت ٹوٹ ضرور رہی ہے مگر عورت آج بھی گھٹن اور بندش کا شکار ہے اور اس سے ذرا بھی باہر نکلنا چاہتی ہے تو یا تو صوفیہ ہو جاتی ہے یا پھر ناہید ناز——میں صوفیہ کو دیکھ چکا تھا اور اب مجھے اس کہانی کے لیے، میں معافی چاہوں گا۔مگر بطور ناول نگار مجھے بھی اس دلچسپ کہانی کے لیے آگے کے واقعات پر نظر رکھنی تھی۔اور جیسا کہ میں نے آغاز میں بتایا، صوفیہ کے اپنے کمرے میں واپس لوٹنے، دلی گینگ ریپ، ناہید ناز اور کمال یوسف سے ملاقات اور میرے گھٹنے میں چوٹ لگنے تک، یہ واقعات کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کو جوڑ رہے تھے۔اور مجھے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ یہ ساری کڑیاں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر وقت کے صفحے پر ایک انوکھی اور دلچسپ کہانی کو تحریر کرنے جا رہی ہیں۔

اس درمیان صرف اتنا ہوا تھا کہ میں ناہید ناز اور کمال یوسف کے کافی قریب آ چکا تھا۔اور یہ اطلاع دینا ضروری ہے کہ اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد یہ دونوں نینی تال واپس لوٹ گئے تھے۔یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ دوسری تحریکوں یا انقلابات کی طرح اس انقلاب کی بھی ہوا نکل گئی تھی۔بلکہ اس انقلاب کے ایک ہفتہ کے اندر زنا بالجبر کے کئی حادثے دلی میں ہی سامنے آ چکے تھے۔حیوانیت اور درندگی کا سلسلہ جاری تھا۔جنتر منتر اور انڈیا گیٹ میں جمع ہوئے انقلابی واپس اپنی اپنی دنیا میں پہنچ چکے تھے۔شور تھم گیا تھا۔عورت دوبارہ خوف کی دہلیز پر تھی۔اور دنیا مردوں کی مردانگی

کے ساتھ اسی طرح دوڑ رہی تھی جیسے روز ازل سے دوڑتی آئی ہے —

ناہید ناز اور کمال یوسف قرول باغ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ لیکن نینی تال واپسی سے پہلے ایک رات میں نے انہیں ڈنر کے لئے اپنے گھر بلایا تھا۔ تین کمروں والے فلیٹ میں، میں اکیلے رہتا ہوں۔ میں اپنی تنہائی میں خوش ہوں۔ کتابیں میری دوست ہیں۔ میں نے اُن کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی۔ ۷ بجے بیل بجی۔ دروازہ کھولا تو سامنے پھولوں کے 'بکے' کے ساتھ دونوں کھڑے تھے۔ مسکراتے ہوئے۔ میں نے پھولوں کا تحفہ قبول کرتے ہوئے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا......

▪▪

کھانے سے فارغ ہو کر ہم ٹیرس پر آ گئے۔ یہاں پھولوں کے گملوں کے درمیان بوٹی سی چیئر پر بیٹھ گئے۔ گملوں کے درمیان رنگین قمقمے بھی روشن تھے۔ ناہید اور کمال یوسف کو میرا گھر پسند آیا تھا۔

'آپ اکیلے ہو کر یہ سب کیسے کر لیتے ہیں۔'

'مجھے اچھا لگتا ہے۔ کہیں نہ کہیں ان سے ہو کر بھی میری تخلیق گزرتی ہے۔ مجھے بکھراؤ اچھا نہیں لگتا۔ چادر پر ایک ہلکی سی سلوٹ ہو تو مجھے لکھنے میں پریشانی ہوتی ہے۔ کتابیں بکھری ہوں تو میں لاکھ لکھنا چاہوں مگر قلم اپاہج ہو جائے گا۔'

'تعجب ہے۔' کمال یوسف نے ایک گملے کی طرف اشارہ کیا...... یہ رات کی رانی ہے نا......؟'

آپ کو پسند ہے...... میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

'ہاں۔ اکثر لکھتے ہوئے ٹیرس پر آ جاتا ہوں اور واپسی میں جب لکھنے کی میز تک پہنچتا ہوں تو کہانیاں میرے سامنے ہوتی ہیں۔'

میں نے دیکھا، ناہید ٹیرس کے دائیں طرف کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک درخت کی آڑ میں ایک نوجوان لڑکا، ایک لڑکی کا بوسہ لے رہا تھا...... ناہید کی آنکھوں میں چمک تھی۔ میرے لیے یقینی طور پر یہ ایک عام سی بات تھی اور میں اس بات پر بھی یقین رکھتا تھا کہ محبت میں ہر گناہ جائز ہے۔ محبت کے ہر ذائقے میں ایک نئی جنت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور محبت کے لئے کوئی عمر نہیں ہوتی۔ لیکن اس وقت میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اور یہی موقع تھا جب ناہید ناز کی نفسیات پر کھل کر چوٹ کی جا سکتی تھی۔ نتیجہ کے طور پر مجھے امید تھی، ناہید کی شخصیت کے بارے میں مزید جاننے کا کچھ موقع مل ہی جائے گا۔

میں نے غور سے اس نوجوان جوڑے کی طرف دیکھا۔ پھر ناہید کی طرف مڑا۔

'اس طرح کی بے حیائی یہاں عام ہے۔'

'بے حیائی!' ناہید غصے سے میری طرف مڑی تھی — محبت کرنے کو آپ بے حیائی سمجھتے ہیں۔؟'

'لیکن محبت گھر میں بھی تو کی جا سکتی ہے۔'

'باہر کیا پرابلم ہے۔ اور محبت کے لیے صرف گھر کی شرط کیوں —؟ جہاں بھی موقع ملے...... میرے خیال میں محبت کو کسی بھی طرح کی سماجی، قانونی مذہبی بندش سے بغاوت کر دینی چاہئے۔'

'کیا یہ بغاوت آسان ہوتی ہے؟'

'مشکل بھی نہیں ہوتی۔ ہمت چاہئے۔'

'ماں باپ ہمت کو کمزور کر دیں تو......'

'ماں باپ غلطی کریں تو انہیں ان کے جرم کی سزا نہیں ملنی چاہئے۔ اور ہمارے معاشرے میں عام طور پر غلطیاں ماں باپ ہی کرتے ہیں۔ لڑکی بڑی ہو تو بس ایک ہی فکر کہ کہیں بھی شادی کر دو۔ اور اگر لڑکی نے خلاف توقع اپنی پسند کا لڑکا چن لیا تو ان کے غرور کو دھچکا لگتا ہے۔ کیوں بھئی آپ اپنی زندگی جی چکے۔ اب ہمیں جینے دیجئے۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے بھی آپ ہی کی طرح ایک بندھی بندھی بیکار سی زندگی جینے پر مجبور ہوں۔ ہماری زندگی ہے بھائی۔ ہمیں جینے دیجئے۔

لیکن وہ ماں باپ ہوتے ہیں۔' کمال یوسف نے مداخلت کی۔

’تو؟ ماں باپ ہیں تو ہمیں مار ڈالیں۔ یہی ذمہ داری ہے ان کی۔ ماں باپ ہیں تو ایک حد میں رہنا چاہئے انہیں۔ کیونکہ جب ہم بڑے ہوتے ہیں تو ہماری اپنی زندگی کی شروعات ہو جاتی ہے جو ہمیں اپنے طریقے سے جینی ہوتی ہے۔ ہماری شناخت کیوں ماں باپ کی شناخت یا مذہب، ماں باپ کا مذہب ہونا چاہئے......؟ صرف اس لیے کہ انہوں نے ہمیں پیدا کیا ہے۔‘

میں نے غور کیا، ناہید ناز کا پورا چہرہ غصہ کی آگ میں سلگ رہا تھا۔’اکثر ماں باپ اس لائق نہیں ہوتے کہ انہیں ماں باپ کہا جائے۔ کیونکہ پیدا ہوتے ہی وہ آسمانی کتابوں سے دو مختلف طریقے ہمارے لیے ڈھونڈ لے آتے ہیں۔ لڑکوں کے لئے رہنے کے طریقے الگ—لڑکیوں کے جینے کے طریقے الگ—دنیا کے زیادہ تر ماں باپ اپنے بچوں کے لیے ایک دقیانوسی ماں باپ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے وجود کو مشکل سے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔‘

کمال یوسف اس پوری گفتگو کے درمیان خاموش تھا۔ اور یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ ناہید ناز کی گفتگو سے متفق نہیں مگر ابھی کچھ بھی بولنا اس کے لئے آسان نہیں تھا۔ ناہید ناز خاموش ہوئی تو مجھے چائے تیار کرنے کا موقع مل گیا۔ جب چائے ٹرے میں لے کر لوٹا تو ٹیرس پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ٹیرس سے باہر وہ دونوں سائے اب بھی موجود تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بولا۔

’دیکھئے۔ وہ لڑکی ابھی تک ہے۔ یہ لڑکیاں مذہب اور معاشرے کا فرق تک بھول گئی ہیں......‘ میں نے ایک معمولی بات کہی تھی لیکن اچانک میں نے غصہ سے کانپتے ہوئے ناہید ناز کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ مجھ پر برس پڑی تھی۔

’آپ بھی جونا گڑھ کے ہجڑے نکلے۔‘

’جونا گڑھ......‘ میں ایک دم سے چونک گیا تھا......

’میں وہیں کی رہنے والی ہوں......‘ کہہ کر وہ رکی نہیں۔ غصہ سے دہاڑتی ہوئی بولی—وہاں پیڑ کے سائے میں لڑکا بھی ہے۔ پھر لڑکے سے آپ کو شکایت کیوں نہیں۔‘ اس نے لڑکے کی شان میں گندی گالیوں کا پورا پٹارہ کھول دیا—لڑکی تو معصوم ہے۔ اور کیا جانتے ہیں آپ لڑکی کے بارے میں—؟ ایک معصوم تیرہ چودہ، پندرہ سال کی لڑکی کے بارے میں—؟ وہ اپنے احساس کی پینٹی میں ہوتی ہے۔ آپ کے ذرا سا چھوتے ہی گیلی ہو جاتی ہے۔ قصور لڑکی کا ہے یا اسے بنانے والے کا؟ سیکس آپ سے زیادہ لڑکی کو دیا تو لڑکی قصووار ہو گئی۔ بھگوان نے ایک غلطی اور بھی کی۔ عورت کو لینے والا بنایا اور مرد کو دینے والا—مرد سو غلطیاں کرے تو پاک صاف۔ عورت غلطیاں کرے تو آپ چرتر ہین، کلٹا، فاحشہ رنڈی اور پتہ نہیں کن ناموں سے پکارنے لگتے ہیں—میرے مطابق یہ تمام نام آپ کے ہونے چاہئیں۔ مردوں کے نام......رنڈی مرد......بھڑوا مرد...... کلٹا مرد......فاحشہ مرد......آپ نے کائنات کے سب سے حسین تصور پر اپنی گندگیاں، بدصورتی اور خامیاں چھپانے کے لئے میل ڈال دی—مجرم تو آپ ہوئے۔‘

ناہید ناز نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چائے کا کپ خالی کر کے بوٹی کرسی کے نیچے ڈال دیا......اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا......کچھ وقفہ تک سوچتی رہی جیسے اپنے توازن میں لوٹنا چاہتی ہو یا سلگتے الفاظ کے سرخ دہکتے کوئلے کو ٹھنڈا کرنا چاہتی ہو......وہ مسکرا رہی تھی......

’آپ بھی جونا گڑھ کے ہجڑے نکلے۔ ساری غلطی لڑکی کی۔ مجرم عورت......واہ رے......دو وجود آپسی اتفاق سے کمرے میں بند—شادی نہیں ہوئی تو محبت کے رشتے بھی ناجائز۔ دونوں بند ہیں لیکن ذمہ دار ہے تو لڑکی۔ سماج کو خراب کر رہی ہے تو لڑکی۔ بدنامی کا سارا طوق اسی کے گلے پر۔ اور مرد بڑے پارسا ٹھہرے۔‘

’لیکن اس طرح تو آپ مغرب کی حمایت کر رہی ہیں۔ غیر ضروری آزادی کی حمایت کر رہی ہیں۔ کیا آپ نے سوچا ہے ان خیالات کو فروغ مل جائے تو بے راہ روی میں اضافہ ہو جائے گا۔ رشتوں کا فرق مٹ جائے گا۔ مذہب اسی توازن کا تو نام ہے۔‘

وہ پوری شدت سے چیخی تھی—’مذہب آپ کے گندے انڈرویئر میں ہوتا ہے۔ اور مرد جب تب عورتوں کے استحصال کے لیے مذہب کو اسی میلے انڈرویر سے نکال لیتے ہیں۔ اور مجھے معاشرہ، مذہب آزادی کا خوف نہ دکھایئے—آپ جیسے جونا گڑھ کے ہجڑوں نے مذہب کو، عورت کو، سماج کو صرف اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔ یہ وراثت آپ سے ایک دن چھین لی جائے گی۔ اور آپ مغرب کی بات کرتے ہیں۔ آپ کا معاشرہ کیا ہے۔ یہاں لڑکیاں کوکھ میں مار دی جاتی ہیں۔ بڑی ہو جاتی ہیں تو اپنے رشتہ داروں کی جنسی جبلت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ اسکول اور کالج جاتی

ہیں تو وہاں بھی سیکس کا کھلونا ہوتی ہیں اور آپ کے ہر عمر کے مرد اسے گھورتے رہتے ہیں۔ آزادی تو آپ کی چھینی جانی چاہئے۔ آپ کو ساڑی پہنا کر، ہاتھوں میں چوڑیاں ڈال کر گھروں میں بند کر دینا چاہئے۔ میں سائنس سے صرف ایک تقاضہ چاہتی ہوں۔ بچے مرد پیدا کریں اور عورت بچہ پیدا کرنے کے عذاب سے آزاد ہو جائے— آپ عورت کو سڑکوں پر بھی مارتے ہیں۔ چلتی ہوئی بسوں میں بھی۔ اس کے ساتھ گزارے لمحوں کو عیش کا نام دیتے ہیں اور ہر بار آپ کی مردانگی کا ناجائز استعمال ہونے کے بعد وہی آپ کے لیے غلط ہو جاتی ہے۔ آپ کا پورا مرد سماج دوغلا ہے صاحب......'

وہ طنز کے ساتھ ہنس رہی تھی لیکن چہرے پر جھلستی آگ کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

میں آہستہ سے بولا......'مجھے ایسا کیوں احساس ہو رہا ہے کہ مغرب کے پردے میں آپ ناجائز سیکس کی وکالت کر رہی ہیں......'

ناہید ناز نے قہقہہ لگایا۔ پر جوش قہقہہ۔ کمال یوسف کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف— سیکس ناجائز کب سے ہو گیا؟ ناجائز ہے تو دنیا کے سارے رشتے ناجائز۔' وہ ہنس رہی تھی— دو لوگ ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ آپ کی گندی دنیا میں محبت تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بہت ہے۔ لیکن آپ کے معاشرے کو ان کا ساتھ رہنا پسند نہیں تو یہ سماج شادی کا جائز سرٹیفکیٹ تھمانے چلا آتا ہے۔ شلوک اور دعا پڑھنے سے، رسوم سے گزار کر آپ کے یہاں ان معاملات کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔'

'آپ نے کیوں شادی کی، آپ بھی تو بغیر شادی کیے......'

'لو......وہی جو ناگڑھ کے ہجڑوں کی طرح بات۔' ناہید زور سے ہنسی—' ان سے پوچھئے۔ اس نے کمال یوسف کی طرف اشارہ کیا— ان کو لیوان ریلیشن شپ منظور نہیں تھا......وہی......لوگ کیا کہیں گے۔ ارے لوگ جائیں بھاڑ میں۔ لوگوں کا کیا کرنا ہے۔ اور اب تو آپ کا بے بس اور لاچار قانون بھی ایسے رشتوں کو تسلیم کر رہا ہے......'

میں غور سے اس کے چہرے کی نفسیات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس وقت کوئی بھی نتیجہ برآمد کرنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ کمال یوسف کی حالت مجھ سے چھپی نہیں تھی۔ وہ کئی بار اس گفتگو میں مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش کرتا نظر آیا۔ جیسے یہ مکالمے اسے پسند نہ آئے ہوں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ناہید ناز جیسی کھلی ہوئی عورت کے سامنے وہ اس قدر لاچار تھا کہ اپنے خیالات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کمال یوسف کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ مجھے ہو چکا تھا کہ ناہید ناز کی باتوں پر متفق ہونا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ بلکہ اب یہاں آنے کے بعد وہ شاید اس بات کے لیے بھی پریشان تھا کہ اسے ناہید کو لے کر یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ مگر اس سے ایک بات اور بھی ثابت ہوئی تھی کہ ناہید کا ماضی کوئی بہت اچھا نہیں رہا ہوگا— کیونکہ جو باغی عورت اس کے وجود سے باہر آنے کو بے تاب ہے اس میں ایک بڑا ہاتھ اس کے اپنے گھر کا بھی رہا ہوگا۔ مگر ظاہر ہے ابھی اس بارے میں کوئی بھی بات ناہید ناز سے نہیں پوچھی جا سکتی تھی—

چلتے وقت کمال یوسف نے اپنا کارڈ دیا۔

'آپ نینی تال آئیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔'

'کیوں نہیں۔ میں ضرور آؤں گا۔'

'اب اجازت دیجئے۔'

دونوں کے جانے کے بعد بھی آگ کی وہ تپش باقی تھی جو ناہید ناز اپنی گفتگو سے چھوڑ گئی تھی۔

اس کے کچھ دنوں بعد ہی میں اپنے گھر کی سیڑھیوں سے الجھ کر گر گیا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک ہفتہ آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اور اسی درمیان نینی تال سے مجھے کمال یوسف نے فون کیا تھا۔ دلی میں کیا کر رہے ہیں۔ یہاں آ جائیے— ممکن ہے یہاں آپ کو ایک دلچسپ کہانی مل جائے— اور اسی کے بعد میں نے نینی تال جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

تیسرا حصہ

ریگِ جنوں

One is not born, but rather becomes, a woman.

—Simone de Beauvoir

(1)

ہری بھری گل پوش پہاڑیوں کے درمیان کئی خوبصورت کاٹیج بنے ہوئے تھے۔خوشگوار موسم، پہاڑی جھیلوں اور جھرنوں کی مترنم آوازیں کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔مرغزاروں کے درمیان کی سڑک پر کبھی کبھی کوئی سواری یا کار تیزی سے رینگ کر پہاڑیوں کی دوسری سمت میں اوجھل ہوجاتی......حسین پھولوں اور سبز پتوں والے درختوں کی نہ ختم ہونے والی قطار کے درمیان سفری بیگ کندھے پر لٹکائے ہوئے ان وادیوں میں سیر کا بھی اپنا مزہ تھا۔تالوں میں تال،اورسب سے حسین اپنا نینی تال کہنے والے باشندے جب فخر سے مسکراتے تو ان کے چہروں پر نور کی کرنوں کا بسیرا ہوتا......اور جب وہ میزبانی کے فرائض انجام دیتے تو اس شہر کے تعلق سے ہزاروں کہانیاں ان کی زبان پر ہوتیں۔کمایوں کے طول عرض میں یوں تو کتنے ہی تالوں میں قدرت نے اپنی سخاوت کا خزانہ کھول رکھا ہے لیکن پہاڑیوں اور مرغزاروں سے گھرے نینی تال پر قدرت کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آتی ہے۔تال میں پہاڑیوں اور درختوں کے عکس جب سورج کی کرنوں کے ساتھ اترتے ہیں تو سیاحوں کی آنکھوں کا نور کچھ اور بھی گہرا ہوجاتا ہے۔پہاڑی جھرنوں میں تیرتے ہوئے بطخوں کا جھنڈ، چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور رنگین موٹر بوٹ اور شب پر پانی میں اترتی ہوئی چاندنی کی کرنیں— پھر کون ہے جس کی آنکھیں ان حسین مناظر میں گم نہ ہوجائیں......

یہ ایک کاٹیج تھا جس کے باہر کوئی بھی نیم پلیٹ نہیں تھی۔ایک خوبصورت سالوہے کا دروازہ تھا۔اور یہاں سے سامنے دلکش پہاڑیوں پر جمی ہوئی دھند کا نظارہ کچھ ایسا تھا جو اس لڑکی کو دیر تک۔اس منظر میں گم ہوجانے پر مجبور کررہا تھا...... پہاڑی پرندے اڑتے ہوئے اس طرف آتے تو لمحہ بھر کیلئے اس کے ساتھ ان کی جانب اٹھ جاتے۔پرندوں کے آسمان پر اوجھل ہوتے ہی وہ دوبارہ پہاڑیوں کی طرف دیکھنے لگتی......

کاٹیج کے اندر کی ڈرائنگ روم میں اس وقت دو بزرگ ہستیاں ہندی کے قرآن شریف پر جھکی ہوئی تھیں۔

بوڑھے مرد نے آہستہ سے اپنی بیوی سے کہا۔'ہاں......کل جس جگہ تم نے چھوڑا تھا،اب وہاں سے آگے سناؤ۔'

میں چشمہ بھول آئی ہوں۔'بزرگ عورت نے کہا۔'بہتر ہے آج تم سناؤ۔'

بوڑھے مرد نے عقیدت سے قرآن شریف کے صفحے پلٹے......اور پھر— باواز بلند پڑھتا بھی جاتا تھا اور درمیان میں ٹھہر کر اپنی بیوی سے کچھ پوچھتا بھی جارہا تھا۔......

''لوگوں کے لئے من پسند چیزیں......استریاں،سنتان،سونے چاندی کے ڈھیر، چنے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیت کی زمینیں بڑی

لبھاونی بنادی گئی ہیں۔لیکن یہ سب دنیا کے لیے، کچھ دنوں کی چیزیں ہیں۔حقیقت میں جو اچھا ٹھکانہ ہے وہ اللہ کے پاس ہے۔میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے اچھی چیز کیا ہے، جو لوگ تقویٰ کی نیتی اپنائیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہے......جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ جہاں انہیں ہمیشہ کی زندگی ملے گی...... پاکیزہ بیویاں ان کی ساتھی ہوں گی۔اور اللہ کی خوشی انہیں حاصل ہوگی۔اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ مالک ہم ایمان لائے ہماری خطاؤں کو معاف کر۔اور ہمیں جہنم کی آگ سے بچالے۔ یہ لوگ جو صبر سے کام لینے والے ہیں۔ سچے ہیں۔فرماں بردار ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے معافی کی دعائیں مانگا کرتے ہیں......'

بوڑھے مرد نے سفید شال، جو پڑھتے ہوئے کندھے سے اتر گئی تھی، دوبارہ اپنے کندھے پر رکھی۔ پلٹ کر چمکتی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ بزرگ بیوی کے ہونٹوں پر شکایت تھی۔

'تم بہت تیز پڑھتے ہو۔ میں اپنا چشمہ لے کر آتی ہوں۔' وہ سرعت سے اٹھی اور دوسرے ہی لمحہ مسکراتی ہوئی واپس آکر صوفہ پر بیٹھ گئی۔ وحیدہ نہیں ہوتی تو......' وہ مسکرا رہی تھی۔اس نے ہم اکیلے بوڑھوں میں زندگی ڈال دی ہے۔'

'اور دیکھو تو کوشلیا...... ہمارے لیے یہ آسمانی کتاب بھی لے کر آگئی۔'' بزرگ مرد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی— 'میں ایک عرصہ سے پڑھنے کا خواہشمند تھا۔اور دیکھو تو......جیسے گیتا پڑھ رہا ہوں۔ گیتا میں ہے قرآن، تو قرآن میں گیتا۔اقبال کتنا پہلے کہہ چکے تھے۔'

کوشلیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔'وحیدہ جب پڑھتی ہے تو لگتا ہے پھول جھڑ رہے ہوں۔'

'وحیدہ کہاں ہے......؟'

'آواز دوں کیا؟''

'نہیں۔کہاں جائے گی۔ پینٹنگ کرے گی یا خاموشی سے باہر کے نظارے دیکھے گی۔ بیوٹی پارلر سے بھی چھٹی لے رکھی ہے۔'

مرد بزرگ نے آہستہ سے کہا— ہاں تم آگے سنانے والی تھی۔

بزرگ عورت نے آنچل برابر کیا اور روانی سے پڑھنا شروع کیا۔

''اللہ نے خود اس بات کی گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔اور فرشتے بھی اس سچائی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔اللہ کے نزدیک مذہب صرف اسلام ہے......'

بزرگ مرد اس جملے پر ٹھہرا......کوشلیا نے بھی ایک سکنڈ کے لیے ٹھہر کر بزرگ مرد کے چہرے کی طرف دیکھا۔

'اس کے معنی وحیدہ سے پوچھنے ہوں گے۔'

بزرگ نے آہستہ سے کہا۔'اسلام کا مطلب ہوتا ہے سچا راستہ۔ممکن ہے یہاں یہی بات کہنے کی کوشش کی گئی ہو۔'

کوشلیا کے ہونٹوں پر سوال تھے— 'یعنی ہمارا دھرم کوئی دھرم نہیں۔' اس کے لہجہ میں فکر تھی۔اب یہ بات وحیدہ ہی بتائے گی۔' کیوں...... میں آواز دیتی ہوں۔'

پتلی سی گردن پر وزن دیتے ہوئے چہرے کو دروازے کی طرف گھمایا اور صدا لگائی......'

'وحیدہ......'

کچھ ہی لمحے بعد تیزی سے وہ لڑکی بھاگتی ہوئی آئی جو کچھ دیر پہلے پہاڑیوں کی دھند دیکھنے میں مصروف تھی......

'جی امی......جی ابو......آپ نے بلایا......'

'دیکھا......پہلی ہی آواز پر......' کوشلیا نے پیار سے وحیدہ کی طرف دیکھا......کہاں تھی بیٹی......'

'باہر تھی امی......'

'کیوں......'

'زندگی کو سمجھ رہی تھی امی......'

ناگارجن یعنی بوڑھے مرد نے قہقہہ لگایا— 'تو میری بیٹی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ہم تو ابھی بھی نہیں سمجھ پائے بیٹی......'

’جی ابو......‘

’اچھا۔ کچھ سمجھ میں آیا بیٹی......‘

’جی ابو...... باہر پہاڑیاں ہیں......دھند ہے...... پرندے کھائیوں میں اپنی روح چھوڑ جاتے ہیں......راتیں نیلے آسمان سے ان کی حفاظت کرتی ہیں......‘

’روحوں کی......؟‘

’جی ابو......‘

کوشلیا غور سے وحیدہ کا چہرہ پڑھ رہی تھی......

’یہ باتیں تم نے کہاں سے سیکھیں وحیدہ‘

’پرندوں سے ——وہ ہماری دوست ہیں......‘

ناگارجن نے پھر ایک قہقہہ لگایا...... زندگی ایک چھلاوہ ہے بیٹی......اچھا کیا جو تم نے پرندوں کو اپنا دوست بنالیا۔ انسان تو چھلاوہ ہوتے ہیں......اب دیکھو...... میرے ہی دو بیٹے تھے۔ ایک سنگاپور میں دوسرا امریکہ میں......ایک عمر میں دولت نشہ بن جاتی ہے۔ پرندے اڑ جاتے ہیں اور بوڑھے موت کے انتظار میں اکیلے رہ جاتے ہیں۔‘

’ایسا کیوں کہتے ہیں ابو......‘

بوڑھے نے شال برابر کی۔ سر پر گرم ٹوپی تھی۔ سفید چہرہ اس وقت کچھ زیادہ ہی سپید ہو گیا تھا۔ ناک لال سرخ ہو رہی تھی۔ قد بھی کوئی پانچ فٹ ۸ انچ کے قریب۔ دبلے پتلے۔ آنکھیں فکر میں ڈوبی ہوئیں۔ ایک قطرہ آنسو آنکھوں میں خشک ہو گیا۔ کوشلیا نے پلٹ کر دیکھا......

’ایک وقت آتا ہے جب بچوں کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔‘

’ہاں اور اس زندگی کے لیے بچے، ہمارے درمیان گزارے ہوئے لمحوں کے ساتھ ہمیں بھی بھول جاتے ہیں۔‘

’ایسا نہیں ہے ابو۔‘

ناگارجن نے پلٹ کر اس معصوم سی بچی کو دیکھا۔ آنکھوں میں ایک چمک دوڑ گئی—— کہاں سے آ گئی یہ فرشتہ اُن کے گھر! اگر وحیدہ نہیں آئی ہوتی تو......؟ انسانوں سے دور اور پرندوں کو اپنانے والی، قدرت کے سحر میں ڈوب جانے والی وحیدہ نے گھر کی اداسی اور ویرانی کو بڑی حد تک ختم ضرور کر دیا تھا۔ آنکھوں میں تین سال پہلے کی ایک تصویر لہرائی...... یہاں سے دو کیلو میٹر آگے ایک جھیل ہے جسے چاندرک جھیل کہتے ہیں۔ وہاں سے دو قدم آگے لورز پوائنٹ ہے۔ یہاں اکثر خودکشی کے واقعات سامنے آئے ہیں۔ اس وقت وہ خود گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔ کوشلیا نے ہاتھ کے اشارے سے چلا کر کہا——

’وہ دیکھو......‘

سامنے پہاڑیوں پر جھکی ہوئی ایک لڑکی تھی۔ کندھے سے جھولتی ہوئی سیاہ چنری۔ چوڑی دار پائجامہ اور کرتا پہنے—— وہ پہاڑیوں پر یوں جھکی تھی جیسے چھلانگ لگانا چاہتی ہو...... ناگارجن نے گاڑی روک دی۔ کوشلیا تیزی سے گاڑی سے اتری۔ اور دوڑ کر آگے بڑھ کر لڑکی کے ہاتھوں کو تھام لیا......

’کیا کرنے جا رہی تھی......‘

’گہرائی ناپنے جا رہی تھی......‘

’گہرائی......‘

ناگارجن نے شک سے پوچھا—— اکیلی ہو؟‘

’ہاں سب ہی تو اکیلے ہیں۔‘

’پاؤں پھسل جاتا تو......؟‘

'اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی— پھر پرندہ بن جاتی......ایک چھوٹی سی گوریا......'

'مرنے سے ڈر نہیں لگتا؟'

'زندگی سے لگتا ہے......' اُس کی آواز سرد تھی۔

ناگارجن کو اس لڑکی پر پیار آ گیا تھا۔

'گاڑی میں بیٹھو۔ یہاں سے کچھ دوری پر ہی میرا گھر ہے۔'

ڈرائنگ روم میں ڈرائی فروٹس اور پھلوں کے ساتھ وحیدہ کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ وہ گرلس لاج میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا بریف کیس تھا اس کے پاس......ناگارجن اور کوشلیا نے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس نے زندگی کے سارے راز چھپا لیے۔ صرف اتنا بتایا......

'میں تنہا ہی اس زندگی کو سمجھنا چاہتی ہوں۔'

پھر ناگارجن نے اس کے بعد کبھی اس کے ماضی کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ گرلس لاج سے بریف کیس آ گیا۔ اور وحیدہ خاندان کا ایک حصہ بن گئی۔ مگر وحیدہ کو دیکھتے ہوئے ہر بار ایسا لگتا، جیسے زندگی کے ہزاروں راز اس کے سینے میں پوشیدہ ہوں۔

ناگارجن خیالات سے واپس آئے تو سامنے وحیدہ کے شگفتہ چہرے پر فکر کی متعدد لکیریں دیکھ کر چونک گئے۔

'کیا بات ہے بیٹی......'

'کچھ نہیں ابو......بس جی کبھی کبھی گھبرا جاتا ہے۔'

'لیکن تم تو تنہائیوں سے پیار کرتی ہو۔'

'کبھی کبھی تنہائیاں بھی گفتگو نہیں کرتیں۔'

کوشلیا۔ آہستہ سے بولی— 'کیوں میری بیٹی کو پریشان کر رہے ہیں......'

وحیدہ جلدی سے بولی......'نہیں امی......ابو پریشان نہیں کرتے......'

ناگارجن نے پیار سے وحیدہ کو دیکھا۔

'اچھا ایک بات پوچھوں بیٹی......؟'

'ہاں۔'

'تم پرندوں سے کیا باتیں کرتی ہو؟۔'

'میں تو ان سے ڈھیر ساری باتیں کرتی ہوں......'

'کیا وہ تمہاری باتوں کو سمجھتے ہیں۔؟'

ہاں۔ انسانوں سے زیادہ......'

'کیا وہ بھی تم کو اپنی باتیں بتاتے ہیں۔'

'ہاں......وہ کہتے ہیں تم ہماری طرح بن جاؤ......'

'پھر تم کیا کہتی ہو؟'

خدا نے جس کو جیسا پیدا کیا ہے، اس کو اسی طرح رہنا ہے۔

واہ......کوشلیا نے تیز آواز میں کہا......

اچھا۔ تم پرندوں سے کیا کہتی ہو......'

'میں پوچھتی ہوں۔ زندگی کیا ہے...... وہ پروں کو پھیلا کر اڑتے ہوئے کہتے ہیں۔ یہ ہے زندگی...... میں کہتی ہوں...... مجھے تو اڑنا نہیں آتا...... وہ کہتے ہیں۔ اڑان سب کی سرشت میں ہے۔ میں کہتی ہوں...... مجھے اڑنا سکھایا ہی نہیں گیا...... وہ کہتے ہیں......نہیں سکھایا گیا تو

ہمارے ساتھ سیکھ لو......'

'پرندے تم سے تمہارے گھر کے بارے میں نہیں پوچھتے — ؟ ناگارجن نے نشانہ لگایا......

نہیں۔ پرندے کہتے ہیں۔ یہ پورا آسمان ہمارا گھر ہے......اور یہ سارے پرندے ہمارے اپنے گھر کے لوگ — لیکن انسانوں میں ایسا نہیں ہوتا نا ابو...... یہاں کوئی کسی کو اپنا نہیں سمجھتا......'

'ہاں بیٹی۔ ہماری دنیا کا یہی سچ ہے۔ اپنے ہوتے ہوئے بھی ہم یہاں اکیلے ہوتے ہیں۔'

ناگارجن پھر گہری اداسی میں کھو گئے تھے۔

'میں باہر جاؤں ابو......'

'ہاں بیٹی۔'

وحیدہ کے باہر جاتے ہی کمرے میں سناٹا پھیل گیا۔

کوشلیا آہستہ سے بولی۔ کبھی کبھی اس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی......لیکن جانے کیوں لگتا ہے وہ بولتی رہے اور ہم سنتے رہیں......'

ناگارجن نے شال صوفے پر پھیلا دی۔ اور صوفے کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

باہر وحیدہ ہاتھ پھیلائے اڑتے پرندوں سے گفتگو میں محو تھی اور یہی وقت تھا جب ایک سایہ کندھے پر بیگ لٹکائے تیز تیز چلتا ہوا اچانک ٹھہر گیا تھا —

(2)

یہ نظارے کسی مصور کی حسین پینٹنگس کی طرح تھے۔ دلکش اور دلفریب لینڈ اسکیپ میں گھری ہوئی یہ مکمل وادی قدرت کا حسین شاہکار معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی میری آنکھیں غیر یقینی طور پر ایک دوسری زندہ جیتی جاگتی پینٹنگ پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ گلابی دھند میں پرندوں کے غول کے درمیان بھاگتی ہوئی، ہاتھوں کو ہوا میں لہراتی ہوئی وہ مجھے کسی طلسم کدے میں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا — اس کا چہرہ واضح نہیں تھا۔ تا حد نظر پہاڑیاں۔ ہلکی دھند۔ اڑتے ہوئے پرندے اور پرندوں کے درمیان ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے...... میں پشت سے ایک نظر اس ساحرہ پر ڈال سکا تھا...... جو پرندوں کے ساتھ ہی وادی گل پوش کی کسی اور سمت میں اوجھل ہو گئی تھی۔ اب پرندے بھی نہیں تھے۔ مگر ایک تصویر تھی جو اس وقت آنکھوں میں جامد و ساکت تھی اور مجھے میری حیرانیوں میں اُسی گلابی دھند کے ساتھ چھوڑ گئی تھی......

یقین کے ساتھ، اس منظر سے نکل پانا میرے لئے مشکل تھا...... وہ مثل غزال قلانچیں بھرتی، ایک ایک ڈگ اٹھاتی، اڑتے آنچل اور پرندوں کے ساتھ اسی انداز میں رقص کرتی ایک دھند سے نکلی اور دوسری دھند میں غروب ہو گئی — میں اسے پشت سے دیکھ سکا تھا اور مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ہو نہ ہو میں پہلے بھی اس ساحرہ سے مل چکا ہوں۔ اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہونے لگا کہ ان وادیوں میں آکر میں نے کوئی بھول نہیں کی ہے بلکہ یہاں ابھی سے کہانیاں میرا انتظار کرنے لگی ہیں۔

اور اسی طرح مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ دلی گینگ ریپ، کمال یوسف اور ناہید ناز سے ملاقات، میرے گھٹنے کی چوٹ اور نینی تال میں قدم رکھتے ہی اس ساحرہ سے ملاقات کے درمیان بکھری ہوئی داستان کی گمشدہ کڑیاں اتفاقاً ایک دوسرے سے پیوست ہوتی جا رہی ہیں — اور

مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ یہاں آ کر اس ساحرہ سے ملاقات کے پس پشت بھی کچھ ایسی بات ضرور ہے جس نے مجھے دلی سے نینی تال کی وادیوں تک لانے پر مجبور کیا ہے —

کمال یوسف کا بنگلہ پاس ہی تھا — اتفاق سے دونوں ہی گھر پر تھے۔ ناہید ناز کچھ بدلی بدلی ہوئی خاموش تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ بڑے تپاک سے ملی اور اس بات کا احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ اندر سے پریشان ہے۔ جیسے وہ اس بات سے قطعی انجان تھی کہ میں مسلسل اُسے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا —

چائے پیتے ہوئے مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ میری آمد سے ناہید ناز کچھ زیادہ باخبر نہیں تھی — یعنی اگر یہ دعوت خاص کمال یوسف کی طرف سے ہے تو اس میں ضرور کچھ خاص بات ہے۔

بسکٹ کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے ناہید ناز نے کہا — کمال نے کل شب بتایا کہ آپ آنے والے ہیں.....'

'اس کا مطلب آپ کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔'

'خوشی کیوں نہ ہوگی۔ ہم مہمان کو باعث رحمت سمجھتے ہیں۔ اور یہاں کون ہے جو اتنی دوران وادیوں میں روز روز ہم سے ملنے آتا ہے۔'

کمال یوسف نے مسکراتے ہوئے پوچھا — 'آپ کا کمرہ تیار ہے۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود ہے۔ کیا آپ آرام کرنا چاہیں گے۔'

'ہاں۔ میں تھوڑی دیر فریش ہو کر آرام کرنا چاہوں گا۔'

دراصل میرے لیے آرام کرنا ایک بہانہ تھا۔ میں اس درمیان جی بھر کر اس گلابی دھند کو یاد کرنا چاہتا تھا، جہاں وہ ساحرہ رقص کرتی ہوئی قدرت کے لینڈ اسکیپ کے درمیان اچانک گم ہو گئی تھی۔

'کیا اس کے بارے میں کمال یوسف سے دریافت کروں؟'

لیکن میں ابھی جلد بازی کا کوئی مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فریش ہونے کے بعد میں نے دوبارہ غور سے اپنے سجے ہوئے کمرے کو دیکھا — کھڑکی کا پردہ کھینچا۔ باہر پہاڑیوں پر گرتی ہوئی سورج کی کرنیں، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے پہاڑیوں پر سونے کی نقاشی کر دی گئی ہو۔ گلابی دھند غائب تھی۔ ان پہاڑیوں پر دھند اور کرنوں کا رقص چلتا رہتا ہے — کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں ڈرائنگ روم میں آیا تو کمال یوسف اکیلے تھے۔ معلوم ہوا کہ ناہید کسی ضروری کام سے باہر گئی ہے۔ لیکن جلد ہی آ جائے گی...... میں نے ناہید اور اس کے تعلقات کے بارے میں پوچھا تو اس نے ٹھنڈی سانس لے کر بتایا۔ سب کچھ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ میرے لیے سمجھنا مشکل ہے کہ ناہید مجھ سے کیا چاہتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ کیا یہ سب پہلے بھی تھا......

'نہیں۔ ہاں کبھی کبھی اس میں ایک بدلی ہوئی عورت آ جاتی ہے.....'

'بدلی ہوئی عورت یا مرد؟'

'ممکن ہے۔'

'لیکن اس کی کوئی تو وجہ ہوگی۔؟'

'وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ لیکن محبت کی شروعات تک ایسا بالکل نہیں تھا۔ وہ ایک عام سی مسلمان ہندوستانی لڑکی تھی۔ کبھی کبھی اس کی باتیں ایک منفرد سوچ رکھنے والی، تعلیم یافتہ لڑکی کی ہوا کرتی تھیں، جس پر زیادہ غور کرنے کی مجھے فرصت نہیں تھی۔'

'کیا یہ رویہ دلی آنے کے بعد......؟'

'نہیں...... میں کہہ سکتا ہوں، اس رویے کی شروعات دلی آنے سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔'

'آپ نے ناہید کے اس بدلے بدلے رویے پر کچھ تو غور کیا ہوگا؟'

'میں کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اس کی ناراضگی آہستہ آہستہ ایک بڑی بغاوت میں تبدیل ہونے لگی ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ کہیں وہ کسی دماغی مرض یا نفسیاتی الجھن کا شکار تو نہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ایک عام سی لڑکی ہوتی ہے۔'

'ممکن ہے اُس پر غصہ کا دورہ پڑتا ہو......'

'نہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے— یقیناً کوئی بات اندر سے اسے پریشان کر رہی ہے— لیکن وہ بات کیا ہوسکتی ہے، میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا۔'

'مجھے بھی یہی لگتا ہے۔لیکن ناہید سے کچھ بھی اگلوانا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی میں کوشش ضرور کروں گا۔'

میری آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ مجھے ناہید ناز کے وہ مکالمے یاد آئے۔ جہاں مرد ذات کے لئے شدید ناراضگی کا ردعمل کوئی بھی محسوس کر سکتا تھا۔

'کیا تم کو نہیں لگتا کہ بیک وقت وہ دو طرح کی زندگی جی رہی ہے۔؟'

'ہاں۔ یہ میں نے کئی بار محسوس کیا۔'

میں نے باشا کے بارے میں دریافت کیا۔'اپنے بچے کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہے۔'

باشا کا خیال رکھتی ہے۔لیکن کبھی کبھی مجھ پر بھی ناراض ہوتی ہے کہ کیا حدیث میں لکھا ہے کہ بچے کا خیال عورت ہی رکھے۔'

دراصل میں دلی سے آنے کے بعد کے واقعات جاننے کا خواہشمند تھا۔ کیونکہ کمال یوسف کی زندگی میں آنے والی بڑی تبدیلیاں اسی درمیان رونما ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے کھل کر گفتگو کا خواہشمند تھا— لیکن وہ خوفزدہ بھی تھا کہ ناہید ناز کسی لمحہ بھی گھر پہنچ سکتی تھی اور اسی لیے وہ بار بار ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، کھڑکی کے پاس گیا۔ باہر کی طرف دیکھا— پھر مسکرانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا بولا۔

'باشا نہیں ہوتا تو شاید میں اس سے الگ بھی ہو جاتا۔مگر صاحب۔ محبتیں کبھی کبھی آپ کو رسوائی اور ذلت کے باوجود بھی مجبور اور لاچار بنا دیتی ہیں۔ میں جانتا ہوں، میں نے ٹوٹ کر ناہید سے محبت کی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔مگر کبھی کبھی......اور میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔' میں آپ کو کیسے بتاؤں...... میں خود بھی اس کے ہر سوال پر حیرت زدہ رہ جاتا ہوں...... جیسے کل ہی جب میں نے اس کو بتایا کہ آپ آنے والے ہیں۔ اس کا غصہ دیکھنے کے لائق تھا......آپ نہیں سمجھیں گے۔ میں بتاتا ہوں کیا ہوا تھا۔ میں منسٹری آف ٹورزم کے محکمہ میں ہوں۔ اس دن مجھے اترا کھنڈ پر آئی ہوئی تباہی کے متعلق اپنی رپورٹ منسٹری کو بھیجنی تھی۔ ساتھ ہی نئے سرے سے تعمیرات اور تخمینہ کو لیکر بھی اپنی کارروائی مکمل کرنی تھی۔ میں سارا دن بزی رہا۔ ناہید سمروے اسکول میں پڑھاتی ہے۔ صبح کو آفس آتی ہے اور تین بجے تک باشا کے ساتھ رہتی ہے— کبھی کبھی مشغول رہنے کے لیے وہ باہر سے بھی کچھ کام گھر لے آیا کرتی ہے۔ مثال کے لئے ایک ہندی اردو ڈکشنری کا پروجیکٹ تھا۔ اور یہ پروجیکٹ ایک ہنگامے کے ساتھ کچھ دنوں قبل ہی پایۂ تکمیل تک پہنچا تھا۔

'ہنگامے کے ساتھ؟'

'یہ واقعہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے وہ واقعہ سن لیجئے جس کا تعلق آپ کی آمد سے ہے۔ شام کے ٦ بج گئے تھے۔ میں گھر پہنچا تو وہ بیڈ روم کی چادر تبدیل کر رہی تھی۔

◘◘

'تو آ گئے آپ......' ناہید گنگناتے ہوئے ٹھہر گئی۔ غور سے کمال یوسف کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ مگر کمال یوسف اس مسکراہٹ کے بارے میں جاننے لگا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے ایسی مسکراہٹ آندھی بن کر نازل ہونے لگی تھی۔ کمال نے مسکرانے کی کوشش کی تو ناہید نے ہنستے ہوئے کہا۔

'جانتے ہو کیا سوچ رہی تھی'

'نہیں۔'

'ہاں تم کیسے جان سکتے ہو' وہ آہستہ سے بولی۔ 'مگر سنو گے تو اچھل جاؤ گے۔'

'کوئی واہیات سی سوچ ہوگی۔'

'تم مردوں کو ایسی سوچ واہیات ہی لگے گی۔ مگر سوچتی ہوں......ایسا ممکن کیوں نہیں ہے۔'

’کیا ممکن نہیں ہے۔‘
ناہید ناز تیز چلتی ہوئی کمال یوسف کے برابر میں کھڑی ہوگئی۔ پیار سے ہاتھوں کو تھام لیا۔
’میں باہر سے آؤں۔ اور تم گھر سنبھالو۔‘
’مطلب—‘ کمال یوسف نے بے چارگی سے ناہید کو دیکھا۔ اگر تمہارا مطلب جاب سے ہے تو جاب تم بھی کرتی ہو۔ میں بھی۔ ہاں دونوں کے آنے اور جانے کے اوقات مختلف ہیں۔ لیکن تم کوئی ہاؤس وائف تو ہو نہیں۔‘
ناہید نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ چیخ رہی تھی۔
’تو مجھے ہاؤس وائف ہونا چاہئے تھا؟‘
’نہیں۔ میں نے یہ کب کہا۔‘
’ابھی کہا تم نے۔‘ وہ زور زور سے چلا رہی تھی— ’تم مردوں کا بس چلے تو بس ہمیں ہاؤس وائف بنا کر ہی رکھو۔ نمائشی گڑیا— جیسا تم صدیوں سے ہمیں بناتے رہے ہو۔ عورت گھر میں رہے۔ گھر کا کام کاج کرے۔ برتن صاف کرے۔ کھانا پکائے۔ جھاڑو دے۔ برتن صاف کرے۔ تمہارے بچے پیدا کرے۔ اور بچوں کی دیکھ بھال کرے۔ اور ایک دن گھس گھس کر مر جائے۔ یہی چاہتے ہو نا تم لوگ۔ پہلا گھر باپ کا۔ یہاں بھی اس کی کوئی شناخت نہیں۔ شناخت ہے تو باپ کی۔ شادی کی تو تمہاری شناخت۔ شوہر کی شناخت— عورت کے پاس اس کی اپنی شناخت کہاں رہ جاتی ہے— تم کو، تمہارے بچوں کو جیتے ہوئے وہ خود کو اس حد تک تقسیم کر دیتی ہے کہ زیرو رہ جاتی ہے۔ کم عمری میں ڈھل جاتی ہے۔ جسم پر چربی چھا جاتی ہے— عورت مردوں کے استعمال کے لیے نہیں بنائی گئی۔ مگر اس دنیا میں یہی ہوتا رہا ہے۔ تمہاری کتابوں میں لکھا ہے کہ عورت تم کو خوش کرے۔ مگر کمال یوسف، میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں۔ اس لیے تمہیں مجھے خوش رکھنا ہوگا اور یہ بات تمہاری آئندہ کی ڈیوٹی میں شامل ہوگی۔‘
ناہید ناز ہنس رہی تھی— ’دونوں خدا کی مخلوق۔ ایک مرد ایک عورت۔ لیکن تم لوگوں نے کیا بنا دیا عورت کو۔ تمہاری حکومت کے ختم ہونے کے دن آ گئے ہیں۔ اور اسی لیے میں سوچ رہی تھی۔ تم سے کہوں۔ نوکری سے استعفیٰ دے دو۔‘
’استعفیٰ دے دوں‘ کمال یوسف زور سے چلایا— ’مگر کیوں؟‘
ناہید ناز نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ مسکرائی— میں چاہتی ہوں۔ تم گھر سنبھالو۔ گھر کی چادریں ٹھیک کرو۔ پاشا کو دیکھو۔ جانتے ہو جب گھر پر میرا پہلا رشتہ آیا تھا تو لڑکے کی ماں بولی۔ آپ کی لڑکی کیا کرتی ہے۔ میری پڑھائی کے بارے میں جاننے کے بعد اس کی ماں کا خیال تھا۔ اتنی پڑھائی کافی ہے۔ پڑھ کر کیا نوکری کرنی ہے۔ اللہ کا دیا ہوا میرے گھر میں سب کچھ ہے۔ لڑکی کو تو خانہ داری آنی چاہئے۔ سلائی کڑھائی، کھانا پکانا...... تب تک میرے تن بدن میں آگ لگ چکی تھی۔ کمرے میں ابو امی دونوں موجود تھے۔ میں نے پلٹ کر اس عورت سے پوچھا...... تب تو آپ نے اپنے بیٹے کو یہ سب سکھایا ہوگا— وہ میری بات کی تہہ تک نہیں جا سکی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ کیا......؟
’یہی خانہ داری، سلائی، کڑھائی؟‘
’کیوں؟‘
’کیونکہ میں یہ سب نہیں جانتی۔ اللہ کا دیا ہوا یہاں بھی سب کچھ ہے— آپ کا بیٹا آرام سے رہے گا۔ ماشاء اللہ اتنا پڑھ گیا ہے تو اسے کسی کام کی کیا ضرورت ہے۔ میں ہوں نا...... اور ہاں...... اُسے ناچ بھی سکھا دیجئے گا۔ کبھی کبھی میں اس کا مجرا بھی دیکھنا چاہوں گی......‘
ناہید ناز کا چہرہ سلگ رہا تھا۔ کمینہ ہے تم مردوں کا سماج۔ لڑکی پڑھ لکھ کر بھی بیکار۔ پڑھنے لکھنے کے بعد بھی اسے گھر کی نوکری دے دیتے ہو تم لوگ۔ نوکرانی بنا دیتے ہو...... جانتے ہو اس کے بعد کیا ہوا۔ وہ عورت غصے میں بکتی چیختی ہوئی بیٹے کو ساتھ لے کر چلی گئی تو ابو نے مجھ پر ہاتھ اٹھا دیا۔ میں غصے میں جل رہی تھی۔ میں نے ان کے ہاتھ کو تھام لیا۔ اور صرف ایک جملہ کہا۔ آئندہ یہ مت کیجئے گا جو ابھی کیا ہے۔ میرا تماشہ بنائیں گے تو خود تماشہ ہو جائیں گے......‘
ناہید ناز نے آگے بڑھ کر سوئے ہوئے پاشا کی طرف دیکھا۔ وہ خود کو سلگتے ہوئے جزیرے سے واپس لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے

چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

'صبح سے سوچ رہی تھی۔تم آؤ گے تو کہوں گی۔نوکری چھوڑ دو۔ باشا اب بڑا ہوگا۔اُسے باپ کی ضرورت ہوگی۔مرد زیادہ اچھے شیف ہوتے ہیں۔فائیواسٹار ہوٹل کو ہی لو۔سارے بڑے شیف مرد ہیں۔میں جانتی ہوں تم مجھ سے اچھا کھانا بنالیتے ہواورتم عورت سے بہتر گھر چلا کر دکھاؤ گے...... ہے نا کمال.....'

کمال یوسف حیرانی سے ناہیدناز کی باتیں سن رہا تھا۔اس نے مسکرانے کی کوشش کی تو مسکراہٹ غائب تھی۔چہرہ آڑی ترچھی لکیروں سے پُر تھا۔ناہیدناز نے قریب آ کراس کے دونوں ہاتھوں کواپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

'ایسا ہونا چاہئے نا......ایک پوری زندگی تم مرد ہمارے نام کردو۔ ہمارے بھروسے جیو۔ ہمارے ساتھ، ہماری رہنمائی میں۔ ہماری خوشی تمہاری خوشی ہواور جب ہم زیادہ خوش ہوں تو تمہیں شاپنگ کرائیں۔فلم دکھانے لے جائیں۔شادی بیاہ کے موقع پر تمہیں نئے نئے لباس میں ساتھ لے جائیں۔ اپنی دوستوں سے تمہارا تعارف کرائیں اور واپسی میں، تمہیں آئس کریم بھی کھلائیں...... آخر ایسا کیوں ممکن نہیں ہے کمال......؟'

'میں تمہیں ایک خبر دینے والا تھا......' کمال نے اس سلسلے کو یہیں روکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

'کیسی خبر؟'

'تم تو میرے آتے ہی شروع ہوگئی۔تم نے مہلت ہی کہاں دی۔'

'تم نے مہلت مانگی ہی کب۔'ناہیدناز نے مسکرانے کی کوشش کی۔

اس درمیان باشا اٹھ گیا تھا۔اس نے باشا کو گود میں اٹھالیا۔وہ پھر سے عورت بن گئی تھی۔اب وہ باشا کو تیار کررہی تھی۔ پہلے اس نے باشا کو بوتل سے دودھ پلایا پھراسے نئے کپڑے پہنانے لگی۔اس درمیان وہ آہستہ سر میں کچھ گنگنارہی تھی۔کمال یوسف بالکنی میں آیا تو رات کی سیاہی آسمان پر چھاچکی تھی......ذہن میں پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔مشکل یہ تھی کہ اگر وہ ذہنی اورنفسیاتی طور پر بیمار تھی تو وہ یہ بھی کہہ نہیں سکتا تھا کہ چلو، ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ناہید کسی بھی طور پر خود کو بیمار سمجھنے کا جرم نہیں کرسکتی تھی۔اس ناہید کو سمجھنا مشکل تھا۔وقت کے ساتھ مردوں سے نفرت کا جذبہ شدید ہوا جارہا تھا۔یہ ایسی بات تھی جس کا اظہار وہ اپنے کسی مرددوست سے بھی نہیں کرسکتا تھا۔مگر کمال یوسف کو یقین تھا کہ دلی میں جس مصنف سے ملاقات ہوئی تھی، وہ کسی حد تک اس معاملے میں اس کی مدد ضرور کرسکتا ہے— کمال کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ ناہید کواس کی اطلاع کیسے دے— مگر اطلاع تو بہر صورت دینی تھی۔دوسری صورت میں مصنف کی اچانک آمد کو ناہید کسی سازش کا حصہ بھی سمجھ سکتی تھی۔

کمال یوسف نے اپنا جائزہ لیا۔کیا وہ ناہید سے خوفزدہ ہے—؟اوراس کا جواب زیادہ مشکل نہیں تھا۔محبت کبھی کبھی خوفزدہ بھی کردیتی ہے۔

یا زندگی جینے کے عمل میں محبت ہر بارخوفزدہ کرتی ہے۔

کمال یوسف کو ناہید کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔بالکنی میں اس کے سامنے والی کرسی پر ناہید بیٹھ گئی۔سیاہ بدلیوں کی طرف دیکھتی ہوئی وہ اس طرف پلٹی۔ہونٹوں پر معصوم سی مسکراہٹ تھی۔

'تم ایک اچھے مرد ہو......'

'مرد یا شوہر؟'

'شوہر؟'اس نے برا سا منہ بنایا۔یہ ایک دقیانوسی سالفظ ہے۔مجازی خدا،شریک حیات،شوہر...... یہ الفاظ مجھے کاٹ کھانے کودوڑتے ہیں۔' وہ مسکرائی۔ناراض تو نہیں ہوگے اگر یہ کہوں کہ......'

'کیا......'

'تم ایک اچھی بیوی ہو......' ناہید نے اپنے ہی اس جملہ پر قہقہہ بلند کیا......تم میری ہر بات مان لیتے ہو......' وہ مسکرا رہی تھی......سنو نا کمال......ڈکشنری سے لفظوں کو تبدیل کردیتے ہیں۔عورت شوہر کے تصور میں بہتر لگتی ہے۔اورمرد بیوی کے روپ میں۔کیوں؟'

'بیوی ہونا تمہیں پسند نہیں؟'

’بالکل بھی نہیں‘

’اور شوہر ہونا۔‘

ناہیدزور سے ہنسی......میں تمہاری شوہر ہی تو ہوں......‘

’قواعد کی رو سے مجھے تمہارا شوہر ہونا چاہیئے۔‘

’چلو، قواعد کو بھی بدل دیتے ہیں۔‘

’تمہارے لیے بدل دینا اتنا آسان کیوں ہے ناہید؟‘

’یہی سوال تم سے کروں تو تمہارے لیے یہ سب سننا مشکل کیوں ہے—؟ بولو؟ ہر وقت......محبت کے موقعوں پر بھی ساتھ میں ایک چور مرد کو لے کر کیوں گھومتے رہتے ہو تم لوگ؟ کیوں ناز کرتے ہو اپنی مردانگی پر اس قدر، یہ مت بھولو کہ کائنات میں عورت کا تصور نہ ہوتا تو تمہارے پاس فخر کرنے لائق یہ مردانگی بھی نہ ہوتی— پھر کیوں ڈھول پیٹتے رہے ہو اس مردانگی کا......‘

کمال خاموش تھا۔ ناہید نے ابھی اس لمحہ حقیقت کا اعتراف کیا تھا، آخر جس فلسفہ کو وہ بیان کر رہی تھی اسے دونوں کے مابین ہونے والا مکالمہ سمجھ لیا جائے تو ظاہر ہے غصہ یا ناراضگی کی کوئی صورت ہی نہ پیدا ہو۔ ہاں مردانگی سے جوڑ کر دیکھا جائے تو ناہید ناز کی گفتگو سے نکلا ہوا یہ جملہ زہر تھا— مرد کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنی مردانگی کے ساتھ جیتا ہے۔

’ہاں......تم کچھ بتانے والے تھے۔‘ ناہید کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

نیلے آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے چھا گئے تھے......دور پہاڑیوں کے اردگرد روشنیوں کا جال بچھا ہوا تھا......

کمال نے ناہید کی طرف دیکھا......’تم کو وہ مصنف یاد ہے......؟‘

’جو دلی میں ملا تھا......؟‘

’ہاں۔‘

’مجھے پسند نہیں آیا تھا۔‘

’کیوں۔؟‘

’پندرہویں صدی کی باتیں کرتا تھا۔‘

’اردو میں لکھنے والے ابھی بھی پندرہویں صدی میں جی رہے ہیں۔‘

’تو مت لکھیں۔ کس نے کہا ہے لکھنے کے لئے۔‘

’تبدیلی اچانک تو نہیں آتی ناہید۔‘

’مشکل یہ ہے کہ کوئی تبدیلی چاہتا بھی تو نہیں— وہی پندرہویں صدی کی فکر۔ کیا مرد وہی رہ گیا ہے—؟ کیا دنیا وہی ہے—؟ سب کچھ بدل گیا ہے تو نئی دنیا کا تعاقب تو کرنا چاہیئے نا......‘

’ان کی نظروں میں ابھی بہت کچھ نہیں بدلا ہے— جیسے وہ نہیں چاہتے کہ بہت کچھ بدل جائے۔ ابھی بھی بہت سے گھروں کے بچے پزا اور برگر کی جگہ گھر کی روٹیاں ہی پسند کرتے ہیں۔ کولا بوتل کی جگہ انہیں پانی ہی پسند ہے— وہ زیادہ اڑان نہیں چاہتے۔ اور اپنی محدود دنیا میں خوش رہتے ہیں۔‘

’ہونہہ— ‘ ناہید ناز نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا......

’میں پھر کہتی ہوں۔ وہ آدمی مجھے ذرا بھی پسند نہیں آیا تھا۔‘

’لیکن یاد ہے، تم نے اُسے نینی تال آنے کی دعوت دی تھی۔‘

میں نے نہیں۔ تم نے دی تھی۔ میں نے دبے لفظوں میں کہا تھا......‘

’دبے لفظوں میں لیکن کہا تو تھا—‘

’اس کا کیا مطلب؟‘
’وہ آرہا ہے۔ وہ کل ہمارے گھر ہوگا۔ وہ ہمارے یہاں ہی ٹھہرے گا۔‘‘
’ہمارے یہاں؟‘
ناہید زور سے چیخی۔ اس کا لہجہ بدل چکا تھا۔
’جھوٹ مت بولنا۔ اُسے تم نے بلایا ہے نا......‘
’میں کیوں بلاؤں گا۔‘
’قسم کھاؤ، کہیں یہ تمہاری کوئی سازش تو نہیں۔؟‘
’سازش کیوں ہوگی۔‘
’اسے تم نے بلایا ہے۔ اور میرا دل کہہ رہا ہے۔ تم نے اس کو جان بوجھ کر بلایا ہے۔‘
کمال یوسف نے زور سے کہا— ’میرا قصور یہ ہے کہ جب اس نے آنے کے لیے کہا تو میں منع نہیں کرسکا۔ مجھے جھوٹ بولنا پسند نہیں آیا۔‘
وہ یہیں ٹھہرے گا؟‘
’ہاں۔‘
’کھانا کون بنائے گا۔ تم؟‘
’نہیں۔ باشا کے لیے جو گورنیس آتی ہے— رکمنی— وہ اپنی چھوٹی بہن کو بھیج دے گی۔ وہ سارا دن ہمارے پاس ہی رہے گی۔‘
’ہونہہ۔‘
ناہید گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ وہ دیر تک آسمان کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس سے مخاطب ہوئی۔
’ٹھیک ہے۔ تمہارے مہمان۔ تم ہی سنبھالنا۔ لیکن ایک بات کہہ دیتی ہوں۔ اگر مجھے یہ تمہاری سازش نظر آئی تو......!
’سازش کیوں ہوگی۔؟‘
’یہ تم زیادہ بہتر جانتے ہو۔ مگر سازش ہوئی تو میں ایک سکنڈ اس گھر میں نہیں ٹھہروں گی۔ اور ہاں تمہیں مجھ سے......‘
ناہید ناز کے چہرے پر سختی کے آثار تھے۔ تمہیں مجھ سے خلع لینا ہوگا۔‘
’خلع عورتیں لیتی ہیں۔ مرد طلاق دیتا ہے۔‘
’واہیات۔ معنی بدل چکے۔ طلاق دینا ہوگا تو میں دوں گی— تم مجھ سے خلع لوگے۔‘
وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
آسمان میں تیرتے ہوئے بادل دور چلے گئے تھے۔ آسمان پر چاند روشن تھا۔ کمال یوسف کے دل و دماغ میں چلنے والی آندھیاں تیز ہوگئی تھیں۔

◘◘

دیر تک کمرے میں خاموشی پسری رہی۔ بطور مصنف مجھے ناہید ناز سے ہمدردی تھی۔ اب مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے ماضی کی کئی کڑیاں ایسی رہی ہوں گی، جسے وہ آج تک سب سے چھپاتی آئی ہے۔ ممکن ہے دلی گینگ ریپ کے حادثے نے ناہید ناز کے اندر کی اس عورت کو جگا دیا ہو، جو خوفناک سطح پر مردوں سے نفرت رکھتی تھی۔ اب ناہید ناز سے ملنا اور ان حقیقتوں کی تہہ تک جانا میرے لئے ضروری ہوگیا تھا— اور اس کے لیے ضروری تھا کہ ناہید ناز کو دوست بنایا جائے اور یہ کافی مشکل کام تھا۔ اور اس کے بعد بھی یہ کہنا مشکل تھا کہ ناہید ناز ماضی کے کھنڈرات سے ان زخمی یادوں کو زبان تک لاتی ہے یا نہیں—
باشا کو کھلانے والی گورنیس اپنے ساتھ اپنی بہن کو لے کر آئی تھی۔ جو ایک پیاری سی لڑکی تھی۔ گورنیس نے کہا۔
’کل سے لاجو صبح سے شام تک سارا کام کردیا کرے گی۔ جیسا کھانا چاہیں گی۔ ویسا بنالے گی۔‘

ناہید نے پوچھا۔ 'تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے؟'

کیوں؟'

'مرد زیادہ اچھی دیکھ بھال اور زیادہ اچھا کھانا بناتے ہیں۔'

'نہیں، بھائی نہیں ہے۔'

'چلو کوئی بات نہیں۔'

لاجو کے آنے سے چائے پینے کی آسانی ہوگئی تھی۔ میں نے محسوس کیا، کمال یوسف کے چہرے پر ناراضگی بھری شکن موجود تھی—اس کے برخلاف ناہید ناز اپنے معمول پر تھی۔ کبھی گاتی گنگناتی ہوئی، کبھی کمال کا نام لے کر پکارنا......کبھی باشا کو گود میں لینا......کبھی لاجو کو کچن کے بارے میں کچھ سمجھانا......جبکہ کمال یوسف کو چہرے کے تاثرات چھپانے میں خاصہ دقت پیش آرہی تھی۔

(3)

وحیدہ کا اندنوں روز کا معمول بن گیا تھا۔ صبح سویرے اٹھ جاتی۔ پھر ابو امی کا بی پی اور شوگر چیک کرتی۔ دوا کھلاتی......اس کے بعد دونوں کو بیٹھا کر بھگوت گیتا سناتی۔ ناگارجن اور کوشلیا کے کہنے پر قرآن شریف کی قرأت کرتی اور آسان لفظوں میں مطلب بھی بتاتی جاتی......

'آج صبح کچھ نئے پرندے آئے تھے۔'

'تمہیں۔ کیسے معلوم کہ نئے پرندے تھے۔'

'میں نے بتایا تھا نا کہ یہاں کے پرندوں سے میری دوستی ہوگئی ہے۔' ناگارجن آہ بھر کر کہتے— 'پرندے کب کس کے دوست ہوئے ہیں بیٹی۔'

'آپ دوست بنا کر تو دیکھیے ابو۔'

کوشلیا ایسے موقعوں پر بس مسکرا کر رہ جاتی۔

بی پی اور شوگر چیک کرنے کے بعد وحیدہ امی اور ابو کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئی۔ اس نے ہاتھ میں گیتا لے کر گیتا کا پاٹھ کرنا شروع کیا۔ سر پر عقیدت سے آنچل ڈالا......

'یہ آتما نہ تو پروچن سے پراپت ہوسکتی ہے، نہ بدھی سے، اور نہ سننے سے ہی۔ یہ جس کو ورن کر لیتا ہے، اسی کے لیے یہ پرماتما اپنے روپ پرکٹ کر دیتی ہے۔ میں ایشور ہوں...... میں سوادھین ہوں...... اور دوسروں کا پیتا بھی میں ہی ہوں۔ میں سدھ ہوں۔ میں سویم ہی سدھ

ہوں......میں بلوان ہوں......اس لوک میں میرے سدرش دوسرا کون ایسا ہے، جس کو اپنے دم پر سارا ویبھو پراپت ہوا ہو......'

'ایشور کی مایا بھی عجیب— ناگارجن آہستہ سے بولے......ایشور ان سبھی کتابوں میں اپنے رہسیہ کے ساتھ اپنے گن کی تعریف کرتا ہے۔ تم سچ کہتی ہو بیٹی۔ فرق صرف ہم میں ہے۔ مسلمانوں کا ایشور اور ہندوؤں کا ایشور الگ کہاں ہے۔ اب بند کر دو بیٹی۔ دوپہر میں تم سے قرآن پاک سنیں گے۔ کیوں کوشلیا۔ وحیدہ کے ساتھ باہر چلیں، پرندوں کو دوست بنانے۔'

'بہتر ہے کہ آپ ہی جائیں۔'

ناگارجن وحیدہ کے ساتھ باہر آ گئے۔ پہاڑیوں کے درمیان سے جھانکتے ہوئے آسمان کا حسن ہی اور تھا۔ ناگارجن آہستہ آہستہ وحیدہ کے ساتھ چلتے رہے۔ وہ جیسے گفتگو کا بہانہ تلاش کر رہے تھے۔ بڑا بیٹا امریکہ ہے۔ گھر گرہستی بسا لی۔ چھوٹا سنگاپور میں۔ کیوں ہوتا ہے مذہب؟ وہ جیسے خود سے سوال کر رہے تھے۔ کیا چھوٹے بیٹے کو وحیدہ سے بہتر کوئی لڑکی مل سکتی ہے؟ کیا وحیدہ اس کے لیے تیار ہو جائے گی۔ کیا ان کا آزاد خیال بیٹا اس کے لیے تیار ہوگا۔

وہ چلتے رہے......وحیدہ کی مسکراتی آنکھیں پرندوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ آسمان پرندوں سے خالی تھا۔ ناگارجن نے آہستہ سے پوچھا......' کبھی کبھی ہم انسان ہونے کے احساس سے تھک جاتے ہیں اور پالتو جانوروں میں، پرندوں میں زندگی کی کرنیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ یہاں ان پہاڑی علاقوں میں کتنے ہی ایسے بزرگ مل جائیں گے بیٹی، جن کے بچے انہیں چھوڑ کر غیر ممالک میں بس گئے۔ آہستہ آہستہ آنا جانا کم ہوا۔ پھر یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا......'

'پھر......' وحیدہ نے چونک کر ناگارجن کی طرف دیکھا......

'پھر پرندے آ گئے نا......' ناگارجن ہنسے ان کے گھر جاؤ تو وہاں پنجرے ملیں گے۔ طوطا...... مینا......مرغے مرغیاں۔ بلیاں...... کتے...... اور ان کے درمیان ایک سب سے بڑے پنجرے میں وہ مل جائیں گے۔'

'بڑا سا پنجرہ؟'

'گھر۔ گھر بھی تو پنجرہ ہوتا ہے۔ جب تک گھر میں آبادی ہے...... بچے ہیں۔ زندگیاں ہیں۔ گھر گھر ہے۔ لیکن بچے بھی تو پرندے ہوتے ہیں۔ پرندے اڑ گئے تو گھر خالی پنجرہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔'

'میں سمجھ سکتی ہوں ابو۔'

'کاش تم اس سے زیادہ بھی سمجھ سکتی......اور میرے بیٹے بھی۔ ناگارجن کہتے کہتے رک گئے۔ دیکھو نا بیٹی......آج میں آیا ہوں تو پرندوں سے آسمان خالی۔ پرندے نہیں آئے۔ تم اکیلے آتی ہو تو پرندے بھی آتے ہیں۔ پرندے انسان کی تنہائی سمجھتے ہیں۔ جب تم تنہا ہوتی ہو تو آ جاتے ہیں...... پرواز کرتے ہوئے......آج مجھے دیکھا تو سوچتے ہوں گے، میں کیوں آؤں؟ پرندے بھی حسد رکھتے ہیں بیٹی......'

'نہیں ابو......، وحیدہ چونک کر بولی۔ جب ہم کمرے میں تھے۔ فائر کی آواز ہوئی تھی۔ آپ نے سنی۔ مجھے یقین ہے پرندوں کا غول فائر کی آواز سن کر چھپ گیا۔ پرندے پھر آ جائیں گے......آ......آ......آ......'

وحیدہ ننھی سی بچی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر پرندوں کو آواز دے رہی تھی......،

ناگارجن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ غور سے وحیدہ کو دیکھ رہے تھے......

'آ......آ......آ......'

پہاڑیوں کے درمیان سے نیلا آسمان مسکرا رہا تھا......

'آ......آ......آ'

ناگارجن سب کچھ بھول کر معصوم سی وحیدہ کو دیکھ رہے تھے، جو اس لمحے ایک چھوٹی سی بچی میں تبدیل ہو گئی تھی......

'نہیں آئیں گے بیٹی...... ناگارجن آہستہ سے بولے......انسانوں سے تھک ضرور گئی ہو لیکن...... پرندوں کی جگہ انسانوں کو دوست بنا کر دیکھو......انسان اچھے بھی ہوتے ہیں......'

پھر وہ رکے نہیں، آگے بڑھ گئے......

اس سے پہلے کہ وحیدہ ان کے الفاظ پر غور کرتی، ہوا میں اڑتا ہوا ایک پرندہ وحیدہ سے ذرا سے فاصلے پر، آہنی گیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا......

(4)

میں نے کمال یوسف اور ناہید ناز کی زندگی کے کم و بیش اُن واقعات پر غور کرنا شروع کیا، جن سے میں واقف ہو گیا تھا اور میں بار بار اسی نتیجہ پر پہنچ رہا تھا کہ کچھ ایسی باتیں ضرور ہیں جن کا گہرائی سے ناہید کی پچھلی زندگی سے تعلق رہا ہے۔ میں کمال یوسف کو اس بات کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا کہ میری موجودگی میں وہ کوئی ایسی دل شکن بات نہ کہے جس سے ناہید ناز خفا ہو کر اس پر پاگلوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ میرے لیے اس کی زندگی کے حال جاننے کا یہ بہتر موقع ہوتا۔ مگر جیسا کہ مجھے کمال نے سمجھایا، اس کا دوسرا پہلو بھیانک بھی ہوسکتا ہے۔ اور اس حد تک بھیانک ہوسکتا ہے کہ ہم کسی بھی خوفناک نتیجہ کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ کیا ثقافت اور مذہب کے امتزاج کا جو نیا رویہ عورتوں میں پیدا ہوا ہے، وہ مردوں سے نفرت کا ہے—؟ ہندوستان سے پاکستان تک یہ جذبہ شدت اختیار کرتا ہے تو عورت پہلے خدا کی منکر ہوتی ہے پھر مردوں کے لیے اس کا جذبۂ انتقام سونامی بن جاتا ہے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم ٹیرس پر تھے۔ لاجو وہیں چائے لے کر آ گئی تھی۔ آسمان میں چاند روشن تھا۔ ہوا سرد تھی اور جسم کو چھوتے ہوئے گزرتی تو اندر تک سرد لہر پھیلتی چلی جاتی۔ میں نے ناہید کی طرف دیکھا۔

’آپ کو ڈر لگتا ہے؟‘

’نہیں۔‘

’بچپن میں تو لگتا ہوگا؟‘

’ہاں۔ بچپن میں ہمیں جان بوجھ کر ڈرایا جاتا تھا۔ تاکہ لڑکیاں اپنی مضبوطی اور اڑان سے الگ ہوں اور خوفزدہ رہیں۔ گھر کی کھونٹ سے پالتو جانوروں کی طرح بندھی ہوئی۔‘

’کوئی ایسا واقعہ......، میں نے ترچھی نظر سے کمال یوسف کو دیکھا۔ وہ پہاڑیوں کی طرف بے نیازی سے دیکھ رہا تھا۔

ناہید ناز کا چہرہ شکن آلود تھا۔ ہزاروں واقعات ہیں...... کہتے کہتے وہ ٹھہر گئی...... میری طرف دیکھا۔ لیکن کیوں سناؤں آپ کو...... اور آپ کو

میری زندگی کے واقعات میں اتنی دلچسپی کیوں ہے......'

آنکھوں میں پرچھائیوں کا رقص تیز ہوا تو اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ وہ رات کی سیاہی سے آنکھیں ملانے کی کوشش کر رہی تھی۔

'میں خوفزدہ کب نہیں تھی۔ پیدا ہوتے ہی خوفزدہ تھی۔ اماں کہتی تھیں کہ میں ذرا ذرا سی بات پر ڈر جاتی تھی۔ گھر میں آسیب ہی آسیب بھرے تھے۔ کہتے تھے رات کے وقت گھر میں شہید بابا نکلتے ہیں۔ وہ سارے گھر میں گھومتے ہیں۔ رات میں ذرا سی آہٹ ہوتی تو امی ہونٹوں پر چپی رکھ کر کہتیں۔ شہید بابا......ایک بڑا سا باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانہ کے پاس ایک دالان، جسے ان دنوں پتلکی دالان کہا جاتا تھا۔ یہاں نعمت خانہ بھی تھا۔ اماں کہتی تھیں......اسی دالان میں کہیں شہید بابا کا مزار ہے۔ ایک بار اماں نے بتایا......بقرعید کا موقع تھا۔ کباب کی تیاری کے لیے اسی پتلکی دالان میں اماں نے چھوٹے چھوٹے اینٹوں کو گھیر کر کوئلہ روشن کیا تو اچانک جیسے دھما کہ ہوا......سرخ کوئلے اماں کے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے — اماں نے کہا، انہیں یقین ہے، یہ قبر اسی جگہ ہونی چاہئے۔ یہ شہید بابا کون تھے، یہ کہانی کبھی تفصیل سے بتائی نہیں گئی۔ کوئی اس کہانی کو ۱۸۵۷ کے غدر سے جوڑ دیتا۔ کوئی کہتا، یہاں آزادی کی جنگ لڑی گئی تھی۔ جب انگریزوں کا قافلہ رات کے وقت حملہ کرنے آیا تو اچانک کسی نے دیکھا......گھوڑے پر ہاتھ میں شمشیر لیے کوئی اکیلا فوجی ان کی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ قریب سے دیکھا تو اس فوجی کا سر ہی نہیں تھا۔ انگریز فوج اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ بھاگ کھڑی ہوئی......ایسے تھے شہید بابا......بس رات میں نکلتے تھے۔ کہتے ہیں وہ کھڑاؤں پہنتے تھے۔ اس لیے ان کے چلنے سے کھٹ کھٹ کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔'

ناہید ناز کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا......لیکن آسیب کہاں نہیں تھا۔ برآمدے میں امرود کا پیڑ تھا اس پر بھی آسیب تھا۔ بالائی چھت سے سیم کی بیلیں دور تک چلی گئی تھیں۔ کہتے ہیں وہاں بھی آسیب کا ڈیرہ تھا۔ گھر میں سیڑھیوں سے اوپر کا حصہ اکثر ویران رہتا۔ چھت کے بارے میں ہزاروں کہانیاں مشہور تھیں۔ دن میں یہی چھت گلزار رہتی۔ چاول اور گیہوں پسرے ہوتے — دھلے ہوئے کپڑے یہیں چھت پر الگنی پر ڈالے جا رہے ہوتے۔ لیکن رات گئے چھت سے الو کی منحوس آوازیں گونجا کرتیں اور نانی اماں پوچھنے پر ڈانٹ دیا کرتیں......ان آوازوں کو نہیں سنتے ہیں پگلی — آسیب باہر بھی تھے۔ آسیب گھر میں بھی تھے۔ آسیب پائخانے میں تھے اور ہمارے سونے والے کمروں میں بھی — اور پھر ایک دن بچپن سے الہڑپن کی دنیا میں آتے آتے ہم بھی آسیب ہو گئے۔ اماں نے مولوی صاحب کو بلایا تھا۔ مولوی صاحب نے دور سے ہی کہہ دیا۔ اس پر تو شاہ جنات سوار ہیں۔

'ہائے اللہ۔ پھر اس کی شادی کیسے ہوگی؟'

سوائے مولوی صاحب کے گھر کے ہر آدمی پر آسیب سوار تھا۔ گھر میں مولویوں کی عزت تھی اور آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کیونکہ یہ مولوی جنات بھگایا کرتے تھے۔ ان کے قبضے میں پریاں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے ناخنوں پر اسکرین بنا ہوتا تھا اور اسکرین پر اچھے برے، شیطان، جناتوں کی تصویریں بن جایا کرتی تھیں۔ اور ان بلاؤں کو ٹالنے کے لیے اماں اور نانی اماں ان کے کرتے کی جیبیں بھرا کرتی تھیں......جبکہ مجھے سب سے بڑے آسیب یہی مولوی صاحبان لگتے تھے۔ لیکن پیدا ہوتے ہی ہمارے ہونٹ سی دیئے گئے تھے۔ اور ہمیں کچھ بھی بولنے کی اجازت نہیں تھی۔

ناہید ناز بولتے بولتے اچانک زور سے چیخی — کچھ اور سننا ہے آپ کو۔ ذائقہ مل رہا ہے ہماری باتوں سے۔ مزہ آ رہا ہے۔ میں اب کچھ بھی نہیں سناؤں گی۔ اور سن لیجئے۔ یہاں مجھے ڈر نہیں لگتا۔ میں ڈر کو اس جونا گڑھ کے آسیبی گھر میں چھوڑ آئی ہوں......وہ ہنس رہی تھی......اب تو میں خود ایک آسیب ہوں۔ یقین نہ ہو تو کمال سے پوچھ لیجئے۔ مجھے اکثر احساس ہوتا ہے کہ کمال مجھ سے خوفزدہ ہے۔ کیوں کمال......؟

'نہیں تو......، کمال نے جلد بازی میں کہا......

'دیکھا......، ناہید نے قہقہہ لگایا۔ پہلے نہیں لیکن اب یہ ڈرنے لگا ہے مجھ سے۔ اور مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مردوں کا ڈرنا اچھا شگن ہے۔ برسوں ان مردوں نے ہمیں ڈرا ڈرا کے رکھا ہے۔ اب انہیں ہم سے بھی ڈر لگنا چاہئے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔

وہ تیزی سے اٹھی اور ٹیرس سے اپنے کمرے کی طرف غائب ہو گئی۔ کمال یوسف گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ جبکہ میں ناہید ناز کی ذہنی کیفیت پر مسلسل غور کر رہا تھا۔ آج چھپانے کے باوجود جونا گڑھ کا تذکرہ ایک بار پھر آ گیا تھا۔ اور یہ حقیقت سامنے آ گئی تھی کہ جونا گڑھ میں جو اذیتیں ناہید کے حصے میں آئی ہیں، اب اس کا ردعمل باغی ناہید کی شکل میں سامنے آ رہا ہے۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین تھا کہ یہ اذیتیں کچھ اتنی بھیانک رہی ہوں گی

کہ ناہید محض مردوں کو سزا دینے کے تصور سے ہی خوش ہو جاتی ہے۔ زندگی نے جو بھیانک سلوک اس کے ساتھ ماضی میں کیا ہے، اب وہ اسی کا انتقام لے رہی ہے۔ ممکن ہے یہ شادی بھی اسی انتقام کا حصہ ہو۔ یا یہ ممکن ہے کہ شادی کے بعد آہستہ آہستہ کمال جیسے مرد کی موجودگی میں ان مردوں کی کہانیاں بھی کھلتی چلی گئی ہوں، جو کبھی اس کی زندگی میں آئے ہوں۔ جب آپ اس طرح کے دو لوگوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو بھیانک پہلو پر سب سے پہلے آپ کی نظر پڑتی ہے۔ ممکن ہے کمال ایک متوازن شوہر رہے ہوں اور تجزیہ کے طور پر ناہید کے سامنے وہ مرد اچانک آ گئے ہوں، جنھوں نے کبھی، کسی دور میں اس کی روح تک کو زخمی کیا ہو اور آہستہ آہستہ یہ کہانیاں اتنی پھیل گئیں کہ کمال کی خوبیوں پر یہ خوفناک حادثے حاوی ہوتے چلے گئے۔

مگر کہانی کا اصل سرا ناہید ناز کے پاس تھا۔ اور میرے لیے اب اس کی کہانی کو جاننا پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو گیا تھا۔

(5)

لاجو سترہ سال کی ایک ہنس مکھ لڑکی تھی۔ پرانی گورنیس رکمنی کی چھوٹی بہن...... ناہید کا خیال تھا کہ لاجو جلد ہی سب کچھ سیکھ جائے گی۔ رکمنی اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی اور اس درمیان گھر اور باشا کا خیال لاجو کو ہی رکھنا تھا۔ باشا کے ساتھ اس نے کچن بھی سنبھال لیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ اب اس کی بڑی بہن کو چھٹی مل گئی تھی۔ ناہید کی موجودگی میں لاجو اکثر خود کو قابو میں رکھتی تھی لیکن ناہید کے ذرا بھی اوجھل ہوتے ہی وہ کمال سے قربت حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ممکن ہے میرا وہم ہو لیکن نوخیز عمر کے اپنے تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ اور میرا خیال تھا، یہ بات ذرا بھی ناہید کے علم میں آئی تو لاجو پر پہاڑ ٹوٹ سکتا تھا۔

باہر لان میں ہم نے صبح کا ناشتہ کیا۔ مخملی گھاس پر پلاسٹک کی رنگین کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دھوپ کی سنہری کرنوں کو دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ پہاڑیوں کے درمیان سے سورج کی کرنیں وادی گلپوش کو سونے کے رنگوں میں تبدیل کر رہی تھیں۔ میں نے نینی تال کے بارے میں جاننا چاہا تو بریڈ میں مکھن لگاتی ہوئی ناہید نے مسکرا کر کہا۔ یہاں کے لوگ نینا دیوی کے بھکت ہیں۔ اور یہ نینا دیوی شیو کی پتنی پاروتی ہیں۔ اس کے بعد ناہید نے وہ کہانی چھیڑ دی، جو عرصۂ قدیم سے یہاں کے باشندے سنتے چلے آئے ہیں۔ دکش پرجاپتی کی بیٹی اوما کی شادی شیو سے ہوئی تھی۔ لیکن دکش، شیو کو پسند نہیں کرتے تھے۔۔ ایک بار دکش پرجاپتی نے یگیہ کیا اور سارے دیوتاؤں کو بلایا۔ لیکن اوما اور شیو کو یگیہ میں شامل ہونے کی دعوت نہیں دی۔ اوما سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ وہ ہون کنڈ میں کود گئی۔ شیو کو جب احساس ہوا تو وہ اپنے رودر روپ (غصے) میں آ گئے۔ معافی مانگنے اور سمجھانے کے بعد شیو نے معاف کر دیا اور اوما کے جلے ہوئے جسم کو لے کر آسمانی سفر شروع کر دیا۔ جہاں جہاں اوما کے جسم کے حصے گرے، وہاں پر شکتی پیٹھ بنتے چلے گئے۔ اور یہ وہ مقدس جگہ ہے، جہاں اوما کے نین گرے تھے...... نین کے گرتے ہی یہاں تال بن گیا...... آج بھی یہاں کے باشندے نینا دیوی کی آرادھنا کیا کرتے ہیں۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر ناہید کو سمر ویلے اسکول جانا تھا۔ لاجو کو ضروری ہدایت دے کر ہم سے معافی مانگ کر وہ اسکول کے لیے روانہ ہو گئی۔

کمال یوسف کو منسٹری جانا تھا۔ لاجو بار بار باہر آ رہی تھی۔ میں اب اس کی آنکھوں کی چمک سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کمال میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس درمیان کمال نے جو کچھ بتایا...... وہ میرے لیے نیا تو نہیں تھا، مگر ناہید کے اندر چلنے والی کشمکش کو ان واقعات کے تناظر میں محسوس کیا جا سکتا تھا۔ کمال تیار ہونے چلے گئے تو میں واقعات کی کڑیوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کا کام کرنے لگا۔ اور بہتر صورت یہ ہے کہ میں اسی انداز میں واقعات آپ تک پہنچاؤں، جس انداز میں کمال نے مجھ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ کمال کے مطابق دلی سے آنے کے بعد ہی بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ ہر بار خود کو نرم کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر ناہید کی طرف سے دی جانے والی اذیتوں نے آہستہ آہستہ اسے ناہید سے دور کرنا شروع کر دیا تھا۔

▪▪

پہاڑیوں پر رات سو گئی تھی۔

باہر گھنا گہرا چھایا تھا۔ کھانے کے بعد تھوڑی سی چہل قدمی اور اس کے بعد کمال یوسف کمرے میں لوٹا تو ناہید لیپ ٹاپ پر جھکی ہوئی تھی۔ کمال سے آنکھیں چار ہوتے ہی ناہید کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

'تم میری ہر بات مانتے ہو نا......'

'ہاں۔ کیوں۔'

'آج بھی تم کو میری ایک بات ماننی ہوگی۔'

لیکن کون سی بات؟'

'پہلے وعدہ کرو مانو گے؟'

'میں وعدہ نہیں کرتا۔ کیونکہ آج کل تمہاری مانگیں خطرناک ہوتی جا رہی ہیں۔' کمال یوسف نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔

'میں نے ایسی کسی مانگ کا اظہار تو نہیں کیا—' ناہید زور سے چیخی— یہ اور بات ہے کہ اپنے حساب سے سوچتے اور غور کرتے ہوئے تم اسے غلط رنگ دے دیتے ہو۔'

'میں غلط رنگ دینے کی کوشش نہیں کرتا......'

'اچھا...... چلو کوئی بات نہیں۔ مگر آج تم کو میری بات ماننی ہوگی۔ اچھا ٹھہرو۔ میں ابھی آئی۔'

کمال یوسف کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا...... ناہید کے چہرے کی چمک بتا رہی تھی کہ کوئی انہونی ہونے جا رہی ہے۔ وہ دس منٹ کے بعد لوٹی تو کمال یوسف ایک دم سے چونک گیا۔ ناہید نے ایک مردانہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ وہی سوٹ تھا جسے پچھلے سال ہی اس نے ریٹائرڈ کر دیا تھا مگر ناہید کو یہ سوٹ بہت پسند تھا۔ سفید جھولتا ہوا شرٹ اور گرے کلر کی پینٹ۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت کی طرف بندھے تھے۔

'کیسی لگ رہی ہوں میں......'

'یہ کیسا مذاق ہے......'

'میں پوچھ رہی ہوں کہ کیسی لگ رہی ہوں میں......'

کمال یوسف نے تلخی سے جواب دیا— 'خود آئینہ میں دیکھ لو...... جھولتا ہوا شرٹ۔ پاؤں سے باہر نکلتا ہوا پینٹ۔ اس وقت تم ایک جوکر لگ رہی ہو......'

کمال یوسف نے دیکھا۔ آخری جملے کا زبردست اثر ناہید کے چہرے پر ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ آگے کیا تو سرخ رنگ کی ساڑی اور اس سے میچ کرتا ہوا بلاؤز اس کے ہاتھ میں تھا...... ناہید نے ساڑی اور بلاؤز اس کی طرف اچھال دیا۔

'اب یہ تم کو پہننا ہے......'

'پاگل ہو گئی ہو۔'

'میں کہہ رہی ہوں نا۔ یہ تم کو پہننا ہے۔' وہ ہنس رہی تھی۔
'سوال ہی نہیں —'
'اس گھر میں دو دو جوکر ہیں۔ اکیلے جوکر بننا مجھے منظور نہیں۔'
'میں کسی قیمت پر تمہارے اس گھٹیا کھیل میں شریک نہیں ہوسکتا۔'
وہ تو تمہیں ہونا ہوگا.....' ناہید زور سے چیخی۔ آخر میں نے بھی تو تمہارا لباس پہنا ہے۔ تمہارا لباس پہنتے ہوئے مجھے دومنٹ کے لیے بھی نہیں سوچنا پڑا۔ ہمارے لباس پہنتے ہوئے تمہیں اتنا سوچنا کیوں پڑ رہا ہے؟ اسی لباس کو دیکھتے ہونا......؟ اسی لباس میں چھپے ہوئے جسم کو آنکھوں میں بساتے ہونا...... پہنو......'
کمال کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا۔
'لیکن میں اس کے باوجود نہیں پہن سکتا......'
'تمہیں ہر قیمت پر پہننا ہوگا۔'
'تم اپنی حد کراس کر رہی ہو ناہید۔'
ناہید کے چہرے پر خطرناک مسکراہٹ تھی — 'ابھی تم نے میری حد دیکھی کہاں ہے......'
کمال کا ذہن ڈوب رہا تھا...... ساڑی اور بلاؤز اس نے کانپتے ہاتھوں سے اٹھا تو لیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ناہید کی باتوں پر عمل کیوں کیا جائے؟ اگر یہاں صرف پیار ہوتا تو ممکن ہے وہ اس عمل سے بھی گزر جاتا۔ اس نے ایسی کہانیاں سینکڑوں بار سنی تھیں کہ بہت سے جوڑے سیکس کے موقع پر ایک دوسرے کے لباس تبدیل کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے ایک نئے ذائقے کے لیے۔ لیکن یہاں ذائقہ نہیں تھا۔ ایک خطرناک ضد شامل تھی۔ اور اس خطرناک ضد میں وہ ناہید کی نفسیات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ ناہید اس کے مردانہ لباس میں سامنے تھی اور حقیقت یہ تھی کہ اس نے جوکر ضرور کہا تھا مگر اس لباس میں اس کی جسمانی خوبصورتی کھل کر سامنے آئی تھی۔ وہ سیکسی لگ رہی تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ ساڑی اور بلاؤز پہن کر وہ اس میں کیا دیکھنا چاہتی ہے۔ اور اگر وہ منع کر دیتا ہے تو اس کے اثرات کیا ہوں گے —؟ وہ اپنی خاموشی میں الجھا ہوا تھا یا اس وقت کمرے کی خطرناک خاموشی سے بارود کی مہک آ رہی تھی......'' اس نے ناہید کی آواز سنی، وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر اس سے مخاطب تھی۔
'تم نے اب بھی نہیں پہنا تو سن لو کمال یوسف۔ تم میری موت کے ذمہ دار ہو گے۔ میں یہاں سے سیدھے باہر جاؤں گی اور پہاڑ سے چھلانگ لگا دوں گی...... جانتے ہونا...... میں ایسا کر سکتی ہوں۔'
کمال یقینی طور پر اس دھمکی سے ڈر گیا تھا اور اس کے آگے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ناہید کی باتوں پر عمل کرے...... اس نے بے چارگی بھری نظروں سے ناہید کی طرف دیکھا......
'تمہاری خواہشیں تمہاری طرح خطرناک ہوتی جا رہی ہیں۔'
'جانتی ہوں۔'
'کیا یہ ڈرامہ ضروری ہے؟'
'ہاں...... مجھے تمہیں اس ڈریس میں دیکھنا ہے۔ تسلی کرنی ہے۔'
'کس بات کی تسلی۔'
'یہ نہیں بتا سکتی۔'
'کیوں'
'بس نہیں بتا سکتی۔'
'پھر تسلی کس بات کی......'
ناہید کی مسکراہٹ زہر بھری تھی — 'تم مردوں کو عورت کے روپ میں دیکھنے کی،' وہ ہنس رہی تھی — 'فلموں میں دیکھو۔ عامر سے شاہ رخ

تک عورتوں کے لباس میں نظر آتے ہیں تو کتنے مضحکہ خیز لگتے ہیں......'

'تم یہ دیکھنا چاہتی ہو کہ تمہارا شوہر کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے۔؟'

'پلیز شوہر مت بولو۔ مجھے اس نام سے چڑ ہے۔اس وقت شوہر میں ہوں۔اور تم سرخ ساڑی زیب تن کرنے کے بعد میری بیوی۔'

'انا کی تسکین ہو جائے گی؟'

'مکمل نہیں۔تھوڑی بہت'

'اس سے تمہیں کیا ملے گا؟'

'زیادہ سوال مت کرو کمال۔ جو ملے گا تم مرد اسے سمجھ بھی نہیں سکتے۔مگر پلیز۔اب پہن لو۔ میں تمہیں اس لباس میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ جلدی کرو......'

'تو تم نہیں مانو گی۔'

'کسی بھی قیمت پر نہیں۔'

شاید محبت انسان کو اکثر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ عجیب سی خواہش کا اظہار تھا مگر اس کے لیے دھمکی بھی دی جا چکی تھی۔وہ جانتا تھا کہ ان دنوں ناہید کی دماغی حالت بہتر نہیں ہے۔وہ ضد میں کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہے......کمال اب وہ کرنے کے لیے مجبور تھا، جس کا حکم اسے ناہید نے دیا تھا۔اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا......اسے بار بار لگ رہا تھا، وہ نہیں مانا تو ناہید کسی بھی پہاڑی سے کود جائے گی۔اس کے بعد جو ہوگا، وہ اس الجھن میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا، لیکن یہ کام، جسے ناہید کرنے کے لیے کہہ رہی تھی، ایسا غیر معقول کام تھا، جسے کرتے ہوئے اس کی مردانہ جھجک آڑے آ رہی تھی۔ایک جھٹکے سے اس نے کپڑے اتار دیئے......بلاؤز پہننے کی کوشش کی تو چھوٹا پڑ گیا......ناہید زور سے تالیاں بجا کر ہنسی......

'ساڑی پہن لو......'

وہ ساڑی کسی طرح بمشکل کمر سے باندھنے کی کوشش کرنے لگا......

'اب پلو ڈالو......'

'اس نے پلو بھی ڈال لیا......اور اچانک ناہید کا زہریلا قہقہہ سن کر چونک گیا......

'تم جو کر نہیں ایک بدہیئت اور خوفناک مخلوق نظر آ رہے ہو......جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں جا سکتا۔جاؤ دیکھو، سامنے آئینہ ہے۔خود کو دیکھ لو......اسی جسم پر ناز کرتے ہو تم لوگ......کیسا اوبڑ کھابڑ اور خوفناک بدنما جسم ہے تم لوگوں کا......تم سے اچھے تو سڑک کے گدھے اور گھوڑے ہیں۔ناہید کی آواز سے بارود کی مہک آ رہی تھی......اسی بدصورت جسم سے عورت کے بارے میں سوچتے ہو؟ اسی جسم سے زنا بالجبر کو رسوا اور ذلیل کرنے کا خیال جاگتا ہے۔یہ جسم نہیں ہے، سر سے پاؤں تک بکھری ہوئی ایک ایسی بدصورتی ہے جسے سوچنے اور دیکھنے سے بھی گھن آتی ہے۔'

کمال حیران سا ناہید کو دیکھ رہا تھا۔گولیورس ٹریول میں جب گولیور گھوڑوں کے دیس پہنچتا ہے تو گھوڑے انسانی جسم کا کچھ اسی طرح مذاق اڑا رہے تھے، جیسا مذاق اس وقت ناہید اڑا رہی تھی۔لیکن وہ صرف ایک مرد نہیں تھا، ایک شوہر تھا۔تو کیا ناہید اس کے وجود کے سہارے دنیا کے تمام مردوں سے انتقام لے رہی تھی......

'تم ناقابل برداشت ہو۔اور دیکھو، اس لباس نے تمہاری اصلیت کو بے نقاب کر دیا۔ یہ ہو تم لوگ۔ٹیڑھے میڑھے۔اوبڑ کھابڑ......جانوروں سے بدتر۔اور شاید اسی لیے تم لوگوں کی خصلت میں ایک جانور بولتا آیا ہے۔تم لوگ جانور ہی پیدا ہوئے اور حقیقت یہ ہے کہ تم مرد جانوروں سے بھی بدتر نظر آتے ہو......'

اس حادثے کے بعد کئی دنوں تک کمال یوسف اور ناہید کے درمیان بول چال بند رہی۔دو ہی راستے تھے۔یا تو ناہید سے الگ ہو جایا جائے یا

پھر ناہید کو اسی حالت میں قبول کیا جائے۔ ایک طرف باشا تھا جس کے لیے ناہید کی ضرورت تھی اور ایک اہم سوال اور بھی تھا، آج کی ناہید کو کون قبول کرے گا؟ ممکن ہے اس سے الگ ہونے کے بعد ناہید زندگی کی دعوت کو قبول ہی نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ناہید اس کی محبت تھی اور وہ مشکل حالات میں بھی ناہید کے بارے میں کچھ بھی برا سوچنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

ایک مہینہ تک سب کچھ ٹھیک چلا۔ مگر ایک مہینہ بعد ایک اور حادثہ ہو گیا جس نے اس فکر کو تقویت دی کہ ناہید کو بدلا نہیں جا سکتا ہے۔ اور ناہید مردوں کے نام پر جس غصے کے ساتھ زندگی جی رہی ہے، یہ غصہ اچھی بھلی ازدواجی زندگی کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ناہید ان سوالوں سے کہیں دور جا چکی تھی......

'اس دن شام کے 4 بجے ہوں گے......

(6)

ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔ باشا کو دو دنوں سے بخار تھا۔ بخار کی کیفیت میں باشا لاجو کے پاس رہنا نہیں چاہتا تھا۔ ناہید باشا کے لیے پاگل ہو جاتی تھی...... وہ خود ہی باشا کو لے کر ڈاکٹر کے یہاں چلی جاتی......اور ایسے موقعوں پر ایک بالکل ہی نئی ناہید سامنے ہوتی تھی۔ باشا صحت مند ہو گیا تو ناہید نے آرام کی سانس لی۔ اس کے دو چار روز بعد ہی ناہید کی ایک سہیلی کی شادی تھی۔ کمال نے پہلے تو منع کیا لیکن ناہید کی ضد کے آگے ہمیشہ کی طرح اسے ہتھیار ڈالنا پڑا۔

'تم اکیلی کیوں نہیں جا سکتی—؟'

'جا کیوں نہیں سکتی۔ لیکن جب تم اپنے دوستوں کی شادی میں جاتے ہو تو مجھے کیوں لے جاتے ہو۔'

'کبھی کبھی کسی ضروری کام کی وجہ سے مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے۔'

'آفس کا کوئی کام اتنا بھی ضروری نہیں ہوتا۔'

'یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو—؟'

'کیوں کہ میں تمہارے ضروری کام کی نوعیت سے واقف ہوں۔'

'کیا تم نے یہ محسوس کیا ہے ناہید کہ ان دنوں تمہاری ضد ہر معاملے میں شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔'

ناہید نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ 'دراصل تم جسے ضد کہتے ہو وہ چھوٹی چھوٹی خواہشیں ہوتی ہیں۔ تم ان خواہشوں پر بھی سوالوں کی تہہ چڑھا دو تو تمہاری مرضی......'

کمال کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر ناہید نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو وہ اپنے فیصلے کے آگے جھک نہیں سکتی۔ اگر دونوں میں کسی ایک کو جھکنا ہے تو اسے ہی جھکنا ہوگا۔ صبح کی بوجھل گفتگو کے بعد وہ دیر تک لیپ ٹاپ سے کھیلتا رہا۔ ٹورزم سے متعلق سائٹ پر جانا اور نئے نئے انفارمیشن جمع کرنا اسے پسند تھا۔ اور اسی لیے ڈائرکٹرس میٹنگ میں اس کی انفارمیشن کی قدر کی جاتی تھی۔ کیوں کہ اس کے پاس مضبوطی سے اپنی بات رکھنے کے لیے جوڑا اٹا ز ہوتے تھے، انہیں ہر صورت میں قبول کرنا ہوتا تھا۔ ذہنی دباؤ سے بچنے کا بھی یہ ایک طریقہ تھا کہ لیپ ٹاپ سے دل بہلایا جائے۔ مگر کمال یوسف کا بیقرار دل بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ آج بھی کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ دلی سے واپسی کے بعد ہر روز ہی ان مکالموں میں ایک انجانے

مرد کی موجودگی ہوتی تھی۔ مرد، جس سے انتقام لیا جانا ہی واحد راستہ تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ دنیا کے تمام مردوں کے انتقام کے لئے اس کا انتخاب کیا گیا تھا — ایک بار ناہید نے مسکراتے ہوئے کہا بھی تھا۔

'تمہارے اندر صبر بہت ہے کمال۔'

'اور آپ میرے اسی صبر کا امتحان لیا کرتی ہیں۔'

'مجھے اچھا لگتا ہے۔' وہ معصومیت سے مسکرائی۔

'لیکن کسی دن یہ صبر ٹوٹ بھی سکتا ہے......'

'مجھے اس دن کا بھی انتظار رہے گا۔ برف پگھل سکتی ہے۔ صبر ٹوٹ کیوں نہیں سکتا۔؟'

وہ اتنے پیار سے مسکرائی کہ کمال یوسف کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

'تم سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہو ناہید۔'

'میں آسان ہونا بھی نہیں چاہتی۔ میں زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور جیتی ہوں۔ میں زندگی کو سمجھنے کے لیے دوسروں کا احسان نہیں لیتی۔'

ناہید مطمئن تھی لیکن تب تک کمال یوسف کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ وہ جلد ہی ایک نئے حملے کا شکار ہونے والا ہے......

بیڈ روم میں آرام کرنے کے دوران ہی ناہید نے جگا دیا۔ ابھی تک آپ سو رہے ہیں۔ سات بجے تک شادی میں پہنچنا ہے۔

'تم سونے بھی نہیں دیتی۔' کمال نے بے بسی سے کہا۔

'میں تیار ہونے جا رہی ہوں۔ اور ہاں۔ آپ کے لیے کپڑے نکال رہی ہوں۔ جو سوٹ نکالے ہیں۔ آپ کو وہی پہننا ہے۔

'کیوں۔؟'

'میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔ اور یاد رکھئے شادی میں لے کر میں آپ کو جا رہی ہوں۔ آپ نہیں۔ وہاں میری بہت سی سہیلیاں ہوں گی۔'

'سہیلیاں ہوں گی تو میں کیا کروں......؟'

'ارے آپ کیا کریں گے۔ مجھے تعارف کرانا ہوگا...... مجھے بتانا ہوگا کہ آپ کون ہیں۔ اور ہاں۔ ناہید نے جلتے ہوئے توے پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔ 'سوٹ کے پاس ہی آپ کی گھڑی بھی رکھی ہوئی ہے۔'

'گھڑی؟'

'ہاں۔'

'تم جانتی ہو میں گھڑی نہیں پہنتا'

'ہم چوڑیاں پہنتے ہیں نا......، ناہید نے قہقہہ لگایا — 'گھڑی جان بوجھ کر رکھی ہے۔ مجھے احساس ہوگا چوڑیوں کی جگہ آپ کی کلائی پر یہ گھڑی موجود ہے۔

کمال یوسف کی نیند اچٹ چکی تھی۔ وہ حیران و پریشان نظروں سے ناہید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

'چوڑی کا گھڑی سے کیا رشتہ ہے —'

'دونوں ہتھیلیوں کو قید رکھتے ہیں۔'

'تو آپ ہمیں شادی میں قیدی بنا کر لے جانا چاہتی ہیں۔'

'ہاں۔' ناہید نے بے رحم آنکھوں سے کمال یوسف کی طرف دیکھا...... 'شادی بیاہ میں ہی تم مردوں کو ہم عورتوں کی یاد آتی ہے۔ نمائش کی چیز بنا کر رکھ دیا ہے عورت کے وجود کو۔ گھر میں میلے کپڑوں میں تمہارے بچوں کی پرورش کرے گی اور جب شادی بیاہ میں لے جانا چاہو گے تو

چمچماتے کپڑوں میں شو پیس بنا کر لے جاؤ گے۔ چار گھنٹے بیوٹی پارلر میں اور پھر ایک داسی یا غلام کی طرح جب اپنے دوستوں سے تعارف کراتے ہو تو قربانی کے جانوروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔'

ناہید نے سفاک نظروں سے کمال کی طرف دیکھا— 'تم ہمیں نمائش کی گڑیا بنا سکتے ہو تو ہم تمہیں نمائش کا گڈا کیوں نہیں بنا سکتے—؟ ہم بھی تمہیں سجا کر لے جائیں گے۔ اور ٹھیک ویسے ہی اپنی سہیلیوں سے تمہارا تعارف کرائیں گے جیسے تم شادی بیاہ کی محفلوں میں ہمارا کراتے ہو......اب چلو۔ کوئی سوال نہیں۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ......

ناہید جا چکی ہے لیکن کمال یوسف اب بھی حیران نظروں سے اس جگہ کو دیکھ رہے تھے جہاں کچھ دیر پہلے ناہید کھڑی تھی۔ کیا تہذیب اور شرافت کا بوجھ کچھ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ برداشت کی حد بھی ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی آہستہ سے کمال یوسف کے اندر چیختا ہے......کہاں ہو تم......کہاں سو گئی ہے تمہاری مردانگی۔ ناہید ناز ایک کٹھ پتلی کی طرح تمہارا استعمال کر رہی ہے......اور تم مسلسل استعمال ہوتے جا رہے ہو......تم برداشت کی ہر حد سے گزرنے کے بعد کھوکھلے ہو چکے ہو......اور ایک دن تم غائب ہو جاؤ گے کمال یوسف......تمہاری جگہ صرف تمہارا سایہ رہ جائے گا۔ اور اس سایہ پر بھی ناہید ناز کی حکومت ہوگی۔ ابھی بھی وقت ہے۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ابھی بھی خود کو سنبھال سکتے ہو تم۔ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔ خود کو سنبھالو کمال یوسف......'

کمال یوسف نے ٹھنڈی سانس بھری......میں نہیں جانتا، میں کہاں کھو جاتا ہوں۔ مگر حقیقت ہے کہ میں کھو جاتا ہوں......اور میں کس بات سے انکار کروں......ناہید ناز کا عمل غلط ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی باتوں میں دم ہے۔ یہاں صدیوں کی قید عورت ہے، جس کا مردوں نے ہر سطح پر استحصال کیا ہے۔ اور آج صدیوں کے ظلم سہنے کے بعد وہ عورت اگر ناہید ناز کے وجود میں سانس لے رہی ہے تو وہ مجرم کیسے ہے—؟ غلط یہ ہے کہ مردوں کا یہ انتقام صرف اس سے لیا جا رہا ہے۔ یعنی ایک ایسے مرد سے جو شاید لڑنا بھی بھول چکا ہے۔

وہ اس سرزمین پر پہلا آدم تھا جسے صدیوں کے ظلم و جبر کی علامت بنا کر ذلت اور رسوائی کی صلیب پر چڑھا دیا گیا تھا اور اس کی سزا یہ تھی کہ اسے اف بھی نہیں کرنا تھا......

■■

بطور مصنف میرے پاس اس وقت ہزاروں سوالات تھے، جو ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ مگر میں ان لمحوں میں کمال یوسف کی ذہنی سطح کا اندازہ لگا رہا تھا۔ شرافت اور تہذیب کا بوجھ شاید کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے—

'پھر آپ شادی میں گئے۔؟'

'نہیں۔'

'اور ناہید مان گئی۔؟'

'نہیں۔ اس دن ہمارا جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے صاف طور پر کہا کہ اگر اسے دنیا کے سارے مردوں کا انتقام مجھ سے لینا تھا تو پھر مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہئے تھی۔'

'کیا جھگڑے کے دوران ناہید نے رونا بھی شروع کیا تھا؟'

'بالکل بھی نہیں۔ وہ اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ پائی۔ وہ دیر تک چیختی رہی۔ میں باہر لان میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔'

'کیا ناہید عام طور پر رونے سے پرہیز کرتی ہے—؟ یا ایسا کوئی موقع جب آپ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہوں......؟'

'وہ آنسو بہانے والی لڑکیوں میں سے نہیں ہے۔ ہاں ایک بار باشا کی طبیعت خراب ہوئی تو میں نے اسے روتے ہوئے دیکھا تھا— مگر اس نے مجھے اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ اس کی آنکھیں نم ہیں۔'

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا—

'کیا اب بھی آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ ایک نارمل لڑکی ہے۔؟' کمال نے آہستہ سے کہا— 'میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔'

میں ناہید کے لیے فکر مند تھا۔ مردوں کو قابل نفرت دیکھنے سے کیا وہ اپنی عظیم ترین آزادی کے لیے فتح محسوس کرتی ہے؟

’مشکل یہ ہے کہ اس کا علاج بھی نہیں کرایا جا سکتا۔ اسے ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جایا جا سکتا۔ اس پر دباؤ نہیں بنایا جا سکتا۔ پھر کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک نا معلوم تشدد کی طرف بڑھ رہی ہے—؟ اور اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کا پہلا شکار میں ہوسکتا ہوں۔ لیکن سوال ہے، راستہ کیا ہے؟ راستہ یہ بھی نہیں کہ میں اسے ذہنی بیماری کی حالت میں چھوڑ کر اس سے الگ ہو جاؤں.....‘

’الگ ہونا اس مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ مگر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ انتقام کا یہ شدید جذبہ اسے تشدد کی طرف لے جارہا ہے۔ اور اس کا ذہن جن باتوں سے دوچار ہے، اس راستہ میں تشدد معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اب اس کی بغاوت اسی سمت پرواز کر رہی ہے۔‘

’میں جانتا ہوں۔ مجھ سے الگ ہونے کے بعد ناہید کے لئے زندگی بہت حد تک مشکل ہو جائے گی اور شاید اسی لیے اب تک میں نے اس کی ہر بات کو برداشت کیا ہے۔ مگر سوچتا ہوں کہ آگے کیا کچھ اور خوفناک صورتحال پیدا ہوتی ہے، تو کیا برداشت کا مادہ میرے اندر ہوگا—؟‘

’کسی بھی انسان کے لیے یہ کہنا مشکل ہے۔‘

کمال یوسف کی آنکھیں ابھی بھی سوچ کی وادیوں میں تھیں۔ ہم نے اس گفتگو کو یہیں ختم کیا۔ کیونکہ ناہید کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ اور ہم ناہید کو اس بات کا احساس نہیں دلانا چاہتے تھے کہ ہماری گفتگو اسی محور پر گردش کر رہی تھی۔

(7)

دو تین دن ہم نے نینی تال کے مختلف مقامات کی سیر کی۔ اس دوران کمال یوسف اور ناہید دونوں ساتھ رہے۔ مگر دونوں زیادہ تر خاموش رہے۔ ہاں کبھی کبھی باشا کو لے کر دونوں کے درمیان گفتگو ہو جاتی۔ مگر اس بات کا احساس زور پکڑ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ ناہید کا انتقامی انداز اب کمال کے لیے ٹینشن کا سبب بننے لگا ہے۔ مجھے گھومنے اور سیر سپاٹے کا شوق ہے اور اس شوق میں اکثر ڈائری اپنے ساتھ رکھتا ہوں اور مجھے اس بات کا احساس ہے کہ لکھنے والے کی حیثیت بہت سے کرداروں کے ساتھ ساتھ ایک منشی کی بھی ہوتی ہے۔ منشی کی نوٹ بک میں واقعات و حادثات کی کڑیاں نوٹ، تاریخوں کے ساتھ اس طرح درج کی گئی ہوتی ہیں کہ انہیں کچھ برسوں کے بعد پڑھیے تو ماضی و تاریخ کی روشنی میں ایک نیا جہان آباد ہو جاتا ہے۔ ڈائری کی اہمیت یوں ہے کہ سلسلہ وار واقعات کو جوڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ناہید اور کمال کے ساتھ ہم نے مختلف مقامات کی سیر کی۔ ہم تری رشی سرور بھی گئے۔ کہتے ہیں تین رشیوں نے تین مقاموں پر الگ الگ تین تالوں کی تعمیر کی تھی۔ یہاں قدرت کا انمول خزانہ بکھرا ہوا تھا۔

ناہید نے بتایا کہ یہاں 1790 سے 1815 تک گورکھاؤں کی حکومت تھی۔ گورکھوں نے گڑھوالی اور کماؤنی لوگوں پر بہت ظلم ڈھائے۔ اس کے بعد یہاں برٹش فوج آ گئی۔ گورکھاؤں کو شکست ہوئی...... یہاں کی آب و ہوا خوبصورت تھی۔ انگریزوں کو یہ مقام اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے گڑھوال، کمایوں جیسے پہاڑی مقامات پر نئے نئے شہر بسانے شروع کر دیے۔ الوڑا، رانی لینس، نہیں ڈاؤن انگریزوں نے ہی بسائے۔

نینی تال گھومنے کے دوران ہم سیلانی پیک دیکھنے بھی گئے۔ اور روپ وے پر بھی سوار ہوئے۔ سارا دن یہاں سیاح بوٹ کی سواری کرتے

ہیں۔ساتھ ہی گھوڑسواری کے بھی مزے لیتے ہیں۔ ہنومان گڑھی۔کاٹھ گودام،چینی پک جیسے مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ہم تھک چکے تھے۔ایک جگہ جب ناہید ستانے کے لئے پتھر کے بنچ پر باشا کے ساتھ بیٹھی تو ناہید کو سنانے کے لئے کمال نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

’عورتیں جلد ہی تھک جایا کرتی ہیں۔‘

ناہید نے غصے سے پلٹ کر دیکھا۔مگر اس درمیان باشا رونے لگا تھا۔اس لیے وہ باشا کو چپ کرانے میں لگ گئی۔لیکن گھر واپسی تک دونوں کے درمیان مکالمے نہیں کے برابر ہوئے۔ یہ بات مجھے بری لگ رہی تھی اور مجھے اس بات کا احساس تھا کہ کم از کم میری موجودگی میں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔مگر نفرت کا زہر شاید دونوں طرف اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔

دوسرے دن ناہید کے سمر والے اسکول جاتے ہی میں کسی کام سے ڈرائنگ روم آیا تو اچانک میں چونک گیا۔لاجو پاگلوں کی طرح کمال سے چپکی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیے جا رہی تھی۔جبکہ کمال اس کے ہاتھوں کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔اور بار بار آہستگی سے ایک ہی لفظ کہہ رہا تھا۔لاجو کوئی آ جائے گا۔نادانی مت کرو۔مگر لاجو کی عمر بہتی ہوئی ندی کی طرح تھی،جو ایسے موقعوں پر رکنا کہاں جانتی ہے۔کمال جب لان میں آیا تو اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔جیسے گناہ کے احساس سے وہ مجھ سے آنکھیں چار کرتے ہوئے شرما رہا ہو یا اسے اس بات کا شک ہو کہ کہیں میں نے اسے اس حال میں دیکھا تو نہیں——

رات کھانے کے بعد ہم ٹیرس پر بیٹھے تو اچانک ایک بار پھر سے وحیدہ کا تذکرہ آ گیا۔اس درمیان وحیدہ میرے خیالوں سے نکل چکی تھی۔ اور نینی تال کے قیام کے اس پورے ہفتہ کے دوران نہ وحیدہ یہاں ملنے آئی اور نہ اس کے بارے میں کوئی گفتگو ہوئی۔

ناہید نے بتایا۔وہ من موجی قسم کی لڑکی ہے۔جب آئے گی تو ایک دن میں کئی چکر ہو جائیں گے۔اور جب نہیں آئے گی تو کئی کئی دنوں تک روپوش رہے گی۔

کمال نے ناگارجن سینی اور ان کی اہلیہ کے بارے میں تفصیلات بتائیں،جن کے بچے باہر رہتے ہیں۔یہ اتفاق ہی تھا کہ ایک شام ان سے وحیدہ ٹکرائی اور یہ لوگ وحیدہ کو اپنے گھر لے آئے۔اور وحیدہ بیٹی بن کر تب سے ان لوگوں کے ساتھ ہے۔ ناگارجن اور کوشلیا وحیدہ پر جان چھڑکتے ہیں۔

ناہید نے مسکراتے ہوئے کہا۔آپ اسے دیکھیں تو پہلی بار میں اسے سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔وہ انسانوں کی باتیں کم پرندوں کی باتیں زیادہ کرتی ہے۔ یہاں آئے گی تو باشا کو گود میں اٹھا لے گی۔پھر لان میں نکل جائے گی۔حیرت کی بات یہ کہ پرندے بھی اس کی موجودگی میں اڑتے ہوئے جانے کہاں سے آ جاتے ہیں۔

کمال کو نیند آ رہی تھی۔وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ناہید اکیلی رہ گئی۔دور پہاڑیوں کے درمیان جلتے بجھتے ہوئے قمقموں کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔یہ لمحہ میرے لیے اہم تھا۔میں ناہید سے مخاطب ہوا......

’سنو ناہید۔میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔‘

’جی۔‘ناہید نے چونک کر میری طرف دیکھا۔‘

’ممکن ہے کسی روز بھی میں دلی واپس چلا جاؤں۔ یہاں تم لوگوں سے ملاقات بھی ہو گئی۔اور نینی تال کی سیر بھی کر لی۔مگر ناہید۔عمر میں تم سے کافی بڑا ہوں اس لیے اپنے تجربے کی بنا پر جو کچھ تم سے کہنے جا رہا ہوں۔وہ غور سے سنو۔ہو سکتا ہے اس کے بعد تمہیں یہ موقع نہ ملے۔اور تمہیں وقت کے کھو دینے کا احساس ہو......‘

’جی......، میں نے پہلی بار ناہید کے چہرے پر خوف کے اثرات دیکھے تھے۔‘اس گھر میں جو کچھ بھی چل رہا ہے وہ میری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اور کمال ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر رہے ہو۔یہ تم لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے بولنے کا حق نہیں۔مگر مجھے صرف ایک بات کہنی ہے۔کوئی ضروری نہیں کہ تم اس بات پر عمل بھی کرو۔‘

’جی...... کہئے......‘ناہید آہستہ سے بولی۔

'تمہاری خاموشی کے پیچھے کچھ ہے، یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی اس سے انجان نہیں— یہ خاموشی خطرناک ہے اور اس بات کی گواہ بھی کہ تمہارے اندر، تمہارے سینے میں ایک زہر بھری پوٹلی رکھی ہے۔ تم اس پوٹلی کو نکالنا نہیں چاہتی، یہ تمہاری مرضی— مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک دن یہ زہر بھری پوٹلی پھٹ بھی سکتی ہے اور جس دن یہ پوٹلی پھٹے گی، کئی لوگ اس کے شکار ہو جائیں گے۔ تم، کمال، باشا اور تم سے وابستہ لوگ— تم ابھی اس حقیقت سے واقف نہیں کہ راز کو راز رکھتے ہوئے تم خود سے کتنا بڑا فریب کر رہی ہو...... تم خود کو خطرے میں ڈال رہی ہو۔ کیونکہ پوٹلی کے پھٹنے کا مطلب ہے، سب سے پہلا شکار تم خود ہوگی۔ زندگی میں کوئی ایک ہونا چاہئے، جسے اپنا راز دار بنایا جائے۔ کوئی ایک، جس پر بھروسہ کیا جائے، کوئی ایک جس کو اپنے دل اور جنوں کا حال سنایا جا سکے۔ تم اکیلے ہی اس راز کی نگہبان رہو اور اکیلے ہی سلگتی اور جلتی رہی ہو۔ لیکن اب تمہارے اندر سے آگ کے شعلے اٹھنے لگے ہیں۔ اور ابھی وقت ہے کہ تم اس کہانی کو اپنے اندر سے نکالو، جو تمہیں آہستہ آہستہ ختم کر رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔

میں ایک لمحہ کے لیے ٹھہرا— 'میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا۔ مجبور کر بھی نہیں سکتا۔ مگر تمہارے پاس سوچنے کے لیے پوری رات پڑی ہے۔ تم آرام سے سوچ لو۔ اور اگر محسوس کرو کہ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو تو آرام سے آگ کے ان شعلوں کو نکال دینا جو تمہیں آہستہ آہستہ بھسم کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے۔ تم میری باتوں پر غور ضرور کروگی۔'

اس کے بعد میں ٹھہرا نہیں۔ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس مکالمہ کے لیے میں نے دو دنوں سے تیاری کی تھی۔ اور مجھے اس لمحہ کا انتظار تھا جب ناہید اکیلی ہوگی تو میں اپنی بات بھرپور طریقے سے اس کے سامنے رکھ سکوں گا۔ تنہائی کا موقع ہاتھ آیا تو میں نے کھلے طور پر اپنی بات کی وضاحت کر دی۔ اب مجھے صبح کے طلوع ہونے کا انتظار تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ناہید اپنے راز مجھ پر افشاں کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی مگر اتنا ضرور تھا کہ تنہائی میں وہ اس بارے میں غور ضرور کرے گی— بطور مصنف میں نے اپنی طرف سے نفسیات کے مہرے چل دیئے تھے اور اب مجھے ناہید کے جواب کا انتظار تھا۔

■■

دوسرے دن کی صبح عام صبح جیسی نہیں تھی۔ آسمان میں کہرا چھا گیا تھا۔ ناہید اسکول نہیں گئی۔ ناشتہ کے وقت بھی وہ سوچ میں گرفتار تھی اور جیسے مجھ سے آنکھیں ملاتے ہوئے بھی گھبرا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا، یہ کشمکش بھرے لمحے ہیں اور شاید اسی لیے ناہید نے اسکول سے چھٹی کر لی تھی۔ دس بجے کمال آفس کے لیے روانہ ہو گئے۔ بارہ بجے کے آس پاس سورج نمودار ہو چکا تھا۔ میں لان میں تھا۔ میں نے دیکھا، ناہید آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میری طرف آ رہی ہے— میرے قریب کی کرسی پر ناہید بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نیلے آسمان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اچانک اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ لیکن آنکھیں حرکت میں تھیں جیسے گزرے دنوں کی فلم ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے پردے پر چل رہی ہوں۔

'اس نے میری طرف دیکھا۔ لمبی سانس لی۔ پھر بولی— 'میں رات بھر سوچتی رہی۔ میں آپ کی بات سے متفق ہوں۔ زخم کا علاج نہ ہو تو اکثر زخم پھٹ جاتے ہیں۔ میرا زخم بھی ناسور بن چکا ہے۔ اور شاید آج، ان لمحوں میں، میں اس بے رحم کہانی کو یاد کرنا چاہتی ہوں، جس کو میں نے کبھی یاد نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔' اچانک اس نے دریافت کیا......

'کیا آپ مجھے کچھ دیر رو لینے دیں گے......؟'

میں چونک گیا تھا۔ مجھے کمال کی بات یاد آئی۔ کمال یوسف نے کہا تھا، زندگی میں کوئی بھی موقع ایسا نہیں آیا، جب میں نے ناہید کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہوں۔ لیکن وہی ناہید ناز میرے سامنے بیٹھی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔ آنسو اس کے رخسار پر پھیل رہے تھے۔ وہ بھول گئی تھی کہ ایک اجنبی اس کے سامنے ہے۔ وہ زور زور سے رو رہی تھی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اچانک اس کے ہاتھ اٹھے۔ آنسوؤں کو خشک کیا۔ مسکرانے کی کوشش کی۔ میری طرف دیکھا۔

'اب میں ٹھیک ہوں۔ برسوں بعد زندگی میں لوٹی ہوں۔ لیکن زندگی میں لوٹی کہاں ہوں...... ہاں میں آپ کو کچھ سنانے والی تھی...... لیکن سمجھ میں نہیں آتا، کہاں سے شروع کروں...... یہ کوئی بہت الجھی ہوئی داستان نہیں ہے۔ بہت مختصر سی کہانی ہے...... مگر...... کہیں نہ کہیں سے مجھے سنانے

کی شروعات کرنی ہوگی......ٹھہریے...... مجھے سوچ لینے دیجئے——
اور پھر آہستہ آہستہ اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔

چوتھا حصہ

بحر ظلمات

مقدس کتاب کہتی ہے
کہ ہم گرتے رہیں گے بار بار
اس نارنجی گڑھے میں
جن کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں
اس لئے جنت ہمارے قدموں سے
بہت دور اگائی گئی ہے
ہم پر حرام ہے اس کی خوشبو
●●
—سدرہ سحر عمران (پاکستان) کی ایک نظم سے

(1)

ابو میرے گھر میں دیکھو لال پری کا دانہ ہے
جو بھی ہے یہاں سیانا ہے۔

جونا گڑھ کا ایک بڑا سا حویلی نما مکان......ایک ابو تھے۔انتہائی سخت، نمازی، پرہیز گار۔غصہ آتا تھا تو صرف اماں پر۔اور اماں پر آئے غصے کے لئے انہیں کسی وجہ کی ضرورت نہیں تھی۔گھر میں پردے کا رواج تھا۔باہر جانے پر پابندی تھی۔لیکن رشتے داروں کی فوج تھی، آئے دن جن کا حملہ ہوتا رہتا تھا......اب تو شکلیں بھی بھولنے لگی ہوں۔اجو ماموں، گبرو دادا، چینو چاچا......سبحان بھائی، تختے والے عمران چاچا......سفید داڑھی والے ابو چاچا......زیادہ تر داڑھیوں والے بلکہ خوفناک داڑھیوں والے بزرگ......یہ حویلی ہماری تھی تو ان کی بھی تھی......میری عمر ہی کیا تھی۔مگر میں جیسے مرغی کے دربے میں ہاتھ بڑھا کر کسی مرغی کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیتی، ایسے ہی یہ لوگ پیار کے بہانے مجھے بھی دبوچ لیتے۔کیوں دبوچتے، یہ بات میری سمجھ میں پہلے نہیں آئی تھی۔

پھر مرغیوں کی کڑ کڑاہٹ کے ساتھ ننھی معصوم آوازیں لنگیوں اور پاجاموں کی سرسراہٹ میں کھو جاتیں۔

ماموں چھوڑو نا......جانے دو نا......

ابو چاچا......کیا کرتے ہو......جانے دو......نا......

گبرو دادا......میں اماں سے کہہ دوں گی......تم بہت گندے ہو......

چھوڑ ونا......

دکھ رہا ہے......

جانے دو......

یہ بچوں سے پیار کے کھیل تھے جو ابو اور اماں کے سامنے بھی کیے جاتے تو بچوں کا لاڈ اور پیار نظر آتا۔ مگر میں آہستہ آہستہ دس سال کی ننھی عمر سے ان شیطانوں کی نیت کو جاننے لگی تھی۔ اور ان کی سفید لنگیوں میں سرسراتے سانپ اور اس کے ڈسنے کے فن سے واقف ہو چکی تھی......

اجو ماموں گود میں بھر لیتے۔ لنگی کے اندر بیٹھا سانپ سرسراتا...... ماموں پیار سے گال چومتے...... کس کلاس میں پڑھ رہی ہے میری بیٹی......

اماں کو ماموں پر لاڈ آ جاتا۔ ارے لڑکیوں کا پڑھنا بھی کیا۔ پڑھ کر کوئی تیر مارنا ہے کیا۔ اپنے گھر جانا ہے......

'ہاں یہ بھی ٹھیک۔ ماموں کہتے...... پڑھ کر کیا کرے گی۔'

مجھے غصہ آتا لیکن میں چپ رہتی......

'یہاں کی لڑکیوں نے پڑھ کر کون سا تیر مار لیا جو یہ مارے گی۔'

'ہاں...... یہ بھی ٹھیک......'

میں اٹھنے لگی تو ماموں پھر سے دبوچ لیتے......

'لیکن بوبو...... ندو کو پڑھنے سے نہ روکیے گا...... کیوں ندو...... میں ناہید ناز، ان کے لیے ندو تھی......

میں دس سال کی ننھی عمر سے اپنے جینے کا تماشہ دیکھ رہی تھی——

کیوں لکھنے لگا کوئی میرے درد کی تفسیر

اے نالۂ شب گیر......

حویلی نما اس مکان میں کمرے ہی کمرے تھے...... کمروں کے چور دروازے...... بڑی سی کھلی ہوئی ننگی چھت...... چھت پر ایک کمرہ بڑے ابو کے نام سے بند تھا۔ بڑا سا تالہ لٹکا تھا۔ لیکن دروازوں کے درمیان دھکا دینے پر اتنی جگہ بن جاتی کہ ہم بچے اس اندھیرے کمرے میں لکا چھپی اور آئیس پائیس جیسے کھیلوں میں چھپ جایا کرتے۔ سرسراتے ہوئے کپڑے...... سہمی ہوئی آوازیں۔

'عظیم بھائی...... مجھے ڈر لگتا ہے......'

——یہ بڑے ابو کے بیٹے تھے۔ مجھ سے پورے چار سال بڑے......

——ارے ڈرتی کیوں ہے ندو۔ یہاں بھوت تھوڑے رہتے ہیں۔

——اماں کہتی ہیں جس کمرے میں چالیس دن تک کوئی نہ جائے وہاں آسیب آ جاتے ہیں۔

——اماں تو بے وجہ ڈراتی ہیں...... چل آ...... پہلے تو ہی اس کھوبر میں داخل ہو......

بڑے ابو کے بند دروازے کا نام ہم نے کھوبر رکھا تھا۔ عظیم بھائی نے دروازے کو ذرا سا دھکا دیا...... اور مجھے دروازے کے درمیان بنی ہوئی جگہ میں اندر جانے کو کہا......

'نہ...... میں تو نہیں جاؤں گی......'

'کیوں نہیں جائے گی۔ میں بھی تو جاؤں گا۔'

مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔'

'میں ہوں نا ساتھ......'

نکہت دس تک گنتیاں گن رہی تھی۔ یہ بڑے چچا کی اکلوتی لڑکی تھی۔ مجھ سے دو سال بڑی۔ دس کی گنتی ختم ہوتے ہی اسے ہم لوگوں کو تلاش کرنا ہوتا تھا...... ہم اس کی آواز سن رہے تھے...... رنکو بھائی۔ دیکھ لیا تمہیں...... سجاد بھائی...... اب نکل آؤ...... یہ عظیم بھائی کہاں ہیں۔ ندو کہاں

ہے......

کھوبر کے اندر تاریک کمرے میں عظیم بھائی نے مجھے اپنی جانگھوں کے اندر کس لیا تھا...... میں چھٹپٹا رہی تھی......

'بس چھپی بیٹھی رہ...... یہاں کوئی نہیں دیکھے گا......'

'چھوڑو مجھے......'

'نا......اٹھے گی تو آواز ہوگی......'

عظیم بھائی......اتنے زور سے نہیں پکڑو......

بدن میں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں......کہیں سانپ......کہیں چیونٹیاں...... کچھ ہو رہا ہے مجھے......اگڑم بگڑم دہی چٹا کن...... کچھ ہو رہا ہے......کمرے میں سرسراتے ہوئے ڈھیر سارے سانپ......

میں ان ڈھیر سارے سانپوں کے درمیان بڑی ہو رہی تھی......

اور بے زبان تھی۔

میں سب کچھ دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی۔

مگر ننھی سی عمر میں جیسے بند بند دریا کے پاٹ کھل گئے تھے۔ یا جیسے پاگل سونامی لہروں نے سارے باندھ توڑ دیئے تھے۔

ہاتھی کی سونڈ...... چوہے کا گھوڑا......گھوڑے کا چوہا...... مارا ہتھوڑا...... یہ گھوڑے کا چوہا کیا ہے......اماں بال سنوارتے ہوئے پوچھتیں......

میں کیسے بتاتی کہ ابو چاچا کی ہلتی ہوئی لنگی میں گھوڑے ہنہناتے ہیں......نہیں چوہے......تب میں نکہت یا مہرو کے ساتھ باہر برامدے میں کھیلتی ہوئی دیر تک ان دونوں کے ساتھ ہنستی رہتی تھی......

'یہ ہاتھی کی سونڈ کیا ہے۔؟' اماں پوچھتیں۔

میں نے اماں سے کہا...... یہاں ہر کمرے میں سانپ رہتے ہیں۔

اماں نے پیار سے گالوں پر تھپڑ جڑ دیا۔ بس تجھے دکھائی دیتے ہیں ندو۔ ہمیں تو دکھائی نہیں دیتے۔

تمہیں کیسے دکھائی دیں گے اماں......تم تو آنکھیں بند کیے رہتی ہو۔'

'آنکھیں بند کیے؟'

اماں پر غصہ آتا تھا......اور ان سے زیادہ ابو پر...... یہاں اس حویلی نما مکان کا ہر کمرہ عیش گاہ تھا۔ اور سب کی آنکھوں کے سامنے سہمی ہوئی نازک کلیوں کو آتش گل میں تبدیل کیا جارہا تھا۔ مگر سب ایک دوسرے سے آنکھیں موندے تھے۔

چار بہنیں تھیں۔ خدیجہ آپا کی شادی ہوگئی۔ بڑی ہوئی تو ان کے بارے میں ہزار کہانیاں سنیں۔ خدیجہ آپا کے شوہر انہیں لے کر سعودی چلے گئے۔ اور وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

نازیہ اپو خاندان میں ہی بیاہی گئیں۔ ماموں کے لڑکے سے جوانی میں ایسا رشتہ جوڑا کہ گھر میں طوفان آگیا۔ حمل ٹھہر گیا۔ دونوں گھروں میں تلواریں تن گئیں اور آخر ماموں کے لڑکے امتیاز کو چاروناچار انہیں اپنانا پڑا۔ لیکن نازیہ اپو کو گھر میں کوئی عزت نہ ملی۔ امتیاز بھائی نے ان کا حویلی آنا جانا بند کرا دیا۔ اڑتی اڑتی خبریں ملتی تھیں۔ امتیاز مارا کرتے ہیں۔ شراب پی کر آتے ہیں۔ گالیاں دیتے ہیں۔ کہتے ہیں مجھے تو معصوم پھنسایا گیا۔ جانے کس کا حمل تھا۔ حویلی میں تو غٹرغوں کرنے والی مرغیوں کی عصمت بھی محفوظ نہیں۔

شاذیہ آپا تو جوانی میں سامنے والے لڑکے مجو کے ساتھ بھاگ گئیں۔ پورے ایک ہفتہ بعد لوٹیں تو گھر میں کہرام مچ گیا—

ابو نے زٹ زٹ تھپڑ مارے تو شاذیہ آپا غصہ سے چیخ پڑیں۔

'یہاں کے داڑھی والے لٹیروں سے تو وہ مجو اچھا ہے۔'

مگر مجو میاں ہیرو بننے ممبئی بھاگ گئے۔ یا اس ذلت اور رسوائی سے بچنے کے لئے روپوش ہوگئے۔ مگر شاذیہ آپا نے بقول ابا، گھر کی عزت تار

تار کر دی تھی۔ دو سال بعد ایک بڑے میاں کا رشتہ آیا۔ عمر تھی 55 سال— بی بی کا انتقال چھ مہینے پہلے ہوا تھا۔ ابو نے عزت بچانے کے لئے بڑے میاں سے رشتہ کر دیا۔ نکاح میں خاندان والے شریک نہیں ہوئے۔

اکا دکا پانچ چھ لوگ بس—

کان میں جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا تھا...... بس یہی سننے کو ملا۔ حرافہ ہے۔ کتیا ہے...... ایک ہفتہ مجو کے ساتھ سوئی...... وہ تو اچھا ہوا بڑے میاں نے اس عمر میں رشتہ بھیج دیا۔ ورنہ ایسی لڑکیاں تو محلے کا محلّہ خراب کر دیں......

تب دادی اماں زندہ تھیں۔ زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھیں...... دادی اماں کہتی تھیں...... اس گھر سے لڑکیوں کی ڈولی نہیں اٹھتی، جنازہ اٹھتا ہے...... لڑکیاں گھر سے رخصت ہوتی ہیں تو پلٹ کر واپس نہیں آتیں......

’ہائے اللہ۔ میرا بھی جنازہ اٹھے گا......؟‘

’تو پاگل ہو گئی ہے......‘ دادی اماں چڑھ کر کہتیں۔

’تم ہی تو کہتی ہو دادی۔‘

دادی اماں ادھر ادھر دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتیں...... اچھا سن...... وہ جو برامدے میں امرود کا پیڑ ہے......

ہاں......

اور ادھر دائیں طرف جو پپیتے کا......؟

ہاں......

اور وہ جو شریفے کا......؟

ہاں......

’تو نہیں سمجھے گی ندو...... پیڑ نہیں ہیں۔ سب مرد ہیں......‘

’مرد ہیں......؟‘ میں چونک جاتی......

دادی کی آنکھیں چھت کو دیکھ رہی ہوتیں...... ’سب مرد ہیں...... حویلی میں جو بھی شان سے کھڑا ہے۔ وہ مرد ہے...... عورتیں تو سواری کے لیے ہوتی ہیں...... مارو۔ دھکا دو...... جان سے مار دو...... مگر اُف...... بے زبان گائے...... ایک حرف شکایت زبان پر نہیں آئے گا......‘

دادی کی آنکھوں میں ماضی زندہ ہو جاتا۔ گزرے دنوں کی ریل چلنے لگتی تو دادی حویلی کے مردوں کی داستان لے کر بیٹھ جاتیں......

چھوٹی سی ننھی سی عمر— سوچ پانے سے قاصر تھی کہ آخر دادی آج بھی داستانوں کی یہ پوٹلی لے کر کیوں بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن اب محسوس کرتی ہوں، دادی دور اندیش تھیں...... وہ جانتی تھیں...... آنے والے وقت میں مجھے یہ کہانیاں یاد رہیں تو زندگی سنوارنے میں مدد ملے گی...... مگر دادی یہ نہیں جانتی تھیں کہ کم عمری، علاء الدین کے چراغ اور بھیگی پینٹی کے درمیان بھی ایک رشتہ ہوتا ہے...... پینٹی بھیگتی ہے، چراغ کا جن جاگتا ہے تو خود پر قابو رکھنے والی صلاحیتیں معدوم ہو جاتی ہیں......

علاء الدین کا چراغ...... چراغ کا جن اور بھیگی پینٹی......

گیارہ سال کی تھی......

حویلی میں برامدے کے پاس ایک کمرہ تھا۔ گبرو دادا کا کمرہ...... کہتے ہیں گبرو دادا کے پاس کہانیاں ہی کہانیاں تھیں۔ 60 سال کی عمر...... دمے کے مریض...... مشکل سے اٹھتے۔ چائے کی طلب ہوتی تو امی کو آواز دیتے۔ امی گھر کے سارے لوگوں کے لیے بو تھیں۔ اور گبرو دادا کے لیے دلھن— بڑے پیار سے آواز لگاتے...... دلہن...... ایک کپ چائے ملے گی...... کیا کروں، اس وقت چائے کی طلب ستا رہی ہے۔

جی......

دلہن...... ندو سے پان بنوا کے بھیج دینا......

جی......

کہتے ہیں دادا نے دو شادی کی تھی۔ ایک بیگم طوائف گھرانے کی تھیں۔ وہ حویلی کبھی نہیں آئیں۔ دادا نے ایک دوسرا گھر تحفہ میں دے دیا تھا۔ گبرو دادا اسی طوائف کی اکلوتی اولاد تھے۔ وہ عین جوانی میں انتقال کر گئیں تو دادا نے وہ گھر بیچ دیا۔ اور گبرو اسی گھر میں پلنے بڑھنے لگے۔ پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ گھر کا سارا کام اکیلے کرتے۔ شادی نہیں کی۔ رنڈوے رہے۔ بیڑی پی پی کر برا حال کر لیا۔ اب دمے کے مریض ہیں اور برامدے کے پاس والا کمرہ ہے، جوان کے اختیار میں ہے۔ گبرو دادا کے کمرے میں ہم بچوں کی پوری فوج جمع رہتی۔ اور گبرو دادا کہانیاں سنایا کرتے۔ جس بچی پر دل آتا۔ اسے گود میں دبوچ لیتے۔ مگر کہانیاں چلتی رہتیں......

باہر لو کے جھکڑ چل رہے ہیں۔ دو بجے کا وقت...... ہاتھ میں گوٹ لیے چھوتی...... کھیلتی ہوئی۔ دادا کے کمرے میں نظر گئی تو گبرو دادا نے اشارے سے آنے کو کہا— گود میں بیٹھا لیا......

ایک علاء الدین تھا......

اچھا جی......

علاؤالدین کو ایک چراغ مل گیا تھا۔

اچھا جی......

چراغ سے جن نکل آیا......

چراغ سے جن کیسے نکلتے ہیں......؟ ننھے دماغ سوالوں میں گھر جاتے...... مگر اچانک چونک جاتی...... گبرو دادا کے ہاتھ جانے انجانے جسم پر پھسلتے ہوئے محسوس کرتی...... کچھ ہو رہا ہے گبرو دادا......

چراغ کا جن...... ہاہا......؟ ...... گبرو دادا منہ سے جن کو لے کر ڈراؤنی آوازیں نکالتے......

مجھے کچھ ہو رہا ہے...... کچھ ہو رہا ہے...... یہاں سانپ ہیں...... بچھو ہیں...... گھوڑے کا ہے...... چوہے کا گھوڑا...... مارا ہتھوڑا...... گبرو دادا مجھے چھوڑ و مجھے...... باہر لو کے جھکڑ چل رہے ہیں...... اور ایک جھکڑ یہاں ننھے جسم میں طوفان اٹھا رہے ہیں...... اماں نے شلوار کے ساتھ اب پینٹی پہنانا شروع کر دیا تھا...... مارا ہتھوڑا...... چراغ سے جن نکل رہا ہے...... اور یہاں...... پینٹی بھیگ رہی ہے...... میں سہمی آنکھوں سے گبرو دادا کو دیکھتی ہوں...... دھکا دیتی ہوں...... اور دوڑتی ہوئی مرغیوں کے دربے کے پاس پہنچ جاتی ہوں......

وہاں...... وہ شریفے کا پیڑ...... وہ پپیتے کا...... وہ امرود کا...... دادی اماں کہتی ہیں...... یہ درخت نہیں ہیں...... یہ سب مرد ہیں مرد...... مرد نہیں ہیں۔ چراغ کے جن ہیں...... علاء الدین کے چراغ سے جن نکلا اور ادھر شلوار بھیگ گئی......

میں آئینہ کے سامنے تھی۔

آئینہ میں میرا عکس غائب تھا۔ سرسراتے نیولے، بلے، اژدہے اور جنگلی جانوروں کے عکس تھے۔ دہاڑنے کی آوازیں تھیں...... میں سوچ رہی تھی...... جسم کا کون سا حصہ ایسا ہے، جسے حویلی کے برہنہ ہاتھوں نے نہ چھوا ہو...... پاؤں کی انگلیاں...... پیشانی...... جانگھیں...... گال...... سینے کے پاس کا حصہ...... زور سے سینے کے تل پر چکوٹی کاٹ کر مسکرانے والی آنکھیں...... ہر حصہ چھوا ہوا...... جسم کے نازک حصے میں ہلچل مچ جاتی...... میں سیلاب کی زد میں ہوتی۔ اُمڈتا بادل...... پانی کے قطروں کے گرنے کی آوازیں...... ٹپ ٹپ......

اماں...... میں بھیگتی جا رہی ہوں......

اماں...... یہاں سب کے سب علاء الدین ہیں......

اپنے اپنے خطرناک اور بدنما چراغوں کے ساتھ......

اماں...... یہاں جناتوں کی پوری ٹولی ہے......

اماں...... میں بھیگتی جا رہی ہوں......

برآمدے میں نلکا...... ہینڈ پمپ۔ اس سے ذرا آگے دو غسل خانے۔ ایک میں دروازہ لگا تھا۔ ایک پر پردہ۔ اماں مجھے نہلانے لے جاتیں تو پردہ برابر کر دیتیں۔ بڑی عمر کی عورتیں دروازے والے غسل خانے میں جایا کرتی تھیں...... اماں مجھے نہلا رہی ہیں۔ پردہ برابر......

اچانک اماں چونک جاتی ہیں......

تو اب بڑی ہو رہی ہے ندو......

وہ کیسے اماں......

اب تجھے اس غسل خانے میں نہیں نہاؤں گی......

وہ بڑا والا غسل خانہ......؟

ہاں......

لیکن کیوں اماں......

'چپ کر' اماں نے پیٹھ پر دو ہتھی جمائی— 'تیرا جسم اب بولنے لگا ہے......'

(2)

میرا جسم بولنے لگا تھا۔ آواز دینے لگا تھا اور میں بڑی ہو رہی تھی۔ بڑے ہونے کے احساس کے ساتھ ہی اب میں اپنے آس پاس کے تمام چہروں کو پہچاننے لگی تھی۔ گھر میں سلہٹ پر مصالحہ پیستی رجو بوا گھر کی پرانی خادمہ تھیں۔ عمر ڈھلنے لگی تھی۔ رجو بوا کی دو لڑکیاں تھیں...... دونوں جوان۔ غیر شادی شدہ......جسم کی شاداب بیلوں پر حویلی کے نگوڑے مردوں کی نگاہیں پھسلتی رہتی تھیں— آنچل منہ میں دیئے دھب دھپ سیڑھیوں سے نورا اترتی......سہمی سی۔ پھر کچھ دیر بعد عظیم بھائی اترتے تھے—چوروں کی طرح......دوسری زلیخا تھی۔ دو دو چوٹیاں باندھتی تھی۔ لمبی اور بدن سے آگ کی جھاس نکلتی ہوئی محسوس ہوتی......اکثر ماموں کے کمرے میں نظر آتی۔ ماموں اپنا پاؤں دبواتے تھے اور بدلے میں زلیخا کو پانچ دس روپے بھی مل جاتے تھے۔ کبھی کبھی ماموں اس کے لیے کریم اور پاؤڈر کی ڈبیا بھی لے آتے تھے۔ ماموں بڑے چچا کی بیٹی، نکہت پر بھی لٹو تھے۔ گالوں کو چوم لیتے۔ اور گود میں بیٹھا کر دیر تک پیار کرتے۔

نکہت کبھی کبھی بھاگتی لہراتی ہوئی واپس آتی تو ہاتھ میں پانچ روپے کے نوٹ ہوتے......

'کہاں سے ملے......؟'

اجو ماموں نے دیے......

'تو نے پاؤں دبائے......؟'

'ہاں......'

'کیوں دبائے......؟'

اجو ماموں نے کہا......

میں نکہت کو غور سے دیکھتی تو وہ سہم جاتی۔

'اس طرح کیوں دیکھ رہی ہے؟'

تونے ماموں کے کمرے میں سانپ کو دیکھا......؟

'سانپ......؟'

'ہاں......سانپ......'

'دیوار کے بل سے ہوتا ہوا کپڑوں کے اندر چھپ جاتا ہے......'

'لنگی میں......'

'ہاں......'

'دھت......تو پاگل ہوگئی ہے......'

لیکن یہاں پاگل کون تھا۔ یہاں کمرے میں عصمت چغتائی کے ہاتھی جھول رہے تھے۔ بڑے بڑے سونڈ والے۔ یہاں سب پیشہ ور تھے۔ خاندان اور شرافت کی دہائیاں دی جاتی تھیں......اور یہ کتنے شریف زادے تھے، میں اچھی طرح جان رہی تھی......

اور انہی دنوں شاذیہ آپا کی خودکشی کی خبر آئی تھی۔اس خبر نے مجھے اندر تک پریشان کردیا تھا۔اس گھر میں سب سے ہمت والی شاذیہ آپا تھیں۔ حویلی میں جہاں ہر مرد گندے سور کی طرح منہ مارنے میں لگا ہوا تھا، پہلی بار شاذیہ آپا نے ہمت کی اور حویلی کے در و بام سے باہر نکل کر مجو میاں کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئیں۔ میرا دل کہتا تھا، شاذیہ آپا ایک بار حویلی چھوڑ گئی تھیں تو انہیں واپس نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہ واپس آئیں تو بوڑھے بڑے میاں کے گھر کی کھونٹ سے باندھ دی گئیں۔لیکن جیتے جی اس ذلت کو شاذیہ اپی برداشت نہیں کرسکیں۔ میں دو ایک بار ہی شاذیہ اپی کے گھر جا سکی۔ وہ جھک گئی تھیں۔ چہرے کی شادابی کو نظر لگ گئی تھی۔ وہ زندہ کہاں تھیں اور پھر ان کے مرنے کی خبر آ گئی— دادی اماں کی بات ذہن و دماغ پر حاوی تھی۔ یہاں سے لڑکیوں کی ڈولی نہیں اٹھتی......جنازہ جاتا ہے......

شاذیہ آپا کا چالیسواں تھا۔صبح سے چہل پہل تھی۔ چنے کے دانوں پر عورتیں اور مرد الگ الگ قل ھواللہ پڑھ کر دانے الگ کر رہے تھے۔ قرآن شریف کی تلاوت ہو رہی تھی۔ مدرسوں کے بچے بھی بلائے گئے تھے......اگربتی اور لوبان کی مہک فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یہ پورا ماحول آسیبی لگ رہا تھا......ایک ساتھ تلاوت کرتے لوگوں کی آوازوں سے ہول آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے شاذیہ آپی سارے گھر میں گھوم رہی ہوں......ندو'ان لوگوں نے مارا مجھے......ان سب لوگوں نے مارا مجھے......'

میری آنکھیں حیران تھیں اور خوفزدہ......میں دوڑتی بھاگتی چل رہی تھی......ادھر چوکی پر بیٹھی عورتیں آپس میں ہنسی مذاق کرتی ہوئی چنے کے دانے چن رہی تھیں۔ٹھوکر لگی......چنے کے دانے بکھر گئے......

میں چھت پر بھاگی۔ تخنتے والے عمران چا کمرے میں لنگی بدل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ہاتھوں کو پکڑ کر کھینچا......

'وہ......'

'کوئی شرارت کی ہوگی......؟'

'نہیں تو......'

'کسی سے چھپ رہی ہے......؟'

'ہاں......'

'مار پڑے گی......؟'

'ہاں جی......'

تخنتے والے عمران چا نے دروازہ بند کیا......اور میں ان کی لنگیوں میں چھپی تھی......میں خوفزدہ تھی......مگر دیواروں پر جھولتے ہاتھی اس وقت مجھے برے نہیں لگ رہے تھے......عمران چا میرے گالوں کو چوم رہے تھے......اور......وہ آہستہ سے بولے......

'ہاتھی کو بند کمرے میں دیکھا ہے......؟'

'نہیں......تو......'

باہر سے قرآن شریف کی تلاوت کی آواز یہاں تک گونج رہی تھی......

میں نے برہنہ جسم اور برہنہ جسم میں جھولتے ہوئے ہاتھی کی سونڈ کو پہلی بار اس طرح دیکھا تھا...... میں خوفزدہ تھی...... میں تختے والے عمران چا کے جسم میں جھولتی ہوئی بے جان سی تختہ بن گئی تھی...... سیڑھیوں پر آہٹ گونجی تو عمران چا نے جلدی سے لنگی باندھی۔ کرتا ڈالا...... دروازہ کھولا...... سر پر دو پلی ٹوپی چڑھالی۔ داڑھی کے بال پورے سفید ہو چکے تھے......

سیڑھیاں پار کرتے ابو چھت پر آ گئے تھے۔ میری طرف غصہ سے دیکھا......

'قل ھواللہ والے چنے گرا کر آئی ہے......ابو نے عمران چا کو دیکھا......مولوی صاحب آ گئے ہیں۔ فاتحہ اب شروع ہوگا......

چلیے ......میں تو تیار ہوں......

ابو سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے...... میرے ننھے جسم میں آگ لگی تھی...... میں تھر تھر کانپ رہی تھی...... چھت، کمرے، اوسارا، برامدہ...... یہاں تو ہر جگہ ہاتھی کی سونڈ تھی...... دیواروں سے لے کر کمروں تک ہر جگہ الگ الگ ہاتھی جھول رہے تھے......

میں نے پیشانی پر آتے ہوئے پسینہ کو پوچھا۔ تختے والے چچا کو دیکھا...... جو ابھی تک کھڑے تھے......

'ہاتھی بددعائیں دیتا ہے......خبردار ندو......کسی کو بتانا مت......'

'کیا......'

'ہاتھی......' وہ مسکرائے......اچھا چلتا ہوں۔ قرآن شریف بھی تو پڑھنا ہے......

وہ تیز تیز سیڑھیاں اتر گئے......

اگربتی اور لوبان کی مہک یہاں تک آ رہی تھی......اب مجھ پر وحشت سوار تھی...... مجھے مردوں سے، اپنے آپ سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی...... کیوں کرتے ہیں یہ بوڑھے خبیث اس طرح کی حرکتیں......؟ کس لیے کرتے ہیں......؟ کیوں اتنے بے شرم بن جاتے ہیں......اماں کہتی ہیں......اب پردے والے غسل خانے میں نہیں نہانا ہے۔ میرا بدن بولنے لگا ہے...... مجھے ہر وقت حجاب ڈالنے کی عادت ڈالنی ہوگی......

میں غصے کی آگ میں جل رہی تھی......اور یہ کہنا سچ ہوگا کہ پہلی بار مذہب بھی میرے غصے کے نشانے پر تھا۔

خدا نہیں ہے......

میں دل میں بار بار اس بات کا اقرار کرتی تھی۔

خدا ہے ہی نہیں......

یہاں کے مردوں نے مذہب کو اپنی اپنی لنگیوں، داڑھی اور ٹوپیوں میں سی لیا ہے۔ اور جب دیکھو، ان کے اندر کا جنگلی جانور بھی سامنے آ جاتا ہے۔ جانور جاتا تو سجدے جاگتے۔ سجدے سے اٹھتے تو پھر جانور لنگیوں سے باہر آنے کو بے چین رہتا......

اور اس درمیان گھر میں دو حادثے اور ہوئے۔

سعودی میں خدیجہ آپا کا انتقال ہو گیا۔ اور انتقال کے دو ہی ماہ بعد نوشے بھائی نے وہاں دوسری شادی بھی کر لی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا......اپیا کو زہریلی دوا اور انجکشن دے کر مارا گیا ہے۔ نوشے بھائی کا اپیا سے دل بھر گیا تھا۔ اور کسی سولہ سال کی لڑکی پر دل آ گیا تھا۔ اب جو لڑکی ان کی زوجیت میں ہے، وہ صرف سولہ سال کی ہے—

میں سوچتی تھی۔ یہ مردوں کا دل اتنی جلد بھر کیسے جاتا ہے......؟ نوشے بھائی کو اگر اپیا کو نہیں رکھنا تھا تو طلاق دے دیتے۔ مارا کیوں......؟ مگر ننھی عمر میں ان سوالوں کا جواب نہیں ملتا تھا......

مگر ایک بات جان گئی تھی۔ دل بھر جائے تو یہ مرد مار دیتے ہیں۔ دل بھر جائے تو یہ مرد دھکا دے کر بھگا دیتے ہیں......دل بھر جائے تو یہ مرد دوسری تیسری اور چوتھی تک لے آتے ہیں......

اور یہاں تو عورتیں بے حیا کے جنگلی پودوں کی طرح اگتی ہیں۔ جونا گڑھ کی حویلی کے باہر کے حصے میں دور تک بڑا میدان تھا۔ یہاں لڑکے

ہر طرح کے کھیل کھیلتے تھے۔ میدان میں جنگل جھاڑ اگے ہوئے تھے۔ اماں نے بتایا تھا...... یہ بے حیا کے پودے ہیں۔ کہیں بھی اگ جاتے ہیں......اور یہی لفظ میں بھی بار بار سنتی تھی...... بے حیا ہوگئی ہے۔ پردہ کر...... حجاب ڈال......لڑکیاں بے حیا کے پودوں کی طرح پھیلتی جا رہی تھیں......ایک سے جی بھر گیا۔ دوسری حاضر......لو جی...... میں آگئی......دوسری سے جی بھر گیا......تیسری حاضر......اور مردوں کا جی تو بھرتا ہی بھرتا ہے......ایک جسم سے کب تک کام چلائے گا مرد...... میں ابا کو دیکھتی تھی جو اماں کے پاس کبھی بھول کر نہیں جاتے تھے......اماں بس ابا کی مار کے لیے تھیں—جی چاہتا تھا......ذرا بڑی ہوگئی تو ان ہاتھوں کو تھام کر مروڑ دوں گی......اور چیخ کر کہوں گی...... جونا گڑھ کے ہجڑے......

...... یہاں سب ہجڑے تھے......

مجھے اس نئے نام سے تقویت ملی تھی......

خدیجہ آپی کے بعد ایک اور حادثہ ہوا تھا۔ امتیاز بھائی نے نازیہ کو گھر سے نکال دیا تھا۔ ان پر الزام تھا کہ یہ حرافہ ہے۔ محلے کے نوجوان چھوکروں سے آنکھیں لڑاتی ہے۔

بے حیا......حرافہ......کمینی......

مجھے وہ منظر یاد ہے۔ لوہے کے بڑے سے بکسے کے ساتھ باہر نازیہ اپو کا رکشہ رکا تھا۔ اجو ماموں نے آواز لگائی۔

’بو بو......نازیہ آگئی......‘

اماں دالان والے کمرے سے نکل کر آئیں......اجو ماموں نے نازیہ اپو کا بکسہ تھام رکھا تھا۔ بکسہ چوکی پر رکھا۔ ابو آئے— نہ سلام نہ کلام...... نازیہ اپو کو دیکھا...... واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اماں صحن کا پردہ تھامے نازیہ کو دیکھ رہی تھیں۔ جسم میں کوئی ہلچل نہیں۔ اتنے زلزلے گزر جانے کے بعد جسم میں ہلچل کہاں رہ جاتی ہے—اماں مجبور، لاچار اور بے بس تھیں—نازیہ اپو چوکی کے کنارے بیٹھ گئی۔ چہرہ سپاٹ اور بے جان......لاش جیسا سرد......ایک طرف کرسی پر بیٹھے تھے اجو ماموں...... ماحول میں خاموشی طاری تھی......

اجو ماموں نے اماں کی طرف دیکھا۔ پھر نازیہ سے پوچھا......

’محلے میں کس لڑکے سے ملتی تھی۔‘

جواب میں خاموشی رہی—

’ملنا نہیں چاہئے تھا نا......؟‘

جواب میں اس بار میں بھی خاموش رہی۔

’کون تھا لڑکا؟ کس کا لڑکا تھا؟‘

اس بار اماں نے آنکھوں کے ساتھ ماموں کو پنجہ دکھایا۔ ماموں نے ہونٹ سی لیے۔ اماں نازیہ اپو کے پاس آئیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھا...... دونوں کی آنکھوں میں آنسو کا نام ونشان نہیں۔ میں نازیہ اپو کے سرد اور بے جان ہاتھوں کو تھامے ہوئی تھی......

’چلو کمرے میں......‘

نازیہ اپو پتھر کے مجسمہ کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کر اماں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگئیں— کبھی یہ کمرہ ہم بہنوں کے نام تھا......آہستہ آہستہ یہ کمرہ خالی ہوگیا۔ ویران دیواریں— دیواروں سے جھولتے مکڑی کے جالے—ایک بڑی سی چوکی۔ چوکی پر رکھی ہوئی میلی سی چادر— تکیہ کے سہارے دیوار سے ٹیک لگا کر نازیہ نے پہلی بار امی کو دیکھا۔ آنسو کے قطرے جھلملائے...... باندھ ٹوٹ گیا......

’مجھ پر غلط الزام لگائے گئے اماں......‘

’جانتی ہوں......‘

’میں ایسی نہیں ہوں......‘

’چپ کر......‘

’شادی کے بعد امتیاز کے گھر والوں نے مجھے ایک دن بھی قبول نہیں کیا۔ کہتے تھے کوئی اور آتی تو جہیز لے کر آتی۔ تو کیا لائی۔ بھک منگن۔

ناجائز حمل لے کر میرے بیٹے کو پھانس لیا...... صبح شام اٹھتے بیٹھتے صرف گالیاں تھیں۔ میں اس گھر میں بار بار مرتی تھی اماں...... ہر وقت مجھے گھر کے نام پر جلی کٹی سنائی جاتی تھی...... اماں میں مرجاؤں گی...... میں جان دے دوں گی اماں......'

اماں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے نازیہ کو دیکھا— 'خدیجہ جا چکی— شاذیہ بھی گئی۔ اب تو بھی جان دے دے...... بہتر ہے کہ میں ہی جان دے دوں...... ندو کو بھی زہر کھلا دوں اور تم کو بھی...... اور خود بھی کھا کر سو رہوں......'

اماں کی آنکھیں بارش بن گئی تھیں۔

میں نے زندگی میں اماں کو بہت کم روتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر اماں نازیہ اپو کا ہاتھ تھامے سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھیں— میں پاس میں ہی تھی۔ اماں اور نازیہ اپو کی باتیں سن رہی تھی...... میرا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا...... ایک غصہ تھا جو آہستہ آہستہ ابال لے رہا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ یہاں کے ایک ایک مرد کو جان سے مار دوں...... ان کے کھانے میں زہر ملا دوں...... ان مردوں نے کمینگی کی انتہا کر رکھی ہے۔ ان کے نشانے پر عورت ہے۔ الزام لگانے کے لئے۔ قتل کرنے کے لئے۔ گھر سے نکالنے کے لیے۔ وہ عورت کب پیدا ہوگی جو ان مردوں کو گھر سے نکالے گی...... جوان مردوں کا استقبال تھپڑ سے کرے گی......

اماں نے آنسو پوچھ لیے تھے...... وہ آہستہ آہستہ نازیہ اپو سے کہہ رہی تھیں......

سن نجو...... میری بات دھیان سے سن۔ یہ ایک گھر دس محلے کا کنبہ ہے۔ باتیں تو بنیں گی۔ اور کون بنائے گا۔ یہی اپنے بنائیں گے۔ الزام لگانے کوئی باہر سے دشمن تھوڑے ہی آتا ہے۔ الزام لگانے والے گھر کے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر تجھے ہمت رکھنی ہوگی۔ برداشت کرنے کی طاقت ڈالنی ہوگی۔ مجھے صدمہ ہے کہ میں تیرے لیے سایہ دار درخت نہیں بن سکی۔ یہاں ڈولی اتری، تبھی سے میرے پر کاٹ دیئے گئے...... میرے پاس آواز بھی نہیں ہے۔ تجھے بھی آواز نہیں کرنی ہے ورنہ یہ جو کمرہ ہے نا...... اس کے دروازے بھی یہ لوگ تیرے لیے بند کر دیں گے۔ میں جانتی ہوں سمجھ دار کو اتنا اشارہ کافی ہے۔ آگے اللہ کی مرضی......'

'میں سمجھ سکتی ہوں اماں'

مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں اندر ہی اندر گھٹن کا شکار تھی...... لڑکیاں کیا مرنے کے لیے ہوتی ہیں؟ زندگی میں ایک عورت کتنی بار مرتی ہے؟ یہ مرد کیوں نہیں مرتے......؟ اماں اگر یہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں تو اماں نے کبھی آواز اٹھانا مناسب کیوں نہیں سمجھا۔ اگر امتیاز بھائی نے نازیہ کو نکال دیا تو ان کا کیا قصور...... حقیقت یہ ہے کہ میں اندر ہی اندر آگ جمع کر رہی تھی۔

ابو کو نازیہ اپو کا آنا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھے گالیاں دے رہے تھے...... میں نے اپنی سگی بیٹی کو اس طرح کی گالیاں دیتے ہوئے پہلی بار سنا تھا......

(3)

اجو ماموں کے پورے وجود سے مجھے نفرت تھی۔ ان کا دل سوائے عورتوں کے کہیں نہیں لگتا تھا۔ پنج وقتہ نمازی تھے لیکن عورتوں میں گھرے رہتے۔ اماں کے دور کے رشتے کے بھائی تھے۔ جوانی میں ہی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ یہیں پڑے رہتے تھے بلکہ روٹیاں توڑتے تھے۔ میں نے جونا گڑھ کے ان مردوں میں بہت کم کو باہر کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے پاس جائیداد تھی۔ کھیت تھا اور یہ لوگ بس ایک گھر سے دوسرے گھر گھومتے رہتے تھے۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ نا کارے لوگ تھے۔ افواہیں پھیلانا ان کا محبوب پیشہ تھا۔ جہاں بیٹھ جاتے وہاں غیبت شروع ہو جاتی۔ بچوں کی شادی کرنی ہوتی تو کھیت بدھار کے بٹوارے شروع ہو جاتے۔

میں اسی ماحول میں جوان ہو رہی تھی۔

نازیہ اپو نے کچن سنبھال لیا تھا۔ امتیاز بھائی کے گھر سے نہ بلاوہ آیا نہ یہاں سے کوئی معافی مانگنے ان کے گھر گیا—

اس دن دوپہر کے دو بجے تھے—

ابو باہر گئے تھے۔ حویلی سنسان پڑی تھی۔ اجو ماموں کو دیکھا، چوری چھپے نازیہ اپو کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ باہر سے مرغیوں کی غٹرغوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ دروازے پر نازیہ اپو کھڑی تھیں۔ پھر دروازہ بند ہوگیا۔

میں سہمی ہوئی باہر کھڑی تھی......

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ چوروں کی طرح لنگی سنبھالے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اجو ماموں تیزی سے برامدہ پار گئے۔

میں حیرت کی وادیوں میں تھی۔

اندر ہی اندر غصے سے پیچ و تاب کھائی ہوئی۔

میں اتنے غصے میں تھی کہ خود کو روک نہیں پائی۔ تیز تیز چلتی ہوئی نازیہ اپو کے کمرے میں گئی تو وہ شلوار برابر کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ایسے چونک گئیں جیسے چوری پکڑ لی گئی ہے......

'تم......'

'ہاں......میں......'

'کیا بات ہے ندو......'

'اجو ماموں کیوں آئے تھے......؟'

وہ......؟ نازیہ اپو کا چہرہ اچانک پتھر ہوگیا۔

'میں جانتی ہوں کیوں آئے تھے......'

'پتھر کے مجسمے میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی—'

'آپ نے دروازہ کیوں بند کیا؟'

'وہ......'

'میں جانتی ہوں کوئی جواب نہیں آپ کے پاس...... امتیاز بھائی نے اچھا کیا جو آپ کو نکال دیا۔ آپ اسی کے لائق ہیں۔ اب وہ کہانیاں...... مجھے جھوٹی نہیں لگ رہی ہیں۔ اللہ کے واسطے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہیے گا۔ میں آپ کی عزت کرتی تھی۔ لیکن آج آپ میری نگاہوں سے گر گئی ہیں ناز و اپو......'

'بھوک لگتی ہے مجھے......' ناز و اپو زور سے چلائیں...... میرے اندر کی بھوک جگا کر مجھ سے انتقام لیا جاتا تھا۔ جب بھوک لگتی ہے تو اچھے برے، جائز ناجائز کا فرق ختم ہو جاتا ہے...... نازیہ اپو رو رہی تھی......' تو ان باتوں کو کیا جانے گی۔ لیکن بھوک کا کوئی علاج نہیں ہے...... سہتے سہتے برداشت کی حدیں ختم ہو گئی تھیں۔'

میں نے نفرت سے نازیہ اپو کی طرف دیکھا۔ ان کی باتوں میں کوئی دم نہیں تھا۔ اجو ماموں جیسے مرد کے لیے ان کی خود سپردگی نے میرے دل میں ان کے لئے نفرت پیدا کر دی تھی......

خدا کے لیے بھی میری نفرت بڑھتی جا رہی تھی...... اتنا کمزور کیوں بنا دیا عورت کو؟ جسم سے بڑی بھوک کیوں بنا دی......؟

امرود کے پیڑوں پر کوے آیا کرتے تھے۔ سیانے کوے۔ شاطر کوے۔ مجھے یہ مرد کی ذات کووں سے زیادہ سیانی لگتی......

میں، نکہت، انجم ڈنگا پانی کھیلتے ہوئے زور زور سے گاتے......

ابو میرے گھر میں دیکھو...... لال پری کا دانہ ہے۔

جو بھی ہے یہاں سیانہ ہے......

انجم میری خالہ زاد بہن ہے۔ وہ میرے ہی محلے میں رہتی ہے...... انجم پوچھتی۔

'اس گھر میں سب سے سیانہ کون؟'

نکہت کہتی۔ گبرو دادا......

'اجو ماموں......'

'اور کون......؟'

'ابو چاچا......'

'دھت...... سارے مرد ہی سیانے ہیں......'

وقت تیزی سے پر لگا کر اڑ رہا تھا۔

اس دن عظیم بھائی زبردستی ہاتھ تھام کر چھت پر لے گئے...... وہی کھوبر والا کمرہ...... میں نے زور سے کہا— نا......

کیوں؟ عظیم بھائی کے تیور سخت تھے......

'نا...... تو...... نا......'

'پہلے تو اتنی زور سے نا نہیں کہتی تھی......'

سینے پر چکوٹی بھری تو میں نے بھی تیز لات چلا دی...... بالکل اسی مقام پر...... عظیم بھائی کراہتے ہوئے زمین پر گر گئے۔ گالیاں بکنے لگے...... میں زور زور سے ہنسنے لگی......

وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ پرانی نسل گم ہو رہی تھی۔ اور نئی نسل ٹھیک ان کی جگہ لے رہی تھی اور جونا گڑھ کی اس حویلی میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا— کہانیاں وہی تھیں۔ شوق وہی تھے۔ یہاں عمر کا لحاظ نہیں تھا اور ننھی ننھی بچیوں میں بھوک مٹانے کے نئے نئے طریقے آزمائے جاتے تھے...... شاید آس پاس بھی یہی ہو رہا تھا۔

میں سترہ سال کی ہو گئی تھی۔ ابا پڑھائی کے سخت خلاف تھے۔ مگر میں اپنی جگہ ڈٹی رہی۔

مجھے پڑھنا ہے تو پڑھنا ہے......

’پڑھ کر کون سا تیر مار لوگی؟‘ ابا نے پوچھا......

’تیر ہی تو ماروں گی......سب کو—‘ پہلی بار میں نے ابا کا مقابلہ کیا تھا۔لیکن ابو کے چہرے کے تاثرات نہیں پڑھ سکی۔ وہ کمزور ہو گئے تھے۔ میری بات سننے کے بعد ایک لمحہ بھی رکے نہیں۔ باہری دروازے سے نماز کے لیے نکل گئے۔

مسجد میں محلے کے سارے خرافاتی بوڑھے جمع ہوتے تھے۔اوران کے پاس سوائے غیبت کے اور کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔کس کی لڑکی فاحشہ ہے۔کس کی حرافہ۔کس نے کتنے حمل گرائے۔ یہ باتیں چوری چھپے سنتی آئی تھی۔اجو ماموں سن کر آتے تو اماں کو بتایا کرتے—اماں صرف ہوں ہاں کر کے رہ جاتیں۔اماں کو اس طرح کی باتوں کا جواب دینا نہیں آتا تھا......

لیکن میری دنیا بدل رہی تھی اور اس دنیا میں، میں بالکل اکیلی تھی۔ جب بھی تنہا ہوتی، وحشت کے گھنگھروؤں کی موسیقی ابھرنا شروع ہو جاتی......ایسا محسوس ہوتا جیسے میری عمر کی لڑکیوں کے لیے تنہائی بھی موت کا دروازہ ہے......مرد کی خوفناک آنکھیں شکار تلاش رہی ہیں......میں سوچنے سے قاصر تھی کہ یہ سب یہیں ہوتا ہے یا یہ سب دوسرے گھروں میں بھی ہوتا ہے۔حویلی میں نئی دنیا کی کوئی دستک نہیں تھی۔شاید یہ لوگ نئی دنیا کی آہٹوں یا دستکوں کو بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ان سب کے لیے ماضی ایک اثاثہ تھا اور یہ اسی ماضی میں سانس لیتے ہوئے عمریں گن رہے تھے۔نئی روشنی انہیں گوارہ نہیں تھی۔یا انہیں شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ نئی روشنی کی آمد ان کی سلطنت کے شیرازے بکھیر سکتی ہے۔

انہی دنوں ایک اور حادثہ ہوا تھا۔ایک ایسا حادثہ جس نے میری دنیا کو پلٹ دیا تھا۔

یہ میری عمر کا اٹھارواں سال تھا۔

(4)

وہ حادثہ، جس نے میری زندگی بدل دی......کتنا تکلیف دہ حادثہ تھا......میرے لیے اس حادثہ کو بھول پانا مشکل تھا۔دادی اماں کی کہی ہوئی باتیں یاد آرہی تھیں۔ یہاں سب مرد ہیں......پیڑ پودے بھی پیڑ پودے کہاں ہیں......یہ بھی مرد ہیں۔جنگلی بلا۔غراتا ہوا......اوران جنگلی بلوں کو غرانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔شکار تو اپنے ہی گھر میں موجود تھا۔بس ہاتھ بڑھا کر دبوچنے کی ضرورت تھی۔مگر اس حادثہ سے پہلے ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے......اماں نے مکتب میں بیٹھایا تھا۔ایک بڑی بڑی داڑھی والے مولانا تھے جو قرآن شریف پڑھانے آیا کرتے تھے۔ مجھے ان کا سیاہ چہرہ اور سفید داڑھی سے ڈر لگتا تھا۔اوپر سے چیچک کے داغ۔مولوی صاحب رات کے آٹھ بجے آیا کرتے......اماں سر پر آنچل ڈال کر بھیجا کرتیں......مولوی صاحب پڑھانا شروع کرتے تو خادمہ پہلے چائے لے کر آتی پھر ایک طشتری میں پان کی دو گلوریاں رکھ کر بھیجی جاتیں۔دو ایک دن تو ٹھیک چلا......پھر مولوی صاحب جب میری کسی بات سے خوش ہوتے تو زور سے گال میں چکوٹی کاٹتے......زیادہ خوش ہوتے تو مجھے کھینچ کر گود میں بیٹھا لیتے......ادھر ادھر دیکھتے......اور گود میں بیٹھا کر ہی سبق یاد کراتے رہتے......کئی باد مجھے کراہیت محسوس ہوئی......ابو یا کوئی ملنے والا آجاتا تو مولوی صاحب زور زور سے سبق یاد کرانے لگتے......اب لگتا ہے......حویلی آنے والے سارے کے سارے مرد تھے۔دودھ والا—سبزی والا......کپڑے والا......ان کا بس نہیں چلتا تھا......جن کا بس چلتا تھا وہ جھاڑی سے سانپ برامد کر لیتے تھے......

اماں کہتی تھیں کچھ برا سوچو تو وضو ٹوٹ جاتا ہے......

’اچھا جی......‘

اس رات اچانک لائٹ چلی گئی تھی......مولوی صاحب نے زور سے کہا......

'ڈرنامت......'

مجھے گود میں کھینچ لیا...... میں محسوس کر رہی تھی...... دیوار پر جھولتے ہاتھی نے پھولنا شروع کر دیا ہے...... میں نے مولوی صاحب کا ہاتھ جھٹکا......اور غصے میں بولی......

'آپ کا وضو نہیں ٹوٹتا......'

'کیا......؟'

'آپ قرآن شریف کے سبق یاد کراتے ہیں......'

روشنی آ گئی تھی......روشنی میں پلکیں جھپکاتے ہوئے مولوی صاحب کا چہرہ ایسا لگتا تھا جیسے اڑتی چڑیا نے چہرے پر گندگی ڈال دی ہو......

اب سوچتی ہوں......ہم محفوظ کہاں تھے؟

باہر تو باہر......ہم گھر میں بھی کہاں محفوظ تھے......

گھر میں جانوروں کی فوج تھی اور ہر جانور موقع کی تاک میں......دشواری یہ تھی کہ گھر میں ان کی شکایت بھی نہیں کی جا سکتی تھی......

میں اسی ماحول میں بڑھتی ہوئی 19 سال کی ہو گئی تھی کہ اچانک وہ حادثہ ہو گیا......

بڑے چچا کی اکلوتی لڑکی نکہت......

میں صبح سے اسے تلاش کر رہی تھی......نکہت کہاں ہے؟ انجم سے پوچھا......مہرو سے دریافت کیا......مگر کسی کو نکہت کا پتہ نہیں تھا......سورج غروب ہو رہا تھا......اماں کہتی تھیں کہ مغرب کی نماز کے بعد کتابیں نکال کر بیٹھ جایا کرو...... میں کتاب نکالنے جا رہی تھی کہ اچانک آہٹ سن کر چونک گئی......

مرجھائی ہوئی آواز سنائی پڑی......ندو......

میں نے مڑ کر دیکھا......دروازے کے پاس نکہت کھڑی تھی — لیکن برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ چہرے کی ہنسی مسکراہٹ کو جیسے کسی کی نظر لگ گئی تھی۔نکہت کا ایسا مرجھایا ہوا چہرہ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا —

میں پھٹی پھٹی حیران نگاہوں سے نکہت کو دیکھ رہی تھی......

'بیمار ہو......'

'نہیں۔'

کسی نے ڈانٹا یا مارا ہے......؟

'نہیں......؟'

'پھر کیا بات ہے نکو......'

نکہت نے سہمے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ پھر کمرے میں آ کر دروازہ بند کر دیا......

'دروازہ کیوں بند کیا......؟'

'میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے ندو......'

اچانک جسم میں جیسے بجلی دوڑی ہو۔نکہت مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی — اس کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

'نکہت......ہوش میں آؤ۔ بتاؤ تو سہی۔ ہوا کیا ہے......'

'میں کچھ نہیں جانتی۔مگر یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے......'

'کیوں مار ڈالیں گے؟' میں نے غصے سے کہا......

'میں جانتی ہوں......وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے......'

’مگر کیوں؟‘ میں زور سے چلائی......ایسا کیا ہوگیا ہے کہ وہ لوگ تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے......

نکہت نے آنسو پوچھے۔ میری طرف دیکھا......اس کے لب کانپ رہے تھے......

’آج سارادن چھپی چھپی پھرتی رہی......سارادن مجھے الٹی ہوتی رہی......‘

’اُلٹی......؟ قئے......؟‘

’ہاں......‘

مگر......؟ مگر کہتے ہوئے میں اچانک چونک گئی تھی۔ میرے چہرے کا رنگ تبدیل ہو چکا تھا...... میں نے غور سے نکہت کے چہرے کا جائزہ لیا......اس نے آنکھیں جھکا لیں......

’کہیں تم......؟‘

’ہاں......‘

’اُف میرے خدا......‘ میں نے نکہت کے سرد ہاتھوں کو چھوڑ دیا...... یہ غلطی کیسے ہوئی نکہت......اتنی بڑی غلطی......‘

’بس ہوگئی...... میں نہیں جانتی مگر......‘

میری آنکھوں میں آسیبی پرچھائیوں کا رقص شروع ہو چکا تھا...... میں خوف سے کانپ رہی تھی......

’تم مطمئن ہو کہ......؟‘

’ہاں......‘

’مگر یہ کس کا ہوسکتا ہے......؟‘ میں نے چبھتی ہوئی آنکھوں سے نکہت کو دیکھا......وہ سر جھکائے اب بھی رو رہی تھی......

’عظیم بھائی؟‘

’نہیں۔‘

’اجو ماموں......؟‘

’نہیں......‘

تختے والے چاچا......؟

نہیں......

ابو چاچا......؟

نہیں......

گبرو دادا، سلمان بھائی......؟

نہیں......نہیں......‘ نکہت سہمی ہوئی تھی......اللہ جانتا ہے مجھے کچھ نہیں معلوم...... میں یہ بھی نہیں جانتی کہ ان میں سے کون ہے جس کی وجہ سے آج میری یہ حالت ہوگئی ہے......‘ نکہت اب بھی رو رہی تھی......تم نہیں جانتی ندو۔ مگر میں ان گھر والوں سے واقف ہوں۔ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ماردیں گے مجھے...... مجھے مرنے کا غم نہیں ہے ندو......مگر ایسی رسوائی کی موت نہیں چاہتی میں......کہ مرنے کے بعد بھی لوگ مجھے برے ناموں سے یاد کریں......ندو......تم تو سب کچھ جانتی ہو...... بتاؤ......ہم لوگوں کا قصور کیا ہے...... یہ لوگ بچوں کو بچہ کہاں رہنے دیتے ہیں......ندو...... میری کوئی غلطی نہیں......مگر......جس کو بھی موقع ملا...... میری غلطی یہ تھی کہ میں بے زبان تھی......اس گھر میں زبان کس لڑکی کو ہے؟ یہاں ہمیں کچھ بھی بولنے کہاں دیا جاتا ہے......بس خوفناک پنجے ہوتے ہیں— گدھوں کی طرح......ہمیں دبوچنے کے لئے...... ہماری ٹکا بوٹی کرنے کے لئے...... یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے ندو......‘

’کوئی نہیں مارے گا تمہیں۔ میں ہوں نانکو......‘

میں بھی نکہت کے ساتھ رو رہی تھی...... یہ اچانک زمین کیسے ہلنے لگی...... دنیا کیسے بدل گئی...... یہ اچانک کیا سے کیا ہوگیا......اگر گھر کے

بڑے بوڑھے سنیں گے تو...... یہ مجھے معلوم تھا اس کا انجام کیا ہوگا— نکہت بھی اس انجام سے واقف تھی...... مگر کون پوچھتا......

'کیوں اپنے ساتھ لنگیوں میں جنگلی بلے کو لیے گھومتے ہو تم لوگ......؟'

کیوں، یہاں گھر کی ہر دیوار پر موٹی موٹی سونڈھ والے ہاتھی جھولا کرتے ہیں......

شرافت کی آڑ میں ننھی ننھی بچیوں کا شکار کرتے ہوئے شرم نہیں آتی......؟

مگر کس سے پوچھتی......سوالوں کا ہر دروازہ بند تھا۔ یہاں سوال بھی مردوں کے پاس تھے اور جواب بھی۔ اور باقی بھیڑ بکریاں جن کے نصیب میں ذبح ہونا لکھا تھا۔

▪▪

دوسرا دن قیامت کا دن ثابت ہوا۔

صبح ہوتے ہی یہ قیاس لگانا آسان تھا کہ نکہت کے حاملہ ہونے کی خبر گھر والوں کو مل چکی ہے—اس حویلی نما بوڑھے مکان میں کتے اور بلیوں کے رونے کی آوازیں سن رہی تھی۔ اماں کا چہرہ سہما ہوا تھا۔ ابو پریشان حال برامدے میں ٹہل رہے تھے— ہمیں کمروں سے باہر آنے پر پابندی تھی۔ شاید خیال رہا ہو کہ ایسی خبروں کی بازگشت ہمیں بھی گمراہ کرسکتی ہے......

میں نکہت سے ملنا چاہتی تھی۔ میں نکہت کو دیکھنا چاہتی تھی......

میں نے اماں سے اشاروں میں نکہت کا نام لیا تو انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

'چپ رہ۔ گھر میں قیامت آچکی ہے۔'

میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا...... 'کیسی قیامت اماں......؟'

'آج کل دیواروں کے کان نہیں ہوتے— تجھے بھی خبر مل جائے گی۔ تیرے ابو نے کہا ہے کہ تجھے کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔'

'ابو کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے۔'

'ملنے گئی تو اپنی جان کی خیر منانا۔ اس حویلی کے مردوں کے عتاب سے ابھی تو واقف نہیں۔'

'میں واقف ہونا بھی نہیں چاہتی اماں۔ مگر میں پابندیوں میں نہیں جی سکتی۔ مجھے معلوم تو ہونا چاہئے کہ آخر اس گھر میں کیا چل رہا ہے،'

'میں نے کہا نا......دیواروں کے اب کان نہیں ہوتے۔'

'یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی اماں۔'

'قیامت کہہ کر نہیں آتی ندو۔ سمجھ لے۔ قیامت آچکی ہے۔ نکہت کی خیر نہیں۔'

میں نے اماں کی آنکھوں میں منڈلاتے آنسوؤں کو پڑھ لیا تھا۔ مجھے نکہت کا چہرہ یاد آرہا تھا...... وہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے......لیکن میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا کہ جنہیں سزا ملنی چاہئے وہ تو عیش کریں اور غریب نکہت کو لڑکی ہونے کی سزا مل جائے۔

میرے لیے سوچنے کی بات یہ تھی کہ جب راز کھل چکا ہے تو اس گھر کے بڑے بوڑھے نکہت کے ساتھ کیا سلوک کرسکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ اور مجھے بھی اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ یہ لوگ اپنی شرافت کے ڈھونگ میں نکہت کی جان لے لیں گے......

اور میرا اندازہ سچ ثابت ہوا تھا۔

اس حادثے کے ٹھیک چوتھے دن نکہت نے زہر کھا لیا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ نکہت نے زہر کھا کر خودکشی کی یا اس کو زبردستی زہر دے کر مار دیا گیا۔ کیوں کہ بوڑھی حویلی کے شرافت پہ نگہبان اپنی رسوائی سے بچنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتے تھے۔ اور ہر بار سولی پر چڑھنے کے لیے عورت تو ہوتی ہے—

میں چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ نکہت کی تصویر بار بار آنکھوں کے آگے گھوم رہی تھی۔ اچانک ایک لمحہ میں جیسے ساری دنیا بدل گئی۔ ان لوگوں

نے نکہت کو مارڈالا۔ یہ لوگ مجھے بھی مارڈالیں گے۔

آنکھوں کے آگے نیلی پیلی سیاہ پرچھائیوں کا رقص جاری تھا...... مجھے اچانک احساس ہوا...... میں دوڑ رہی ہوں...... تیز بہت تیز......اور اچانک میں ٹھہر گئی ہوں...... چاروں طرف مکڑی کے جالے......اوران جالوں کے باہر گھر میں موجود مردوں کے چہرے تھے...... میں ان میں سے ہر چہرے کو پہچانتی تھی۔ مگر میری سمجھ سے باہر تھا کہ پیدا ہوتے ہی لڑکیوں کو پاکیزگی، حیا، کردار کی تعلیم دینے والے، سبق پڑھانے والے ان مردوں کے ہونٹوں سے ہر وقت رال کیوں ٹپکتی ہے......؟ حجاب میں رہنے کی تعلیم دینے والے ہمیں حجاب کے اندر اندر اتنا دیکھ لیتے ہیں کہ جسم کی کینچلی اتار پھینکنے کو جی چاہتا ہے......

یہ ہونٹ...... گٹر میں ڈال دوں......

یہ ابھرا ابھرا سینہ...... گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دلدل میں دفن کردوں...... یہ کلائیاں...... یہ جانگھیں...... یہ ناف......ایک بڑا سا چھرا لوں......اور بس کاٹتی چلی جاؤں—— بے رحم قصاب کی طرح...... کھچ کھچ...... کھچ کھچ......

میں گھر میں نظر بند تھی۔

میں اپنے کمرے کی طرف پلٹی۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں تھا۔کوئی آئے۔کوئی جائے۔جہنم میں جائے۔ میں آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے انگڑائی لی۔اوراپنے جسم کی طرف دیکھا...... آئینہ کی طرف اپنی ہتھیلیوں کو پھیلایا......

ایک پر شباب جسم سامنے تھا مگر اس وقت آئینہ کے عکس سے مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ پھر میں نے یکے بعد دیگرے سارے کپڑے اتار دیئے...... میں برہنہ تھی...... مجھے خوف نہیں تھا...... کپڑے اتارتے ہوئے میں خوف اتار رہی تھی...... پہلی بار مجھے آئینہ کو دیکھ کر وحشت ہوئی۔ آئینہ میں ایک خوبصورت جسم موجود تھا اور اس جسم سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے...... میں چیخنا چاہتی تھی...... میرے جسم میں آگ کے یہ شعلے کیوں رکھے ہیں۔کوئی پتھر یا لوہے کا کوئی ٹکڑا ہاتھ میں ہوتا تو میں آئینہ توڑ چکی ہوتی...... میں اچانک چونک گئی۔ کھلے دروازے سے اماں داخل ہوئی تھیں......اور اماں نے چیخ کر پوچھا تھا......

یہ کیا ہے؟

اماں نے جلدی سے دروازہ بند کیا—— 'پاگل ہوگئی ہے ندو۔گھر کا کوئی مرد آجاتا تو......؟'

'آجاتا تو کیا ہوتا......' میں طنز سے ہنسی...... 'تم تو ایسے کہہ رہی ہو اماں کہ کسی نے بھی......'

اماں نے ہاتھوں کو میرے منہ پر رکھا۔ 'چپ کر۔جلدی سے کپڑے ڈال۔'

'کیوں۔ایسے رہنے میں کوئی برائی ہے۔؟'

'ہاں......'

میں تو ایسے ہی رہوں گی۔آج سوچتی ہوں—— ایسے ہی سارے گھر میں گھومتی رہوں۔'

'خبط سوار ہے۔' اماں کی آنکھوں میں تشویش کی لہریں تھیں...... ایک کا جسم مٹی ہوگیا۔اورایک مٹی کے جسم کو کھولے کھڑی ہے۔'ہمیں یہ حق نہیں بیٹی۔ابنورمل مت بن...... کپڑے پہن لے۔'

اماں کی یہ بات بجلی کی طرح دماغ میں داخل ہوگئی۔ میں زور سے چیخی۔

'میں ابنورمل نہیں ہوں۔ہمیں کیوں کہا جاتا ہے ابنورمل۔ اور وہاں...... میں نے غصہ سے کہا۔ وہ جو سارے مرد بیٹھے ہیں۔اپنے اپنے گندے جسم کے ساتھ۔انہیں ابنورمل کیوں نہیں کہا جاتا۔بس دنیا ہمیں دیکھتی رہتی ہے۔کوئی کام مرد کی مرضی کے خلاف ہو تو ہم ابنورمل ہو جاتے ہیں۔اب دیکھنا اماں......اس گھر میں بہت کچھ بدلے گا......'

'کون بدلے گا......؟'

'میں بدلوں گی۔'

'تجھے یہ لوگ زندہ چھوڑیں گے؟'

'یہ پوچھ کہ میں ان لوگوں کو زندہ چھوڑوں گی؟'

'تو کیا کرے گی ان لوگوں کا؟ کچھ نہیں بگاڑ پائے گی۔'

'کیوں۔ ببر شیر ہیں یہ؟'

'ببر شیر سے بھی زیادہ خطرناک۔'

''پھر ان مردوں کو پنجرے میں کیوں نہیں رکھا جاتا۔ ہمیں کیوں رکھا جاتا ہے۔''

'شکار کرنے کے لیے۔' ایسا احساس ہوا کہ اماں اب رو دیں گی...... 'پنجرہ کھولا اور شکار کرلیا۔ ایک شکار ہوگئی نا......'

'دوسری شکار نہیں ہوگی۔'

'تو ان مردوں کے پنجے نہیں جانتی۔'

'شیر کے پنجے ہیں۔ اکھاڑ دوں گی۔'

میں نے لباس پہن لیا تھا۔ غور سے اماں کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ ایک پوری زندگی اماں نے اسی گھر کی چہار دیواری میں خوف ودہشت کے ساتھ گزار دی تھی۔ کیا میں گزار سکوں گی......؟

پنجرہ ہل رہا تھا......

مجھے اماں نہیں بننا۔

پنجرہ زور زور سے ہلنے لگا تھا۔

میں اس چہار دیواری میں رہی تو اماں بن جاؤں گی......

پنجرہ ہل رہا تھا۔ باہر سے کوئل کی کوک سنائی دے رہی تھی...... میرے اندر نفرت جمع ہورہی تھی...... ہر معصوم ذی روح سے...... کوئل...... گوریا...... چڑیا...... لڑکی...... مینا...... مرد شکاری کی طرح تعاقب میں ہے......

پنجرہ ٹوٹ گیا تھا۔

اور اسی کے بعد گھر کی چہار دیواری نے سونامی زلزلوں کی آہٹ محسوس کی تھی۔

(5)

'بھاگ رے بگولے......
اونچے اونچے ٹیلے
ٹیلے کے اوپر
مان سرور
مان سرور میں ڈبکی لگاؤں گی
'میں پھر نہ آؤں گی......'
کھیلتے کھیلتے نکہت شرارت سے مسکراتی تو میں پوچھتی......
'کیوں نہ آئے گی......'
مان سرور میں ڈبکیاں لگانے کے بعد کوئی واپس آتا ہے کیا؟'
'کیوں نہیں آتا؟'
'مان سرور سے پریاں اپنے ساتھ لے جاتی ہیں؟'
'کہاں......؟'
'وہاں......دور نیلے آسمان میں......'

پنجرہ ٹوٹ گیا تھا۔ نکہت میری آنکھوں کے آگے زندہ تھی۔ ہزاروں واقعات......کھیل کود......شرارتیں...... میں تنہا رہ گئی تھی......اور اس وقت میں اپنے ہی غصے کی آگ میں جل رہی تھی...... مجھے خبر ملی تھی......گھر میں پولس والے آئے ہیں...... میں برآمدے میں جاکر چھپ کر وہ منظر دیکھ رہی تھی۔

•••

جوناگڑھ کی زوال آمادہ حویلی گھر کے مردوں کے لیے رسوائی کا سامان لیے آئی تھی۔ بڑے بوڑھے اپنی غیرت اور عزت کو لٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے......لیکن اس وقت پولس کے چار آدمیوں کو ایک ساتھ دیکھ کر حویلی میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔

پولس......

یا اللہ رحم......

پردے کے اندر سے عورتوں کے رونے کی آواز ٹھہر ٹھہر کر آ رہی تھی۔ ابو آگے بڑھے۔ جھکی نگاہوں نے پولس والوں کی سنگین نگاہوں سے بچتے ہوئے چہرہ چھپا لیا۔

'میں چودھری زین العابدین......' آواز کانپ رہی تھی۔ صدیوں میں اس حویلی نے اپنی عزت اور ناموس کا خیال رکھا تھا۔ لیکن اب وقت بدل رہا ہے۔ اور بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ کچھ بھی سلامت نہیں۔'

ایک پولس والے نے بیڑی سلگائی۔ 'کتنا خیال رکھا ہے۔'

'یہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں چودھری صاحب۔'

دوسرے پولس والے نے قہقہہ لگایا۔ کچھ دن پہلے بھی نالے پر ایک لاش ملی تھی...... بچی کو پیدا ہوتے ہی نالے میں پھینک دیا گیا تھا۔'

زین العابدین نے نظریں اٹھانے کی کوشش کی۔ 'ہمارے خاندان کو ذلت اور رسوائی سے بچا لیجئے۔'

'کیا۔؟' پولس والا ٹھہا کا مار کر ہنسا— 'بدنامی اور کیا ہوتی ہے چودھری صاحب۔ چاروں طرف جگ ہنسائی ہو رہی ہے اور آپ کو بدنامی کی پڑی ہے۔ لاش تو پوسٹ مارٹم کے لیے جائے گی۔'

دوسرے پولس والے نے معنی خیز نظروں سے زین العابدین کی طرف دیکھا۔

'کیا پتہ۔ کنواری لڑکی کے ماں بننے کی خبر سن کر آپ ہی لوگوں نے زہر دے دیا ہو......'

••

میں اس سے آگے کچھ نہیں سن سکی۔ جلیبی چھن رہی تھی۔ گرم کڑاہی میں میدے کی چھوٹی چھوٹی لوئیوں کو جلیبی کی شکل دی جا رہی تھی...... کلٹا...... حرامی بچہ...... بے حیا...... بے غیرت...... چھنال...... کلنکی...... مجھے اتنا معلوم ہوا کہ پولس والے چلے گئے۔ سودا ہو گیا تھا۔ ذلت اور رسوائی کی دہائی دے کر ایک بے غیرت، بے حیا، بدکردار لڑکی نے بدنامی کا جو طوق گھر کے شریف مردوں کے گلے میں ڈالا تھا، اس شرافت کو نیلام ہونے سے بچانے کے لیے چند سکوں کا پیپر ویٹ رکھ دیا گیا تھا......

جلیبی چھن رہی تھی...... نکہت...... کلٹا...... بے غیرت......

کرچھی تیل میں گھوم رہی تھی...... جلیبی چھن رہی تھی۔ غیرت مندوں کے گھر میں ایک بے غیرت، بے حیا لڑکی کی لاش کمرے میں پڑی تھی......

مان سرور میں ڈبکی لگاؤں گی......

میں پھر نہ آؤں گی......

تیل اڑ رہے تھے۔ کرچھی ناچ رہی تھی...... چھن چھن...... جلیبی چھن رہی تھی...... اور اچانک میرے پاؤں میں حرکت آ گئی۔

اور یہی وقت تھا جب اچانک موسم تبدیل ہو گیا۔ تیز دھوپ بدلیوں کی آغوش میں گم تھی۔ آسمان سیاہ ہو گیا تھا۔ بجلی کڑک رہی تھی...... بارش کے آثار نظر آ رہے تھے۔

یہ برآمدہ تھا۔ جہاں میں کھڑی ہوئی تھی...... یہاں سے سیم کی شاخیں دور تک چلی گئی تھیں...... پولس والے چلے گئے تھے۔ یہاں سے دالان کا منظر سامنے تھا۔ چودھری زین العابدین سر جھکائے بیٹھے تھے۔

ابو چاچا زور زور سے بول رہے تھے— 'نامراد مرتے مرتے ناک کٹا گئی خاندان کا۔ پولس والا نہیں مانتا تو سارے شہر میں ڈھنڈھورا پٹ جاتا خاندان کا۔ ارے ایسی لڑکیاں تو پیدا ہوں اور گردن مروڑ کر زمین میں دفن کر دو......

اندر کمرے سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں...... گبرو دادا زور سے دہاڑے— 'عورتیں رونا بند کرو۔ بے حیا کے مرنے پر رویا نہیں جاتا...... سارے خاندان کی عزت نیلام کر کے گئی ہے کلٹا......'

کسی نے آہستہ سے کہا۔ بارش کے آثار ہیں۔ جنازہ دیر تک نہیں رکھنا چاہیے......

ابو چاچا آگے آئے۔ 'چار لوگوں کو لو۔ اور دفن کر آؤ قبرستان میں۔ عزت مٹی میں ملا دی کمبخت نے......'

دالان مردوں سے بھرا ہوا تھا...... چاروں طرف فکر میں ڈوبے ہوئے مرد۔ ذلت، بدنامی اور رسوائی سے نگاہیں جھکائے ہوئے مرد...... اور یہی وقت تھا جب چھناک سے دوڑتے ہوئے قدم دالان خانے میں آ کر رک گئے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح ان مردوں کی طرف دیکھ رہی تھی......

'کس نے مارا میری نکہت کو......؟'

اندر جاؤ۔ ابو کی زوردار آواز ابھری......

کس نے مارا میری نکہت کو۔ میں گلہ پھاڑ کر چلائی۔ پردے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اماں باہر چلی آئی تھیں۔ اماں میرا ہاتھ تھام کر اندر لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میرے آنسو خشک تھے۔ چہرہ پتھر اور میں تیز آواز میں چیخ رہی تھی۔

'کس نے مارا میری نکہت کو......آپ سب نے مل کر مارا ہے میری نکہت کو......'

'اندر چلو۔' اماں زور سے کھینچ رہی تھیں۔

'بے غیرت......' ابو چاچا کی آواز سنائی پڑی......

اور یہی لمحہ تھا جب اس لفظ نے میرے اندر کی غیرت کو جگا دیا تھا۔

'ہاتھ چھوڑو اماں۔' میں نے زور سے دھکا دے کر اماں سے ہاتھ چھڑا لیا— 'بے غیرت......آج کسی نے کچھ کہا تو میں کہہ رہی ہوں اتنا برا ہوگا کہ کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ بے غیرت......ارے کس نے کہا بے غیرت......اس گھر کے مردوں کو غیرت سے واسطہ بھی ہے......کس غیرت کی باتیں کرتے ہیں یہ لوگ......ارے اس گھر کی لڑکیاں تو پیدا ہوتے ہی ان مردوں کے سائز تک سے واقف ہو جاتی ہیں۔'

اماں نے ہاتھ گھمایا تھا مارنے کے لیے...... میں نے اماں کا ہاتھ روک دیا......— 'آج نہیں اماں......آج ہاتھ مت اٹھانا......آج کوئی میری طرف بڑھا تو جان سے مار ڈالوں گی۔ میں چلائی تھی...... یہ اجو چچا۔ گبرو دادا...... یہاں مرد اپنے گھر میں شکار کرتے ہیں۔ مرغیاں، بکریاں اور میمنے تک ان شریف مردوں کے سائز سے واقف ہیں۔'

'بس کرو۔' اماں نے زور سے چیخ کر کانوں کو بند کر لیا—

چودھری زین العابدین دروازے سے باہر نکل گئے تھے۔ اجو چاچا میری طرف بڑھے تو میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک بڑا سا پتھر اٹھا لیا۔

'کیا رشتہ تھا تم سے نکہت کا؟'

آگے بڑھتے بڑھتے اجو چاچا کا چہرہ ایک خوفناک مگر سہمے ہوئے چہرے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اماں دیوار کی طرف منہ کر کے رو رہی تھیں۔

'نکہت بے غیرت نہیں ہے۔' میں گلہ پھاڑ کر چیخی تھی۔ 'آپ لوگ لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلی ہی جوان کر دیتے اور مار دیتے ہیں۔ اسے بڑھنے کہاں دیتے ہو۔ آپ کی شرافت ان بوسیدہ دیواروں کے ذرے ذرے میں چھپی ہوئی ہے......

'ندو۔'

'آج مت روکنا امی......'

'کیا سمجھا رہی ہے انہیں۔' میں نے پہلی بار امی کو دیکھا تھا۔ امی نے آج پردہ اٹھا دیا تھا— 'کسے سمجھا رہی ہے۔ تو کیا سمجھتی ہے تیرے سمجھانے سے ان مردوں کی شرافت کے ڈھونگ ختم ہو جائیں گے۔'

اماں نے پردہ کی رسم توڑ دی تھی—

'اس خاندان میں کون سی لڑکی یا عورت ہے جو ان مردوں کے ستم کا شکار نہ ہوئی ہو......اور ہمیں نکاح کر کے زوجیت میں لینے کا دم بھرنے والے اپنے ناکارے پن کی وجہ سے سب دیکھتے ہوئے بھی چپ رہتے ہیں۔ شرافت......شرافت......شرافت......بچپن سے شرافت سنتے سنتے شرافت سے چڑھ ہو گئی۔ ارے ہمت ہے تو باہر کا کوٹھا تلاش کرو۔ گھر کی مرغیوں اور بچیوں کو تو چھوڑ دو—'

اماں دہاڑتی ہوئی رکیں۔ مردوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر زور سے صدا لگائی۔

'نکہت کے جنازے میں کندھے کم نہیں پڑیں گے۔ مرد ناکارہ اور نامرد ہوں تو ہم عورتیں کافی ہیں، جنازہ کو قبرستان تک لے جانے کے لیے۔ چل ندو۔'

اماں نے میرا ہاتھ تھاما اور تیزی سے پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گئیں۔ جہاں ایک سناٹا اور کہرام پھیلا تھا۔ ایک طرف چادر پر نکہت کی لاش پڑی تھی۔ سر تا پا کفن سے ڈھکی ہوئی لاش۔ سرہانے اور آس پاس عورتوں کا مجمع تھا۔ لیکن آج جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

کمرے میں آنے کے باوجود اماں کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اماں نے زور دے کر کہا۔

'تیاری کرلو۔ ان مردوں کی زلفن میں تیل نہیں ہے۔ جنازہ ہمیں لے جانا ہوگا۔'

بجلی زور سے کوندی اور اسی کے ساتھ تیز تیز بارش شروع ہوگئی...... میں سفید کفن کو دیکھ رہی تھی...... آنسو خشک تھے۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ ہم میں سے ہر لڑکی کی تقدیر میں یہی دن لکھا ہے۔

ہم پیدا ہوتے ہوئے بھی کہاں پیدا ہوتے ہیں/

یا پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے

ہمیں روندنے اور مسلنے کی تیاری/

یا پیدا ہوتے ہی ہمارے ننھے منے جسم کو/

تیل سے پوتتے ہوئے بڑی بوڑھیاں نہیں جانتیں

کہ وہ گوشت کے ننھے منے بدن کو تیار کر رہی ہیں

بڑی ہوکر شکاری کے آگے پھینکنے کے لیے/

ہم پیدا ہوتے ہی چٹخارے اور لذت کا سامان بن جاتے ہیں/

ہم پیدا ہوتے ہی لڑکیاں کہاں ہوتے ہیں......

جلیبیاں...... رس ملائی...... چاکلیٹ اور ملک شیک ہوتے ہیں/

پیدا ہوتے ہی مردوں کی نگاہیں

جسم میں اتنے چھید کر دیتی ہیں کہ نہ روح باقی رہتی ہے نہ جسم/

پیدا ہوتے ہی صرف شکار ہوتے ہیں ہم اور تعاقب میں ہوتا ہے شکاری......

باہر کی دنیا تو بعد میں آتی ہے۔

پہلے ہم ذبح ہو جاتے ہیں/ اپنے ہی گھر میں/

اور پھر مسلسل ذبح ہوتے رہتے ہیں۔

••

مجھے پہلی بار احساس ہوا، یہاں کے مرد تو گیدڑ سے زیادہ ڈرپوک ہیں۔ گھر کی عورتیں پہلی بار دروازے پر قدم رکھتے ہی اپنی چیخ کا اعلان کردیں تو اپنی شرافت کے سائے میں یہ مرد تمام عمر دبکی بلی کی طرح خاموش رہیں گے...... پہلی بار اس گھر کے تمام مردوں کے لیے میرے اندر سے ایک لفظ اچھل کر سامنے آیا تھا...... جوناگڑھ کے ہجڑے۔ مرد کہاں ہیں؟ جوناگڑھ کے ہجڑے ہیں یہ......

اس رات، عشا کی نماز کے بعد جنازہ اٹھا — مردوں کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں — عورتیں پردہ سے باہر نکل آئی تھیں۔ کندھا دینے والے مرد ہی تھے۔ یہاں بھی مردوں کو اپنی غیرت اور عزت کی یاد آگئی تھی کہ اگر عورتیں نکہت کے جنازہ کو کندھوں پر اٹھائے قبرستان لے گئیں تو لوگ کیا کہیں گے —

نکہت چلی گئی —

مرد مٹی دے کر واپس آئے تو ایک دوسرے سے نظریں بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس رات اماں میرے ساتھ رہیں...... رات میں کئی بار وہ چونک چونک کر اٹھ جاتیں۔ آدھی رات گزر چکی تو میں نے دیکھا، اماں مجھے جھنجھوڑ رہی تھیں۔

'کیا ہے اماں......' میں اماں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

اماں کی آنکھیں گہری فکر میں ڈوبی ہوئی تھیں — 'سن ندو — شادی ہوتے ہی ہم گھروں سے ایک پنجرا لے آتے ہیں۔ مجھے دکھ ہے کہ یہ

پنجرا آج کیوں ٹوٹا۔ برسوں پہلے ٹوٹ گیا ہوتا تو نکہت نہیں جاتی...... جاتے یہاں کے مرد۔ سن ندو۔ اب حساب کا وقت ہے......نکہت کا چالیسواں ہوجانے دے۔ تیرے ابو سے پوچھوں گی کہ اس گھر میں جونا کارہ مردوں کو بسا کر رکھا ہے، اس کی وجہ کیا ہے......شدھی کرن جانتی ہے ندو—؟ اب اس گھر کا شدھی کرن ہوگا۔ بیل کی طرح سانی میں منہ گھسائے ان مردوں کو یہاں سے جانا ہوگا— مجھے افسوس ہے کہ تیرے ابو اس کام کے لیے بھی ناکارہ نکلے۔ اب یہ کام بھی مجھے کرنا ہوگا اور سن ندو— میں کل ہی اجو، ابو اور گبرو میاں سے بھی بول دوں گی......اب اس گھر سے دانہ پانی اٹھ گیا۔ کہیں اور کا انتظام کریں......سن ندو......کہیں سے تو ایک شروعات کرنی ہوتی ہے۔ اب تک ان کا جبر دیکھا تھا اب مجھے دیکھنا۔'

'کر پاؤ گی اماں......؟' میں معصوم سی اماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی......

'اپنی عمر جی چکی ندو......اندر جو ایک پھانس پڑی تھی، تو نے اسے نکلوا دیا۔ اچھا کیا......اب کسی سے ڈر نہیں......مگر ہاں ندو......تو اس گھر سے نکل جا۔ اس بوڑھی حویلی میں صدیوں سے عیاشی کے آسیب رہتے ہیں......اب تجھے کوئی بری نظر سے دیکھ کر تو دیکھے......آنکھیں نکال لوں گی۔'

اور دوسرے ہی دن اماں کی بغاوت کا پہلا چہرہ ابھر کر سامنے آیا تھا۔ جب اجو ماموں سر جھکا کے اماں کے پاس آئے تھے۔

'بوبو......ناشتہ نہیں ملا اب تک؟'

'ناشتہ۔؟ کیوں ملے گا ناشتہ......؟'

'بوبو......' اجو ماموں ایکدم سے چونک گئے تھے۔ کیا کہہ رہی ہیں بوبو......'

اماں تنک کر کھڑی ہوگئیں— 'اب چولہے میں صرف تین آدمیوں کا کھانا بنے گا۔ باقی لوگوں سے بھی کہہ دیجئے۔ اپنا اپنا انتظام کر لیں۔ چودھری صاحب کے دور دراز رشتے داروں کو کھلانے کا ٹھیکہ نہیں لیا میں نے۔ اور آپ دیکھ کیا رہے ہیں۔ جائیے۔ اور ہاں......اب دروازے سے اندر آتے ہوئے آواز لگایا کیجئے۔ بے پردگی ہوتی ہے۔ ایک بات اور— نکہت کے چالیسواں تک میں خاموش رہوں گی۔ چالیسواں کے بعد آپ میں سے کوئی رشتے دار اب اس حویلی میں نہیں پلے گا۔'

'دیکھ لیں گے۔'

اجو ماما اماں کو کھلی وارننگ دیتے ہوئے گئے تھے۔ لیکن میں خوش تھی۔ اماں کے نئے تیور میں، میں نے جونا گڑھ کی اس صدیوں پرانی بوڑھی حویلی کو پھر سے جوان ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

(6)

'تیز آگ برس رہی ہے......./
لو کے جھکڑ بھی ہیں/
مگر گھبرانا نہیں ہے/
ہم نے ابھی بغاوت کا پہلا کلمہ پڑھا ہے/
گولیاں برسیں گی
تو ہماری ہتھیلیاں مضبوط بن کر
ان گولیوں کو تھام لیں گی/

محلّہ چھندوارہ کے اس طرف گندی بستیاں ہیں اور اس طرح محلّہ شیخاں اور گلی سے مین مارکیٹ کو جاتا ہوا راستہ۔ یہی راستہ آگے بڑھ کر سیدھے اسٹیشن روڈ چلا جاتا ہے۔ چھندوارہ کے اس محلے میں گلیوں میں ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی ایک لمبی قطار دور تک چلی گئی ہے۔ ایک مکان سے ملا ہوا دوسرا مکان۔ اسی محلّہ میں پرانے طرز کی چار پانچ حویلیاں ابھی بھی باقی ہیں۔ گلی میں ایک گھر سے دوسرے گھر جاتے ہوئے مسلم بچے یا چھوٹی چھوٹی لڑکیاں گلی کے کنارے کنارے چلتی ہوئی، باتیں کرتی ہوئی آئیں گی— حویلیوں کے محراب نما دروازے اب پرانے دنوں کی کہانیاں سناتے سناتے بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ اور یہیں آباد ہے چودھری زین العابدین کی حویلی— ان حویلیوں میں یا پرانے طرز کے مکانات میں نوتعمیراتی ترقیوں کے باوجود روشنی کی کوئی کرن ابھی تک نہیں پہنچی ہے۔ ابھی تک بہت سے مرد ایسے ہیں، جنھوں نے ساری زندگی بغیر کچھ کئے گزار دیئے۔ باپ دادا کی چھوڑی گئی جاگیریں اور ملکیت فروخت ہوتی چلی گئی— کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو سب سے پہلے کھیت پر نظر جاتی۔

چودھر زین العابدین یعنی میرے ابو نے بھی پوری زندگی اسی طرح گزار دی۔ بڑے ابو کا انتقال ہو چکا تھا۔ عظیم بھائی اب بڑے ہو گئے تھے۔ اکثر اپنی موٹر سائیکل اٹھا کر چک سائیں کی طرف نکل جاتے جہاں ہمارے کھیت تھے۔ وقت کے ساتھ اتنی تبدیلی ضرور آئی تھی کہ اب یہ چودھریوں کے لڑکے کھیت بدھار سے متعلق معلومات اپنے بڑوں سے کچھ زیادہ ہی رکھنے لگے تھے۔ کہاں کس کا کھیت ہے۔ کس کا کھیت بک رہا ہے۔ خرید و فروخت کے اس سلسلے میں موٹی کمائی بھی تھی۔

اس خستہ ہوتی حویلی میں بڑے ابو اور ابو کی رہائش کے علاوہ کئی ایسے دور کے رشتے دار بھی رہتے تھے، جنھیں آباء واجداد کے گناہوں کا ثمرہ کہا جا سکتا ہے— جیسے ایک کمرہ بنی دادی کا تھا۔ اور ان کے بیٹے گیوان کے ساتھ رہتے تھے۔ پرانی کہانیوں میں یہ پردادا کے گناہوں کے پوٹلی میں سے، نکلی ہوئی کہانی کے کردار تھے۔ پردادا نے رحم کھا کر حویلی کا ایک کمرہ ان کے نام کر دیا تھا۔ گبرو دادا، اجو ماموں......ابو چاچو......ایسے تمام لوگ دور کے رشتے دار تھے اور ان کی کہانیاں بھی رشتوں سے گزرتی ہوئی گناہوں کی دہلیز پر جا کر ختم ہوتی تھیں۔ ایسا میں نے سن رکھا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی زندگی بڑے ابو کے گھر کے بھروسہ چلتی تھی اور کچھ ابو کے بھروسہ— صرف آنکھ بند ہونے کے انتظار میں تھے۔ یعنی آنکھ بند اور کہانی ختم۔ اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے شاید مسلمانوں کی پسماندگی اور زوال کے پیچھے یہی کہانی رہی کہ نسل در نسل پدرم سلطان بود کا قصہ آباد رکھا۔

جائیداد تباہ ہوگئیں۔کھیت بک گئے۔اور ساری زندگی گھر کی دہلیز پر بغیر کسی کام اور محنت کے گزار دیا——

اماں نے نکہت کے انتقال کے دوسرے دن جب اجو ماموں کو ٹکا سا جواب دیا تو مجھے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی تھی۔اور امید تھی کہ اجو ماموں چپ نہیں بیٹھیں گے اور کوئی نہ کوئی طوفان تو اس گھر میں ضرور آئے گا۔

دوپہر بارہ بجے کے قریب ڈاکیہ سائیکل پر گھنٹی بجاتا ہوا ہمارے محلے میں آیا کرتا تھا۔دور سے ہی اس کی مخصوص گھنٹی کی آواز ہمیں بتادیا کرتی کہ ڈاکیہ آرہا ہے۔گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی وہ گھنٹی بجا کر آواز لگایا کرتا تھا۔ڈاکیہ......

ساڑھے بارہ بج گئے تھے۔سورج سر پر تھا۔دھوپ برآمدے میں چھٹکی ہوئی تھی۔باہر سائیکل کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔پھر آواز آئی ......ڈاکیہ۔میں اس وقت اماں کے ساتھ تھی۔اماں تیزی سے اٹھیں......اور برآمدہ پھلانگتی ہوئی دروازے تک گئیں۔ابو ہمارے پیچھے رہ گئے تھے ۔عام طور پر ڈاکیہ سے خط وہی لیتے تھے۔

’رجسٹری ہے......‘ ڈاکیہ اماں کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

’لاؤ۔‘

’دستخط کرنا ہوگا......‘

اماں نے کاغذ لیا۔آرام سے اردو میں دستخط کیا۔میری آنکھیں اس جگہ کو دیکھ رہی تھیں،جہاں اماں نے دستخط کیا تھا—— مہر سلطانہ......

ڈاکیہ نے جاتے ہوئے بھی پلٹ کر اماں کی طرف دیکھا۔اماں سے چند فاصلے پر ابو کھڑے تھے۔سناٹے میں ڈوبے ہوئے۔اماں نے خط ان کی طرف بڑھا دیا۔اور میرا ہاتھ تھام کر دوبارہ کچن میں آگئیں۔

اماں اب اماں نہیں تھیں۔مہر سلطانہ تھیں......

کچن میں لوٹ کر اماں دوبارہ کھانے کے برتنوں میں الجھ گئی تھیں۔مگر میں بغور اماں کا چہرہ دیکھے جارہی تھی...... یہ اماں کہاں چھپی تھیں اماں میں——اماں کے وجود کو حویلی کے سات پردوں میں دفن کردیا گیا تھا۔کیا یہ صرف ایک دستخط تھا؟ اماں آخر زندگی میں پہلی بار معمولی سے خط کے لیے دروازے کی طرف کیوں گئی تھیں——؟ کیا اماں اپنی اس حرکت سے کچھ بتانا چاہتی تھیں——؟ یہ اماں میں نئی اماں کی پیدائش تھی۔اور یہ صرف میں سمجھ رہی تھی۔نازیہ ابو کی ایک خاموش دنیا آباد تھی۔گھر کے حادثہ نے انہیں توڑ دیا تھا۔

اسی رات کی بات ہے۔مجھے اور نازیہ ابو کو بیٹھا کر اماں نے ایک بار پھر مجھے حیران کردیا تھا۔انہوں نے ابو کو مجھے بھیج کر طلب کیا تھا۔یہ بھی اس گھر کے لیے ایک نئی بات تھی۔ابو خاموشی سے آئے تو اماں ہم دونوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں......

’کیا بات ہے،جی؟‘ ابو بغور اماں اور ہمارا چہرہ پڑھ رہے تھے۔

’جی نہیں—— میرا نام مہر سلطانہ ہے۔مہر بھی تو کہہ سکتے ہیں۔‘

’جی......‘

’ان دونوں بچیوں کو دیکھ رہے ہیں۔؟‘

’جی......‘

’مہر کہیے۔مہر نہیں مانگ رہی ہوں۔نام لینے کو کہہ رہی ہوں بس‘

’مہر......‘ ابو کو پہلی بار الجھن اور پریشانی میں محسوس کیا تھا۔یہ وہ چودھری زین العابدین نہیں تھے،جو بات بات میں بھی اماں پر یا تو مکے برسایا کرتے تھے یا گالیاں دیا کرتے تھے۔یہ اس گھر کے تمام مردوں کا شیوہ تھا کہ اپنی شرافت کے تمام زیورات کا استعمال گھر کی عورتوں پر ہی آزمایا کرتے تھے۔خود بڑے ابو کا یہی حال تھا۔اور شاید یہی حال حویلی کے ان تمام مردوں کا تھا،جو شادی شدہ زندگی گزار رہے تھے اور میرے لیے اب محض جونا گڑھ کے ہجڑے تھے۔

اماں نے بغور ابو کے کمزور سراپے کا جائزہ لیا۔پھر تیز آواز میں پوچھا۔

’ہمیں تو چوڑیاں پہنا کر گھر میں بیٹھا دیا۔ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں......‘

’جی......‘

’کبھی ان بچیوں کے مستقبل کا خیال نہ آیا......؟‘

’جی......‘

’دو بچیاں تو شہادت پا گئیں۔ رہ گئیں یہ دونوں بچیاں۔ ان کے بارے میں سوچنے کے لیے اللہ کے فرشتے آئیں گے......‘

’جی......‘

’مہر کہیے—‘ اماں زور سے چلائیں—’ اتنے برسوں میں مجھے اور میرے نام کو بھی حویلی کی دیواروں میں دفن کر دیا تھا آپ لوگوں نے۔ مشکل سے آج اس نام کو آزاد کرا سکی ہوں۔‘

’مہر......‘

’سنیے۔ غور سے میری بات سنیے۔ یہ حویلی اکیلے آپ کی نہیں ہے۔ اب تک جو ہوتا رہا، میں نے کچھ نہیں کہا۔ نکہت بھی چلی گئی۔ نکہت کے ابو بھی چلے گئے۔ نکہت کے ابو ہوتے تو شاید میں زبان نہ کھولتی۔ لیکن عظیم نیا بچہ ہے۔ زمانہ دار ہے۔ خدانخواستہ ہماری آنکھیں بند ہو گئیں اور ساری حویلی پر اس نے اکیلے قبضہ جما لیا تو—؟ ان دونوں کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیں گے کیا......؟

’جی......سن رہا ہوں۔‘

’سنیے مت۔ چالیسواں ہو جائے تو عظیم کو بلا کر گھر کا بٹوارہ کر دیجئے۔ اور سنیے۔ ساری زندگی نازو گھر میں نہیں بیٹھے گی۔ جو نازو کے ساتھ ہوا وہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ تھوڑا جگر چلائیے۔ آپ ہی کی بچی ہے۔ رشتے دیکھئے۔ یا رشتہ دیکھنے کا کام بھی ہمیں کرنا ہوگا......؟ باقی معاملات ہم پر چھوڑ دیجئے۔‘

میں کبھی اماں، کبھی ابو کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ نازو اپو کی آنکھیں نم تھیں۔ پتھرائی آنکھوں میں پہلی بار آنسو دیکھے تھے۔ اماں اچانک ابو بن گئی تھیں اور ابو کمزور حویلی کے خستہ وجود کی طرح اماں میں تبدیل ہو گئے تھے......

’اور سنیے......‘ اماں کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔

’جی۔‘

’آپ کے اٹھائی گیرے رشتہ دار اب یہاں نہیں رہیں گے۔ میں جانتی ہوں آپ نہیں بول پائیں گے۔ یہ کام بھی مجھے کرنا پڑے گا۔‘

ابو اچانک چونک گئے تھے۔ چہرہ زرد ہو گیا......

’لیکن وہ کہاں جائیں گے؟‘

’جہنم میں۔‘ اماں کو غصہ آ گیا تھا—’ نکہت کے جنازے کے وقت سگی بیٹی سے زہر جیسا سچ سننے کے بعد بھی آپ کا خون نہیں کھولا— کیسے باپ ہیں آپ؟ آپ کو چاہیے تھا کہ اس سچ کے بعد ہی دھکے دے کر ان لوگوں کو گھر سے باہر کر دیں اور اوپر سے سانپ کو دودھ پلا کر پرورش کر رہے ہیں۔ لیکن اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔‘

’جی‘

’سن لیا۔‘

’پھر بیٹھے کیوں ہیں؟‘

’جاؤں؟‘

ابو آہستہ سے بولے۔ دو منٹ خاموش رہے پھر کمرے سے باہر نکل گئے۔

اماں کی آنکھوں میں آنسو تھے—’ ڈولی چڑھ کر اس گھر میں آئی تو نگوڑے ان مردوں کو شیر سمجھ بیٹھی اور بھیگی بلی کی طرح ڈری سہمی ہوئی قید دیواروں کا حصہ بن گئی۔ اب جان گئی ہوں نندو۔ نامردوں کے ساتھ رہنے سے اکیلی آزاد زندگی زیادہ بہتر ہے۔ کمزور رشتہ ٹوٹ جائے تو بہتر مگر

عورت کو نیچا سمجھنے اور ہاتھ اٹھانے والے کے ساتھ کسی بھی عورت کو زندگی بسر کرنے کا حق نہیں۔ میں ہزار بار اس حویلی میں مری ہوں۔ مگر اب نہیں مروں گی......اور تم لوگوں کو بھی مرنے نہیں دوں گی۔

میں اماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ نازیہ اپو کا چہرہ پھر سے مجسمہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اماں کے چہرے پر سلوٹیں پڑی تھیں۔ مگر اس وقت اس چہرے میں مجھے ایسا اعتماد نظر آ رہا تھا، جو بڑی سے بڑی قیامت اور بڑے سے بڑے زلزلے سے بھی ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا تھا......

(7)

اس زوال آمادہ، خستہ ہوئی حویلی میں ہزاروں راز دفن تھے۔ بچپن میں اماں ابو کے منہ سے یہ کہانیاں سنتی ہوئی بڑی ہوئیں۔ اماں بتایا کرتی تھیں کہ غلامی کے دنوں میں اس حویلی میں کئی سرنگیں بنائی گئی تھیں۔ آزادی کے مجاہد فرنگی حکومت سے بچنے کے لیے ان سرنگوں کی مدد لیا کرتے تھے۔ اماں ان تہہ خانوں کے بارے میں بھی بتایا کرتی تھیں جو حویلی میں موجود تھے— مگر جب سے وہ بیاہ کر اس گھر میں آئیں، کبھی ان تہہ خانوں کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ایک تہہ خانہ تو ہمارے بیڈروم میں موجود تھا۔ جس میں نیچے کی طرف ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اور اس دروازے پر زنگ لگا تالہ جھول رہا تھا۔

اس دن اماں پہلی بار ہم دونوں کو لے کر سرنگوں اور تہہ خانوں کی کھوج کرتی رہیں۔ بڑی دالان میں اوپر کی طرف بھی چھجے کو پاٹ کر لکڑی کے موٹے موٹے دروازے لگا دیئے گئے تھے۔ اور ان پر بھی تالہ جھول رہا تھا۔

اماں نے بتایا......ایک تہہ خانہ یہ بھی ہے......

'اتنا اوپر؟'

'سنتے ہیں۔ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور نیچے اترنے کے بعد یہ سرنگ اکھاڑے والے میدان تک جاتی ہے۔ اب تو اس میں سانپ ہی سانپ بھرے ہوں گے۔ پتہ نہیں کیوں، گھر کے مردوں نے کبھی ان سرنگوں اور تہہ خانوں کا پتہ لگانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ ارے ان کا کوئی

کام تھا؟ گھر میں بیٹھے بیٹھے روٹیاں توڑنے سے فرصت کہاں تھی؟

ماضی کے کھنڈرات روشن تھے۔ مجھے تعجب تھا کہ آج اماں کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ سرنگوں اور تہہ خانوں کی تلاش کے پیچھے کہیں اماں اپنے اندر چھپے تہہ خانوں کا جائزہ تو نہیں لے رہی ہیں۔ خانے در خانے......تہہ خانے ......اماں نے اب تک خود کو کتنے خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اوپر خانے میں طلسمی خاموشی—

'کہتے ہیں ایک بار گورے سپاہی آئے تھے......مگر انہیں کوئی سراغ نہ مل سکا۔ انگریز تہہ خانوں کا حال کیا جانیں۔ آتے۔ پتہ نہیں کیا الم غلم تلاش کرتے اور واپس چلے جاتے۔'

'پھر ان سرنگوں میں کون ہوتا۔؟'

'لونڈو کی سنو......ارے۔ جانباز اور مجاہد ہوتے۔ کہتے ہیں کہ ان تہہ خانوں میں میٹنگیں ہوا کرتی تھیں۔ آس پاس کی حویلیوں میں بھی ایسے تہہ خانے اور سرنگیں بنی ہوئی تھیں......غلام تھے تو نوج ان رگوں میں خون بھی دوڑتا تھا— آزادی مل گئی تو سب نکمے ہو گئے۔'

اماں کے ساتھ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی سیر کرتی رہی۔ ایک اندھیرا کمرہ 'پتلی دالان' کے نام سے مشہور تھا۔ اماں اس کمرے میں ساتھ لے کر آئیں......ہمیں اس کمرے میں جانا منع تھا۔ اس کمرے میں ایک قطار سے کئی بڑے ٹرنک رکھے تھے۔ اماں دکھا رہی تھیں۔ اس میں شادی وادی کے سامان پڑے ہیں۔ گہنے بھی ہیں۔ میں جب اس گھر میں آئی تھی، اس وقت کے کپڑے بھی ہیں۔ دکھانا ضروری ہے۔ کیا پتہ کب آنکھ لگ جائے۔ ان مردوں سے یہ بھی نہیں ہوگا کہ اپنے ہی سامانوں کی دیکھ ریکھ کر سکیں۔ اور ہم تو شادی کے بعد ہی چولہے میں جھونک دیئے گئے۔ بندھی ہوئی بے زبان گایوں کی طرح۔ مگر اللہ رکھے اب تم لوگ بڑی ہو رہی ہو۔ تم لوگوں کو یہ سب جاننا چاہئے۔'

'کیوں جاننا چاہئے اماں؟'

'لو یہ سب کس کا ہے؟ تم ہی لوگوں کا نا؟ پھر جانے گا کون؟ پڑوسی آئیں گے جاننے کو؟ اس ٹرنک میں شیشے اور چاندی کے برتن ہیں۔ اور یہ جو ٹرنک ہے۔ اس میں شادی کے سامان پڑے ہیں......اور اس میں دریاں، گرم کپڑے۔ رضائی۔' اماں کی آنکھیں نم تھیں— 'یہاں جو بند تھا۔ بند رہا۔ کھلا ہی نہیں۔ گھر کی عورتوں کی طرح۔ مگر تم لوگ بند مت رہنے دینا۔ یہ سب گھر میں استعمال کے لیے ہیں اور یاد رکھنا۔ تم لوگوں کے لیے ہیں۔'

'جی اماں۔'

اماں اچانک چونک گئی تھیں۔ یہ باہر تیز تیز بولنے کی آواز کس کی آ رہی ہے؟'

'جی اماں......'

'چل کر دیکھتے ہیں۔'

برآمدے میں جسے جہاں جگہ ملی تھی، بیٹھ گیا تھا۔ چبوترے پر، پلنگڑیوں پر......ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر۔ باہر کی طرف کھلنے والے عام دروازے کو بند کر دیا گیا تھا، جس کی اونچائی گھر کے دوسرے دروازوں سے کہیں زیادہ تھی۔ یہاں آگے مشتری بوا کے نام پر ایک کنواں تھا، جسے پاٹ دیا گیا تھا۔ مشتری بوا کبھی اس گھر کی خادمہ رہی تھیں۔ لیکن ایک دن وہ اسی کنویں میں گر کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھیں۔ برسوں مشتری بوا کے نام پر یہ سرگوشیاں بھی ہوتی رہیں کہ ان کی روح اسی کنویں کے آس پاس بھٹکتی رہتی ہے۔ کنویں کو پاٹنے کے پیچھے کی کہانی اتنی ہے کہ مشتری بوا کے انتقال کے بعد کچھ مردوں نے کنویں سے آتی مشتری بوا کی دردناک آوازوں کو سنا تھا، جیسے وہ کنویں سے باہر نکالنے کے لیے کہہ رہی ہوں— اس وقت ماحول گرم تھا۔

بنی بوا کا لڑکا امرود کے درخت کے قریب کھڑا غصے میں کہہ رہا تھا۔

'ایسے کیسے کمرہ چھوڑ دیں گے۔ کوئی نکال کے تو دیکھے۔ قانون بھی مجھ سے میرا کمرہ خالی نہیں کرا سکتا۔'

اجو ماموں غصے میں تھے— چپ کر۔ بس اپنی لیے بیٹھا ہے۔ تماشہ ہوگا تو ہم بھی خاموش تماشائی نہیں ہوں گے۔ برسوں اس گھر میں گزارہ

کیا ہے۔اب تو نیکی، اخلاق، مروت سے بھی پردہ اٹھ گیا۔

گبرو میاں اپنی کمزور آواز میں بولے— 'بولنے سے پہلے یہ تو سوچنا چاہئے کہ اس بڑھاپے میں ہم کہاں جائیں گے۔اب جانگر تو چلتا نہیں۔کوئی کام تو ہم سے ہوتا نہیں۔'

ابو میاں لڑکھڑاتی آواز میں بولے— 'آپ سن کیا رہے ہیں۔عابد بابو۔فیصلہ کیجئے۔ایسے ہم کیوں چلے جائیں۔اس گھر پر ہمارا بھی حق ہے۔'

گبرو میاں بولے— 'وہ تو ہم نے اپنے حصے کی مانگ نہیں کی۔ہماری شرافت تھی کہ چلو مرکھپ گئے تو کہاں کی زمین، کس کی زمین......'

اجو ماموں زور سے بولے— 'اپنے حصے کی زمین مانگ لی ہوتی تو یہ دن دیکھنا نہیں ہوتا۔'

جینو میاں، تختے والے عمران بھائی، سلمان میاں، یہ لوگ باہر کام کرتے تھے اور رات کے وقت آرام کرنے حویلی آجاتے تھے۔صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا اسی گھر میں ہوتا۔جب موڈ ہوتا آواز لگ جاتی۔بوبو۔چائے نہیں ملے گی؟ اس وقت۔ان تینوں کے چہروں پر جھنجھلاہٹ بھی تھی اور غصے کا ابال بھی۔

تختے والے عمران میاں نے غصے سے کہا— 'انسانیت ہی ختم ہوگئی۔ہم انسان نہ ہوئے، کوڑا کرکٹ ہوگئے۔جب مرضی گھر سے بے دخل کردیا۔'

جینو میاں غصے میں چلائے— 'ایسے کوئی کیسے بے دخل کرسکتا ہے۔برسوں اس حویلی میں گزارا ہے تو جنازہ بھی اسی گھر سے اٹھے گا۔'

سلمان میاں کو جب غصہ آتا تو وہ ناک سے بولنے لگتے تھے۔وہ سمجھداروں جیسی بات کررہے تھے۔

'بوں بوں نے غصے میں کہا......ں......ہو......ں گا......'

اجو ماموں چلتے ہوئے ان کے آگے آکر کھڑے ہوگئے۔

'غصے میں نہیں کہا۔فیصلہ ہوگیا ہے۔آپ لوگوں کو کیا معلوم۔فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے۔آپ لوگوں کو جانا ہے تو جایئے۔ہم تو کہہ دیتے ہیں کوئی ہمیں نکال کر تو دیکھے۔

زین العابدین چپ تھے۔سر جھکائے ہوئے۔یہ ہمیشہ سے ان کی بات تھی۔ایسے موقعوں پر وہ پہلے ہی اپنی شکست تسلیم کرلیتے تھے۔ان کی خاموشی اجو ماموں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔وہ گلہ پھاڑ کر چلائے۔

'آپ کچھ بولتے کیوں نہیں۔جواب کیوں نہیں دیتے۔حویلی کے مردوں کے یہ برے دن آگئے کہ اب گھر کا نازک فیصلہ بھی عورتیں کریں گی۔'

اور بس یہیں اجو ماموں مار کھا گئے— ابھی تک اماں یہ سارا تماشہ سیم کی جھاڑ کے پیچھے سے دیکھ رہی تھیں۔لیکن عورت کا نام سن کر اماں نے اچانک ہمارا ہاتھ چھوڑا اور تنک کر ان کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔

'کس نے کیا بولا......؟'

جتنے بھی مرد تھے سب کو سانپ سونگھ گیا۔اماں کی آنکھوں میں کچھ ایسی آگ روشن تھی کہ جو جہاں تھا، وہیں پتھر کے مجسمہ میں تبدیل ہوگیا......

'ہاں۔ابھی کون بول رہا تھا کہ گھر کا نازک فیصلہ بھی عورتیں کریں گی......؟'

اماں نے ایک ایک کرکے گھر کے مردوں پر نظر ڈالی پھر اجو کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئیں۔

'وہ......تو......میں......عابد بھائی سے......'

'عورتیں گھر کے مردوں کو ناشتہ کراسکتی ہیں۔کھانا کھلاسکتی ہیں، چائے پلاسکتی ہیں اور فیصلے نہیں کرسکتیں۔کیوں— ؟ فیصلے کا وقت آیا تو گھر کے مرد فیصلہ کریں— ؟'

'بوبو......وہ......'

'خاموش......' اماں زور سے چلائیں— 'فیصلہ ہوگیا ہے۔اور فیصلے کے لیے وقت بھی دیا جاچکا ہے۔اور یہ قانون کون پڑھا رہا تھا؟ ان میں

کسی مرد کو اٹھنے، بولنے، باتیں کرنے کا تو ہوش نہیں ہے، عدالت جائیں گے، عدالت جا کر کہیں گے کیا؟ کون ہیں آپ لوگ؟ کیوں پل رہے ہیں حویلی میں؟'

اماں غصہ میں تھیں—

حویلی کی کتاب کھلے گی تو آپ شریفوں کے سیاہ پہاڑوں کا کچا چٹھا بھی کھل جائے گا۔ پھر کس کو منہ دکھائیں گے......؟ کہیں منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہیں گے۔ اور گبرو میاں۔ جانگر نہیں چلتا تو جوانی میں جانگر چلایا کیوں نہیں؟ جانگر چلاتے تو اس حال میں نہیں پہنچتے۔ بس بہت ہو گیا۔ اب آپ سب کا حقہ پانی اس گھر سے اٹھ چکا ہے۔ اپنی اپنی خیر منائیے کہ اب تک آپ اس گھر میں موجود ہیں۔ ورنہ آپ کے کارنامے ایسے ہیں کہ چوک سے مزدور بلاتی اور دھکے مار کر آپ لوگوں کو یہاں سے باہر نکال دیتی—' اماں چیخ رہی تھیں۔ برآمدے میں سناٹا چھا گیا تھا۔

سب سے پہلے وہاں سے اٹھنے والوں میں ابو تھے۔

پھر آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹتی گئی۔

آخر میں خود کے بوجھ کو سنبھالتے ہوئے گبرو میاں اٹھے......آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔ تھراتھراتے ہونٹ آہستہ سے بولے......

'لے بھئی......چھپکلی کٹی......'

جاتے ہوئے اماں کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ گئے۔

آسمان پر کوؤں کا جھنڈ ابھی ابھی اڑتا ہوا گیا تھا۔ میں اس آواز کی زد میں تھی......'لے بھئی......چھپکلی کٹی......'

کانوں میں نگاڑے کی طرح یہ آواز گونج رہی تھی......

لے بھئی......چھپکلی کٹی......

یہ آواز سنی ہوئی تھی......برسوں پہلے......یادوں کی چھک چھک کرتی ٹرین پیچھے لوٹی تو میں گبرو دادا کی گود میں تھی......

'چھوڑو نا......'

'نہیں چھوڑتا......'

میں محسوس کر رہی تھی......ایک ہاتھی ہے......ایک ہاتھی کی سونڈ ہے......

'چھوڑو نا......'

'ارے کچھ دیر تو بیٹھ ندو۔ اچھی بچی کی طرح......'

تیز ہوا......ہوا میں تیرتی ہوئی ہاتھی کی سونڈ......

اور اچانک گبرو دادا نے مجھے گود سے نیچے اتار دیا تھا......لے بھئی......چھپکلی کٹی......

اب ہوا ٹھہر گئی تھی۔ ہاتھی کے سونڈ غائب تھے۔ سامنے والی دیوار پر نمی لہرا رہی تھی......مجھے کچھ نہیں معلوم......اندر اندر ایک گیلا سا احساس رہ گیا تھا......میں اُس دن تیز تیز رسیاں پھاندتی ہوئی بھی وہی جملہ بار بار بولے جا رہی تھی......

لے بھئی......چھپکلی کٹی......

اکیس......بائیس......

لے بھئی......چھپکلی کٹی......

تیس......چالیس......پورے سو......

میں اماں کے ساتھ کمرے میں آئی تو اماں کمرے کی چادر تبدیل کرنے میں مصروف تھیں......میں نے اماں کو غور سے دیکھا......اتنے غور سے کہ اماں کا چہرہ سپید پڑ گیا۔

'کیا دیکھ رہی ہے ندو......؟

'لے بھئی......چھپکلی کٹی......'

اوراس لمحے، میں نے اماں کی آنکھوں میں ایک بار پھر سلگتے انگاروں کی گرمی محسوس کر لی تھی۔

(8)

ای، چک......دانا......بچک دانا......

دانے اوپر دانا......

ای دچک دانا......'

نکہت اکثر اس گانے کو گنگایا کرتی تھی...... کھیڑوں کی سرخ سرخ گوٹ سے کھیلتے ہوئے......وہ بہشتی لباس میں تھی...... پہلے سے کہیں زیادہ حسین ـــ اُس کے پیچھے پیچھے سفید لہراتے ہوئے بادل تھے......وہ روئی جیسے بادلوں سے کھیلتی ہوئی مجھ سے مخاطب تھی۔

'تو بھی آجاندو...... یہاں بہت خوش ہوں میں......'

'میں نہیں آنے کو ابھی......'

'ہوا میں اڑتے اُڑتے میں تیری ساری دنیا کو دیکھ آئی...... بہت برے لوگ ہیں ندو۔کوئی بھی اچھا نہیں......ای چک دانا...... بچک دانا...... دانے اوپر دانا......'

نکہت گنگناتی ہوئی بادلوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی تو اچانک چونک کر میری نیند کھل گئی۔آگے بڑھ کر میں نے کھڑکی کھول دی۔اُفق کے اس پار ایسا احساس ہوا جیسے پریوں کی طرح، پریوں کے لباس میں پلٹ کر نکہت نے میری طرف دیکھ کر اپنے ہاتھ ہلائے ہوں۔میں نے جوابی طور پر ہاتھ اٹھایا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔میں نے کھڑکی بند کر دی۔نکہت یاد آرہی تھی۔اُس رات میں دیر تک نکہت کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہی۔ نکہت کے الفاظ بار بار یاد آتے رہے......میں دور تک دیکھ آئی ہوں۔تمہاری یہ دنیا بہت بری ہے......'

لیکن اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ ابھی ایک حادثہ میرا انتظار کر رہا ہے۔اوراس حادثے کے بعد اس گھر میں رہنا میرے لئے مشکل

ہو جائے گا۔

☆☆

نکہت کا چالیسواں گزر چکا تھا۔

اجو ماموں، بنی پھوا اور اُن کے بیٹے گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ گبرو دادا پر ابو کو رحم آ گیا تھا۔ اماں نے صاف کہہ دیا تھا۔ بوڑھو اپنے کھانے کا انتظام کر لیں۔ وہ اپنے کمرے سے کم ہی باہر نکلتے تھے۔ ان کے کھانسنے کی منحوس آواز سن کر مجھے ان جملوں کی یاد آ جاتی تو میرا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا...... لے بھئی ......چھپکلی کٹی...... جی چاہتا تھا، ایک بڑا سا چاقو لوں اور پوری پوری چھپکلی کو جڑ سے کاٹ کر پھینک دوں......

نکہت کہتی تھی کہ چھپکلی کی دم کٹ جائے تو فوراً نئی دم آ جاتی ہے۔

'کیسے۔'

'اب آ جاتی ہے۔ مجھے کیا معلوم۔'

'اپنے آپ آ جاتی ہے۔؟'

'ہاں۔'

چھپکلی غائب تھی۔ بوڑھی ہوتی حویلی میں ویرانی نے اپنا ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ مجھے احساس تھا، کچھ ہونے والا ہے...... یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی ہے۔ بڑے ابو والے حصے کی ویرانی کچھ زیادہ تھی۔ بڑی امی نے نکہت کے جانے کے بعد لوگوں سے ملنا اور گفتگو کرنا بند کر دیا تھا۔ عظیم بھائی نے کھیتوں کی خرید و فروخت میں خود کو مصروف کر لیا تھا۔

ابو نے امی کو بتایا تھا کہ انہوں نے گھر کے بٹوارے کو لے کر عظیم سے بات کی تھی مگر عظیم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے کہا، کوئی بٹوارہ نہیں ہوگا۔ اماں اس نئی نسل کے غصے سے واقف تھیں مگر وہ مطمئن بھی تھیں کہ یہ پوری حویلی اکیلے عظیم کی تو ہے نہیں۔ اس لئے اگر عظیم نہیں مانے تو محلے والوں سے مشورہ کر کے بٹوارے کی رسم پوری کی جائے گی۔

مگر کیا یہ رسم بھی پوری ہو سکی——؟

کیا کہتی ہے مجھ سے میری روٹھی ہوئی تقدیر

اے نالۂ شب گیر..........

میں اُس کہانی کے زد میں تھی جہاں کاتب تقدیر نے میری آنے والی زندگی کے صفحے نالۂ شب گیر سے جوڑ دیے تھے اور میں کتنی انجان تھی......ایک خزاں حویلی کی تقدیر میں لکھ دی گئی تھی اور میری زندگی کے آئندہ صفحوں کے لئے خدائے لوح و قلم نے محرم کے مہینے کا انتخاب کیا تھا۔

بیگانی ہوئی جاتی ہے مجھ سے میری تصویر

اے نالۂ شب گیر

کیا کہتی ہے مجھ سے میری روٹھی ہوئی تقدیر

اے نالۂ شب گیر..........

اے نالۂ شب گیر..........

☆☆

محرم کا مہینہ۔ اماں کہتی تھیں، حضرت حسینؓ جس روز شہید ہوئے، آسمان سے خون کی بارش ہوئی تھی۔ اماں واقعۂ کربلا کو ایسے بیان کرتیں کہ خود بھی روتیں اور ہمیں بھی رلاتیں۔ محرم جونا گڑھ کی اس بوڑھی حویلی میں خاص اہتمام سے منایا جاتا—— شیعہ سنی میں دوستی تھی۔ مجلسوں کے لئے بلاوہ آتا۔ مجھے یاد ہے، باہری دروازے کا بڑا سا پردہ ہٹا کر آواز دی جاتی——

'۳ بجے مجلس ہے۔'

گھیری محلے میں شیعوں کی اچھی خاصی آبادی تھی اوراس محلے سے بی بی کا ڈولہ اٹھتا تھا۔گھیری محلّہ اور ہمارا محلّہ آپس میں ملا ہوا ہے۔مجلس کے لئے بلاوہ آتا تو گھر کے مرد پوری تیاری کے ساتھ ان مجلسوں میں شامل ہونے کے لئے جاتے — عام طور پر محرم میں سبز یا سیاہ لباس پہننے کا رواج تھا۔اماں ہمیں سلام کرنے سے بھی منع کرتی تھیں کہ اتنا بڑا حادثہ ہوگیا،ہم کسی کو سلامتی کی دعا کیسے دے سکتے ہیں۔یہی موقع تھا جب اماں کے منہ میں زبان دیکھتی تھی......اماں آنکھوں میں آنسو بھر کر بتایا کرتیں کہ جب حضرت امام حسینؓ شہید ہوگئے تو ان کے پاس اُن کا پیارا وفادار گھوڑا تھا۔گھوڑا روتا ہوا مقتولین کی لاشوں کے پاس سے گزرتا ہوا حضرت امام کی لاش کے پاس آکر ٹھہر گیا تھا......وہ ایسے رو رہا تھا کہ اُس کے ہنہنانے اور رونے سے کربلا کا میدان گونج اٹھا تھا......جب اُس گھوڑے کو دشمن کی فوج نے پکڑنے کی کوشش کی تو اُس نے کئی شہسواروں کو زمین پر گرادیا......اور لشکری اُس پر قابو نہ پا سکے......اماں بتاتی جاتیں اور روتی جاتی تھیں......

’پھر کیا ہوا؟‘

اماں کی آنکھیں یادوں کے دریچے سے کہیں دور نکل کر گم ہو چکی ہوتیں۔

چھٹی محرم سے ہمارے محلے میں تعزیہ بننا شروع ہو جاتا۔چھوٹی تھی تو گھر اور محلے کی لڑکیوں کے ساتھ بھاگ کر دالان میں پہنچ جاتی......یہاں ایک بڑا سا چبوترہ ہوتا۔چبوترے پر بیٹھے لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتے۔کوئی رنگ برنگے کاغذ پر یہ گوندلگا رہا ہوتا......کوئی چمکیلی پنّیوں کو قینچی سے کاٹ رہا ہوتا۔چھوٹی چھوٹی لڑکیاں نیاز فاتحہ کا قاب لیے،جو خوان پوش سے ڈھکا ہوتا،ادھر ادھر کے گھروں میں دوڑ رہی ہوتیں۔

ٹھہر ٹھہر کر کسی مرد کی آواز گونج جاتی......

زرینہ ذرا سنبھل کر......

’اونچی سیڑھیاں ہیں۔ٹھیک سے چلو......‘

محلے کے تعزیہ کے خلیفہ مٹروں میاں بھی ادھر ادھر گھومتے اور مشورہ دیتے ہوئے نظر آجاتے۔اس موقع پر اماں نے ہمارے لئے گھر میں بھی مٹی کے چبوترے بنا رکھے تھے۔ایک زمانے میں یہاں چار چبوترے تھے۔رمضان کے موقعوں پر ان چبوتروں کو صاف کیا جاتا۔ہم بچوں کو ایک شغل مل جاتا۔کاغذ کی بنی ہوئی تعزیہ جو گھر کے لڑکوں کی مدد کے بغیر بن ہی نہیں سکتی تھی،ان چبوتروں پر احترام کے ساتھ رکھی جاتی......اماں ملیدہ فاتحہ کرتیں۔اور یہ ملیدہ بڑے ابو کے گھر سے لے کر محلے میں بھی تقسیم ہوتا۔اس موقع پر کتنی ہی رسمیں تھیں،جو عقیدت و احترام کے ساتھ ادا کی جاتیں۔محرم کی آٹھ تاریخ ۴ بجے ہمارے محلے سے بی بی کا ڈولہ اٹھتا تھا۔آگے آگے ماتم کرتے ہوئے سیاہ اور سبز لباس پہنے ہوئے لوگوں کا قافلہ ہوتا۔ان میں سنی بھی ہوتے شیعہ بھی ہوتے۔گھر کے بزرگ اپنے اپنے دروازوں پر سفید کرتا پائجامہ یا کالی شیروانی اور ٹوپی پہن کر کھڑے ہو جاتے۔گھر کی بالائی منزل سے گھر کی عورتوں،بچیوں کو دیکھنے کی آزادی تھی۔باہر کے دروازے پر آنا منع تھا۔ڈولہ گھر کے آگے روکا جاتا۔یہاں سے گھر کے بزرگ مرد،جوان اور کم عمر بچے بھی ساتھ ہو لیتے۔دیر تک ماتم کی آوازوں کی گونج ہوتی۔

واویلا......صد واویلا

کوفیوں نے کی دغا

رسی سے باندھا گلہ......

واویلا......صد واویلا......

یہاں سے ماتم کرتا ہوا یہ قافلہ آگے بڑھتا۔آگے ہادی صاحب کے گھر سے تخت نکلتا تھا۔پھر پرانے بازار سے مہندی......اس طرح ڈولہ تخت،مہندی......اور اس کے ساتھ آہستہ آہستہ یہ قافلہ پرانے امام باڑے کی طرف چل پڑتا۔ہم بچیاں راستہ میں تھک جاتے تو راستہ سے ہی گھر کے مرد ہمیں واپس گھر لے آتے......نوحہ پڑھتے اور ماتم کرتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے کے لئے بھیڑ جٹ جاتی۔سڑکوں پر ٹریفک جام ہو جاتا......یہ قافلہ جگہ جگہ رکتا۔گھر کے زیادہ تر بزرگ پرانے امام باڑے تک جاتے اور پھر وہاں سے گھر لوٹ آتے۔اماں بتایا کرتیں کہ عزاداری کی یہ مختلف رسمیں کربلا کے شہروں سے نسبت رکھتی ہیں۔اماں نے ہی بتایا تھا کہ مہندی کی رسم کے لیے تعزیے کے تخت پر پالکی کو سجا کر تعزیے کو تیار کرتے ہیں۔

اس موقع پر حضرت قاسم کی شادی اور اس کے بعد ان کی شہادت کو یاد کرتے ہوئے عزادار نوحہ پڑھتے اور ماتم کرتے ہیں۔ اور سید الشہداء کو نوشئہ کربلا کا پرسہ دیتے ہیں۔ اماں نے بتایا تھا کہ وقت کے ساتھ یہ رسمیں بھی گم ہونے لگی ہیں۔ آٹھ محرم کو تعزیوں کو دربار کی شکل میں سجایا جاتا۔ اماں بتاتی تھیں کہ یہ دربار حضرت امام حسینؑ کی اپنے اصحاب کے ساتھ اپنے خیمے میں ملاقات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اصحاب کے ساتھ امام حسین کی آخری ملاقات تھی۔

اماں کی آنکھیں نم تھیں۔ کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پڑھ رہی تھیں۔

خیمے سے برآمد ہوئے زینب کے جو دلبر

دیکھا کہ حسین ابن علی روتے ہیں در پر

بس جھک گئے تسلیم کو حضرت کی، وہ صفدر

منہ کر کے سوئے چرخ پکارے شہہ بے پر

یہ وہ ہیں جو آغوش میں زینب کے پلے ہیں

بچے بھی تری راہ میں مرنے کو چلے ہیں......

اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل تھیں......

جب کوفیوں نے کوفہ میں مسلم سے دغا کی

جو عہد کیا ایک نے اس پر نہ وفا کی

کی شرم خدا سے نہ محمد سے وفا کی

مظلوم پہ، بے کس پہ، مسافر پہ جفا کی

پانی نہ دم مرگ دیا تشنہ دہن کو

کس ظلم سے ٹکرے کیا آوارہ وطن کو......

میری آنکھیں بھی نم تھیں......اماں کی آواز کمرے میں ابھر رہی تھی......

آواز پسر سنتے ہی حالت ہوئی تغیر

چلا کے کہا ہائے کلیجے پہ لگا تیر

برچھی سے تو زخمی ہوئے واں اکبر دلگیر

بسمل سے تڑپنے لگے یاں حضرت شبیر

تھا کون، اٹھا تا جو زمیں سے انہیں آ کر

اٹھ کر کبھی دوڑے تو گرے ٹھوکریں کھا کر......

جب کوفیوں نے کوفہ میں مسلم سے دغا کی

جب کوفیوں نے کوفہ میں مسلم سے دغا کی......

دغا......فریب......

اُس دن محرم کی آٹھ تاریخ تھی......اماں جیسے ہی اس جملے پر آئیں، میری نظر سامنے چلی گئی۔ سامنے ڈیوڑھی کے پاس عظیم بھائی کھڑے تھے۔ میں نے ایک نظر ان کی طرف......ایک نظر اماں کی طرف دیکھا......اماں بے نیازی سے پڑھتی جا رہی تھیں......آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

'جب کوفیوں نے کوفہ میں مسلم سے دغا کی......

میں نے دیکھا، ہاتھ کے اشارے سے مجھے عظیم بھائی بلا رہے ہیں۔ اماں کسی اور ہی دنیا میں تھیں۔ میں بھاگ کر عظیم بھائی کے پاس آئی۔

کیا ہے......

ذرا اوپر چلو......

'کیوں.....'

عظیم بھائی ایک لمحے کو لڑکھڑا گئے۔ 'وہ چچا بٹوارے کے متعلق کہہ رہے تھے۔'

'ہاں.....'

'تو چلو.....'

'لیکن کیوں.....'

'چلو گی تو میں بتاؤں گا.....'

آسمان کا رنگ سرخی مائل تھا۔ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے اس سرخی کا حصہ بن گئے تھے۔ صحن میں ویرانی تھی۔ بڑی امی کی طرف جانے والا دروازہ بھی بند تھا...... میں نے عظیم بھائی کی طرف دیکھا۔ اماں کی آواز آہستہ آہستہ ماحول میں اب ابھر رہی تھی۔

'حضرت معاویہ نے دین کو بالائے طاق رکھ دیا۔ شریعت کی حدیں توڑ دیں اپنے نالائق بیٹے یزید کو اپنا جانشیں مقرر کیا.....'

'میں اوپر نہیں جاؤں گی.....' پتہ نہیں کیوں میرا دل دھک دھک کر رہا تھا—

'کیوں؟'

'اوپر سناٹا رہتا ہے۔'

'ابھی تک ڈرتی ہے.....'

'ڈرتی نہیں ہوں۔'

'پھر.....' عظیم بھائی کی سلگتی آنکھیں میری طرف دیکھ رہی تھیں......

'سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اہل عراق کی دعوت پر گئے تھے اور یزید اسے بغاوت سمجھ رہا تھا..... سیدنا حسین کے پاس کوئی فوج نہیں تھی۔ بغاوت ہوتی تو ہمراہ فوج بھی ہوتی..... شامل تھے ۳۲ سوار اور ۴۰ پیادے.....اور بہتر کے اس قافلے میں ان کے بال بچے بھی تھے۔ ان کے مقابلے میں کوفہ سے جو فوج بھیجی گئی اُس میں ۴۰۰۰ سپاہی شامل تھے۔ اور اتنی بڑی فوج آسانی سے انہیں گرفتار کر سکتی تھی.....'

اچانک عظیم بھائی کی آنکھیں بدل گئیں۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا...... مجھے ایسا لگا جیسے ان ہاتھوں نے میرے ہاتھوں پر اپنی گرفت سخت کر لی ہو۔

'چل.....'

'نہیں۔ چلتی۔'

ناہید غائب تھی۔ میری ہتھیلیاں کسی معصوم لڑکی کی ہتھیلی کی طرح کانپ رہی تھی۔

ناہید کا جسم بھی غائب تھا۔ اور اس کی جگہ ایک کمزور لڑکی کا جسم آ گیا تھا۔

'ہاتھ چھوڑو۔'

نہیں چھوڑتا'

'امی کو آواز دوں گی۔'

'امی کیا کر لیں گی۔'

’پھر حضرت حسین نے کہا...... یا تو مجھے واپس جانے دو۔ یا کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو...... یا پھر مجھے یزید کے پاس لے چلو...... حسینؑ کوفہ کے گورنر عبیداللہ بن زیاد کے پاس جانے کے لئے تیار نہ تھے۔ کیونکہ مسلم بن عقیل کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ انہیں معلوم تھا......‘

عظیم نے ہاتھ چھوڑ دیا......
’تمہارے ابو گھر کے بٹوارے کو لے کر پریشان ہیں۔‘
’ہاں ہیں تو......‘
’اُسی کے بارے میں باتیں کرنی ہے......‘
’کیا باتیں کرو گے۔‘
’چلوگی، تب تو بتاؤں گا......‘
میں غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ امی نوحہ خوانی میں مصروف تھیں اور ان کی آواز کی گونج یہاں تک صاف سنائی دے رہی تھی۔

’ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغریٰ ترے قرباں
گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جاں
بے کس میری بچی ترا اللہ نگہباں
بے کس میری بچی تیرا اللہ نگہباں......‘

آسمان پر سرخ سرخ بدلیاں چھا گئی تھیں...... اماں کی آواز گونج رہی تھی...... بے کس مری بچی ترا اللہ نگہبان۔ نہیں، اللہ نگہبان کہاں تھا۔ میں اب بھی غور سے عظیم بھائی کو دیکھ رہی تھی...... چہرہ تبدیل ہو رہا تھا۔ اجو ماموں...... نہیں گبرو دادا...... نہیں...... نہیں ابو چاچا...... وہ بھی نہیں...... بوتل کا جن...... میں گہری سوچ میں ڈوبی تھی۔ ہوا تیز تھی۔ بارش ہونے کا امکان تھا...... آنکھوں کے آگے گہرے کنویں کا منہ کھل گیا تھا۔ کبھی یہ کنواں برآمدے میں امرود کے درخت کے پاس تھا۔ مریم بوا کہتی تھیں، اس کنویں سے آواز آتی ہے...... کیسی آوازیں......؟ ڈراؤنی...... تبھی تو کنویں کو پاٹ دیا گیا...... کنواں...... اوکھلی...... ندی...... میں مسلسل تصویروں میں تبدیل ہو رہی تھی......
’چلو......‘
دو ہاتھوں نے مجھے پھر تھام لیا تھا۔
اس بار میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی...... ایک بار پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا۔ اماں بے نیازی سے پڑھنے میں مشغول تھیں...... لمبی لمبی سیڑھیاں...... سیڑھیاں پار کرتے ہی بڑی سی چھت۔ چھت پر بنے ہوئے دو تین کمرے...... اور ان میں ایک کمرہ وہی کھوبر تھا۔ جس پر ہمیشہ تالا بند رہتا۔ آنکھوں میں بچپن اترتا ہے...... عظیم بھائی مجھے کمرے کے اندر جانے کو کہتے تھے۔
’نہیں — مجھے ڈر لگتا ہے......‘
کھوبر کا ذرا سا دروازہ...... دھکا دیتے ہی میں اندر ہو جاتی...... پھر عظیم بھائی خود کو سمیٹ کر کھوبر میں آ جاتے...... اور مجھے گود میں سمیٹ لیتے...... چھوڑو نا......
سناٹے میں دیر تک یہ آواز میرے حواس پر گونجتی رہی......
میں نے دیکھا عظیم بھائی کھوبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہے ہیں......‘

’تمہیں یاد ہے......؟‘
’کیا.....‘
’ارے سب یاد ہوگا.....کون سا زیادہ وقت گزرا ہے۔‘
’کیا یاد ہوگا۔‘
’اُس وقت بھی بچی نہیں تھی تم۔سیانی تھی۔پوری سیانی۔‘
’مجھے کچھ یاد نہیں......‘
’سب یاد ہے.....‘
عظیم بھائی نے زور سے میرے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔اب جوان مرد کی کلائی تھی یہ۔
’چھوڑو مجھے.....‘
’نہیں چھوڑتا۔‘عظیم بھائی شیطانی ہنسی ہنس رہے تھے......
’میں کہتی ہوں چھوڑو مجھے......
’کیا کرلوگی......چیخو گی۔؟‘
’ہاں۔‘
’نہیں چیخ سکتی۔‘
’کیوں.....‘

علاء الدین کا جن مسکرا رہا تھا۔اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ چیخ سکو۔اور سنو۔اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔ نیچے سے تمہاری اماں بھی نہیں آنے والیں......

میں نے خود کا جائزہ لیا۔چیخنے کی کوشش کی تو احساس ہوا، آواز اندر ہی اندر گھٹ چکی ہے۔جسم کانپ رہا تھا......آنکھوں کے آگے سیاہ سائے تھے۔میں کھوبر کے پاس والے کمرے میں ڈھکیل دی گئی تھی۔عظیم بھائی نے دروازہ بند کرلیا تھا۔میرا جسم کانپ رہا تھا......منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔آسمان پر چھائی ہوئی سرخی میں اضافہ ہو چکا تھا......

میں اب ناہید نہیں تھی۔
میں ایک جسم تھی......
میں بھرا بھرا سینہ تھی......ابھرے ہوئے پستان......
ناہید سے میں گورا گورا بدن بن گئی تھی......

میں ناہید نہیں تھی......گرم گرم جانگھوں والی لڑکی تھی۔رس بھرے ہونٹوں والی لڑکی...... پسینے میں بھیگی ہوئی لڑکی......دروازے ہوا سے ہل رہے تھے۔میں بار بار چیخنا چاہتی تھی......اور ہر بار میں ناہید سے ہونٹ بن جاتی......دو ہونٹ آگے بڑھ کر میرے ہونٹوں کو بند کر دیتے......
آہستہ آہستہ میں نے چھٹپٹانا چھوڑ دیا۔آسمان کے سرخی مائل بادل ہاتھی کی سونڈ میں تبدیل ہو گئے تھے......
دیواروں پر ہاتھی نے جھولنا شروع کر دیا تھا۔

’’آخر کار ان سے جنگ کی گئی۔سارے ساتھی شہید ہو چکے تھے......اور وہ میدان جنگ میں تنہا رہ گئے تھے۔شہادت قریب آ گئی تھی۔ان کی لاش سے کپڑے تک اتار لئے گئے۔اس کے بعد ان کی قیام گاہ کو لوٹا گیا۔اور خواتین کے جسم سے چادریں تک اتار لی گئیں......

ساحل پہ سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

ساحل پہ سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی......‘‘

ساحل پر سر پٹکتی ہوئی موجیں خاموش تھیں...... میں ہار گئی تھی۔ یا ہمیشہ سے شکست ہی ہماری تقدیر رہی ہے۔ میں اس وقت صرف ایک جسم تھی......اماں کی آوازیں گم تھیں......آسمان کی سرخی غائب تھی۔ پھر سے لامحدود وسعتوں میں نیلا رنگ سمٹ آیا تھا......۸ تاریخ تھی......شاید ۵ بج رہے تھے......میں ماتم کی آواز سن رہی تھی...... یہ آواز ابھی دور تھی......اور یہی وقت تھا جب بی بی کے ڈولہ کے ساتھ ماتم کرتے ہوئے، نوحہ پڑھتے ہوئے قافلہ حویلی کے باہر رکا تھا۔ ممکن ہے ابو نکل کر باہر جائیں......لیکن ابھی اس لمحے......میں صرف ایک جسم بن گئی تھی...... میں ناہید نہیں تھی......میرے جسم کے ہر حصے کا ایک نام تھا۔ اور عظیم، عظیم نہیں تھا...... میں اس کو دیکھ رہی تھی......اس کا چہرہ غائب تھا۔ اور چہرے کی جگہ ہاتھی کا سونڈ آ گیا تھا۔ وہ اس وقت صرف ایک سونڈ تھا......میرے کپڑے کھل گئے تھے۔ میں برہنہ تھی......

ماتم کی آواز قریب آ گئی تھی......آواز اب صاف تھی......

حسین......حسین......حسین......حسین......

ہاتھی کی سونڈ نے مجھے دبوچ لیا۔ مجھے اکہری چار پائی پر پھینکا اور جانے کہاں سے اُس لمحہ مجھے طاقت مل گئی......

حسین......حسین......

حسین......حسین......

باہر زور زور سے ماتم ہو رہا تھا۔

گھوڑے کو اپنے کرتے تھے سیراب سب سوار
آتے تھے اونٹ گھاٹ پہ باندھے ہوئے قطار
پیتے تھے آبِ نہر پرند آ کے بیشمار
سقے زمیں پہ کرتے تھے چھڑکاؤ بار بار
پانی کا دام و در کو پلانا ثواب تھا
اک ابن فاطمہ کے لئے قحط آب تھا

حسین حسین......

سونڈ لہراتی ہوئی جسم پر گر پڑی تھی......میرے ہونٹ بند تھے۔ اور اُسی پل مجھے پشت پر ایک ڈنڈا نظر آیا...... میں نے پوری قوت سے ڈنڈا سنبھال کر سونڈ کے سر پر وار کیا......ایک چیخ گونجی اور ماتم کی صداؤں کے درمیان دب کر رہ گئی......

حسین......حسین......

ماتم اب کھل کر ہو رہے تھے......

میں لڑکھڑاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی......سر گھوم رہا تھا۔ جسم برہنہ......مگر مجھے اپنے جسم کی فکر نہیں تھی......سونڈ کا جھولنا بند تھا......اب وہ پھر سے ایک مرد کی صورت میں سامنے تھا۔ اور اس وقت یہ مرد زمین پر گرا ہوا تھا۔ شاید بیہوش بھی......

شرکائے جلوس دروازے کے باہر حسین حسین کی صدا بلند کرتے رہے......لیکن اب میں کچھ نہیں سن رہی تھی۔ زمین پر ایک ننگا جسم پڑا تھا۔ عظیم کے کپڑے کھلے تھے...... میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس بیہودہ جسم کو تا دیر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ میرے جسم میں اس وقت تیز آندھی چل رہی تھی...... میں خود سے لڑ رہی تھی......

میں جسم کیوں ہوں......

ندی کیوں ہوں......اوکھلی یا کنواں کیوں ہوں......؟

میں شکار اور صرف شکار کیوں ہوں۔؟

اور اُسی لمحہ ایک تیز لہر میرے جسم میں سرایت کر گئی۔ میں سب کچھ بھول گئی۔ اور میرے پاؤں ہوا میں بلند ہوئے اور میں مسلسل...... ہاتھی سونڈ پر اپنے پاؤں سے وار کرتی گئی— ایک لمحے کو اُسے ہوش آیا...... ایک چیخ گونجی۔ لیکن نازک حصے پر مسلسل پاؤں کی ٹھوکر سے وہ دوبارہ بیہوش ہو گیا...... میں اس وقت تک سونڈ پر ٹھوکر مارتی رہی جب تک بالکل تھک نہ گئی۔ میں چارپائی کے قریب تھک کر بیٹھ گئی۔ میں نے عظیم کی جانگھوں کو دیکھا، خون چھلک آیا تھا...... سر میں ابھی بھی چکر آ رہے تھے۔ خود کو سنبھالتی ہوئی کھڑی ہوئی۔ کپڑے پہنے— بالوں کو درست کیا۔ نوحہ پڑھتے ہوئے اور ماتم کرتے لوگوں کا قافلہ آگے بڑھ گیا۔ حسین حسین کی صدائیں دھیمی پڑ گئی تھیں۔ میں نے ایک نظر دوبارہ عظیم کے ننگے جسم پر ڈالی۔ خون جانگھوں تک پھیل گیا تھا۔ پھر میں ٹھہری نہیں۔ تیز تیز سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ گئی۔ سیم کی لتوں کو پار کرتے ہوئے میں بڑی اماں کی ڈیوڑھی پر رکی۔ پھر تیز تیز قدم بڑھاتی بڑی امی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ نکہت کا صدمہ کچھ ایسا تھا کہ بڑی امی آس پاس کی دنیاؤں کو یکسر بھول چکی تھیں۔ جس وقت جنازہ اٹھا، اس وقت بھی ان کی آنکھیں بے جان اور ہونٹ ساکت تھے اور اس کے بعد وہ محض پتھر کا مجسمہ بن کر رہ گئی تھیں۔

میں نے بڑی امی کی طرف دیکھا۔ سانسوں کو سنبھالا۔ پھر کہا۔

’بڑی امی۔ میں نے ایک اور نکہت کو شہید ہونے سے بچا لیا......‘

مجسمہ نے سر اٹھا کر دیکھا— پتلیوں میں ہلچل تھی۔

’کوئی ہے جو اس وقت چھت والے کمرے میں بیہوش ہو کر پڑا ہے۔ اسپتال بھیجیے، اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔‘

میں یہ دیکھنے کے لئے ٹھہری نہیں کہ مجسمے کے بدن میں ہلچل ہوئی یا نہیں۔ میں تیزی سے پلٹی اور اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ میں نے سوچ لیا تھا، اب مجھے اس شہر میں نہیں رہنا ہے۔

امی کے کمرے میں آنے تک میں بریف کیس میں اپنا سامان رکھ چکی تھی۔ فیس بک پر کچھ لڑکیاں تھیں۔ جو گرلس ہوسٹل میں رہتی تھیں اور میری دوست بن چکی تھیں۔ ان میں ایک لڑکی ریتا اگروال تھی۔ پروگریسیو۔ ایک انگریزی اخبار میں تھی۔ ریتا نے کئی بار بلایا تھا۔ وہاں کیا کر رہی ہو۔ دلی آ جاؤ۔ اپنی مرضی کی زندگی جیو...... جتنے دن چاہو۔ ہمارے ساتھ رہ سکتی ہو۔ اس درمیان جاب تلاش کرتی رہنا۔ جاب تو مل ہی جائے گی......

امی نے غور سے میری طرف دیکھا۔

’جا رہی ہو......‘

’ہاں۔‘

’کہاں۔‘

’دلی۔‘

’ہونہہ‘

’میں واپس نہیں آؤں گی۔‘

ہونہہ۔‘

’کچھ باقی رہ گیا ہے......‘ میں امی کی طرف پلٹی...... میں نے پھر اس لفظ کو دہرایا...... کچھ باقی رہ گیا ہے......‘ اماں کسی اور سوچ میں گرفتار تھیں۔ لیکن یہ لفظ کچھ باقی رہ گیا ہے۔ دیر تک میرے اعصاب پر سوار رہے۔ اندر کشمکش چل رہی تھی۔ گھر میں طوفان آ سکتا ہے۔ جب گھر کے مردوں کو بیہوش عظیم کا پتہ چلے گا، تو ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔ مجھے اس ہنگامہ سے پہلے ہی گھر چھوڑ دینا تھا۔ میں اب کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جبکہ اب میں اتنی باہوش تھی کہ کسی بھی مصیبت کا سامنا کرنے کو تیار تھی۔

’کچھ باقی رہ گیا ہے۔‘ میں آہستہ سے بولی۔

’ٹھیک......‘ امی نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔

یہ دو پتھروں کے درمیان کا مکالمہ تھا۔ میں نے اتنا ضرور کہا تھا کہ مجھے پیسوں کی ضرور پڑے گی۔ اور پیسہ میرے بینک میں ٹرانسفر کرا دینا۔

☆☆

میں دلی آ گئی۔ چھ مہینے تک جونا گڑھ کی ذلیل یادوں سے دور رہنے اور جینے کی کوشش کی تو آخر زندگی راس آ ہی گئی۔ اس درمیان ایک کال سینٹر میں جاب مل گئی۔ یہیں کمال سے ملاقات ہوئی۔ دلی کی اکیلی زندگی سے بھی گھبراہٹ کا احساس ہوتا تھا۔ کمال سے شادی ہو گئی۔ اور اس درمیان کمال کی جاب نینی تال میں ہو گئی۔

اور اس طرح میں نینی تال آ گئی۔

☆☆

ناہید اچانک اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر کہیں بھی درد یا تکلیف کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ وہ زور سے چیخی۔

'اب یہاں کیا کر رہے ہیں آپ......'

'جی۔'

میرے اندر بہتی ہوئی جذباتی ندی ایک جھٹکے سے ٹھہر گئی تھی......وہ دروازے تک جاتے جاتے پلٹی۔

'میں نے جو کچھ کہا۔ اُسے، اسی لمحے بھول جائیے۔ سمجھ رہے ہیں آپ۔'

'جی۔'

میرے لئے، ناہید کی کہانی سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ میں کمال اور ناہید کے تعلقات کو، پرانی کڑیوں سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وادیِ اسرار

سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے راز داں پیدا کرے

—علامہ اقبال

(1)

پچھلے صفحات میں آپ نے جو کچھ پڑھا۔ اُسے کچھ دیر کے لئے بھول جایئے ......اُس خوفناک ڈراؤنے سفر کے بعد آگے بڑھتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا کہ ہم لکھنے والوں میں ایک جوکر بھی چھپا ہوتا ہے۔ اور اس لیے ناہید ناز کی کہانی سنانے اور کہانی کے خاتمہ پر اس کے بدلے ہوئے تیور نے میرے اندر اُس جوکر کو جگا دیا تھا۔

ایسے بہت سے قاری ہیں، جنہوں نے دوستوفسکی کے ایڈیٹ کا مطالعہ کیا ہے یا ایسے ناظرین ہیں، جنہوں نے ہندوستانی شومیں راج کپور کی فلم میرا نام جوکر کا لطف اٹھایا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ جوکر بننا آسان نہیں ہوتا اور جوکر محض ایک ہنسنے ہنسانے والا انسان نہیں ہوتا بلکہ غور کریں تو جوکر میں انسانی نفسیات کی باریکی کو سمجھنے کا تجسس ہوتا ہے۔ اسی لیے اپنے مشاہدے کی بنا پر اس وقت بھی ہنساتا ہے، جب اُس کا دل رو رہا ہوتا ہے— حقیقت یہ ہے کہ میں اس وقت ایسا ہی ایک جوکر تھا—اور میری کیفیت 'میرا نام جوکر' کی تھی، جو اس کہانی کی کڑیوں کو جوڑتے ہوئے وادی تحیر میں بھی اور کئی ایسے مقام آئے، جہاں آنکھیں اشکبار بھی تھیں—

حقیقت یہ بھی تھی کہ آپ کی طرح میں بھی اس کہانی سے دور نکلنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا میرے اندر وہ جوکر جاگ گیا تھا اور اب میں یوں ہی کچھ دیر کمرے میں بندروں کی طرح اچھل کود کرنا چاہتا تھا۔ میں کوئی پرانا باسی لطیفہ یاد کر کے ہنسنے کا خواہشمند تھا۔ یا یہ بھی خواہش ہو رہی کہ سر پر جوکروں کی طرح الٹی سیدھی ٹوپی پہن کر کچھ ایسی حرکتیں شروع کروں کہ ناہید ناز اپنی پرانی دنیا سے واپس نکل سکے۔ لیکن جیسا میں نے آپ کو شروع میں بتایا ہے کہ یہاں ہر کہانی ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور کبھی کبھی ایک کہانی کا سرا چھوڑ کر دوسری کہانی سے وابستہ ہونا پڑتا

ہے۔شاید ہم تمام انسانوں کی یہی کہانی ہے۔ کسی ایک کردار کا ایک سرا پکڑتے ہوئے ساری دنیا گھوم آیئے تو کہیں نہ کہیں ایک رشتہ حضرت آدم سے بھی نکل آئے گا...... جو کر کی بات ...... ہے نا...... مگر...... ابھی اسی مبہم حقیقت کو سچ سمجھتے ہوئے اس کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ دنیا کتنی چھوٹی ہے۔ہم کسی سے ملتے ہوئے بچھڑ جاتے ہیں اور پھر اچانک کسی مقام پر مل جاتے ہیں......

اس دن — یعنی لنچ کے بعد کا وقت ہوگا۔ جب مجھے باہر کچھ ہنگامے کی آواز سنائی دی۔اس درمیان یہ بتانا بھول گیا کہ کمال یوسف اور ناہید میں پھر سے گفتگو شروع ہوگئی تھی۔ یہ گفتگو آخر کتنے دن بند رہتی۔ کمال کہہ رہا تھا۔

’اُسے بلالو...... نا......‘

’بلالو...... کیا...... وہ کہنے سے آجائے گی......؟‘

’میں بلالوں؟‘

’تمہیں اتنی بے چینی کیوں ہے......‘

’وہ کئی دنوں بعد آئی ہے...... ہوسکتا ہے...... اُسے آنے میں تامل ہو......‘

’تأمل کیوں۔‘

’وہ چاہتی ہے کہ اُسے بلایا جائے......‘

’پھر وہ ڈرامے کیوں کرتی ہے...... باہر دیکھو۔ تتلیوں کے تعاقب میں بھاگ رہی ہے......‘

’وحیدہ —‘ میرے ذہن میں اچانک ایک نام پیدا ہوا۔تو کیا وحیدہ آئی ہے — ؟ اتنے دنوں بعد؟ میں تو اس درمیان اس نام کو بھول ہی گیا تھا۔ میں نے جلدی سے نئے کپڑے پہنے۔ بالوں کو سنوارا۔ سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔

آج دھند نہیں تھی۔ نیلا آسمان مسکرا رہا تھا۔ میں نے اُسے پشت سے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یا خدا۔ وہی لڑکی ...... مجھے یاد آیا، جب میں پہلی بار یوسف کمال سے ملنے آیا تھا تو اس لڑکی کو دیکھ کر طلسم ہوشربا کے کتنے ہی ہوش اڑانے والے صفحات میری نگاہوں کو خیرہ کر گئے تھے۔ آسمان میں دھند چھائی تھی اور ایک جسم نے دھند کا لباس پہن لیا تھا۔ پھر اچانک دھند چھٹی تو جسم غائب تھا۔ میں نے دیکھا۔ وہ پشت سے دونوں ہاتھوں کو پھیلائے ہے اور ادھر ادھر درختوں پر پرندے اتنے آرام سے بیٹھے ہیں جیسے اُس کے دوست ہوں۔

مجھے احساس ہوا، شاید اس وقت بھی وہ پرندوں سے باتیں کر رہی ہے۔ مگر پرندوں سے باتیں؟

اس درمیان میں نے اس پراسرار ساحرہ کے بارے میں دلی سے نینی تال تک اتنا کچھ سن رکھا تھا کہ اب اُس سے ملنے اور اُس سے گفتگو کرنے کا تجسس پیدا ہو چکا تھا...... اور یہ تجسس اس وقت مجھے اُس کے پاس کھینچ لایا تھا — گو کہ میں اپنے قدم آہستہ آہستہ اٹھانا چاہتا تھا مگر اللہ نے لڑکیوں کے جسم میں خصوصی طور پر یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ ہلکی سی آہٹ کو بھی محسوس کر لیا کرتی ہیں —

اس نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تھا اور وہ ابھی تک ان پرندوں سے گفتگو کرنے میں منہمک تھی — میں نے ایسا نظارہ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا کہ پرندے بھی انسانی ہاتھوں کے ہلنے کے باوجود اپنی اپنی شاخوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسا میں نے صرف طلسمی کہانیوں یا حضرت سلیمانؑ کے معجزات کے تعلق سے سنا تھا۔ مگر ابھی اس وقت یہ تصویر زندہ تھی اور اچانک وہ پراسرار ساحرہ میرے قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہوئے میری طرف پلٹی اور میں اُسے دیکھتا رہ گیا......

وحیدہ...... یا...... صوفیہ مشتاق احمد...... اف خدا...... نینی تال کی، اس وادیٔ پراسرار میں اس طرح صوفیہ مشتاق احمد سے میری ملاقات ہوسکتی ہے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھے وہ سارے واقعات یاد آ گئے، جس کا میں نے ابتدائی حصے میں ذکر کیا ہے۔ مگر یہ صوفیہ ہے تو وحیدہ کیونکر ہوگئی — ؟ وحیدہ ہے تو صوفیہ کیوں دکھ رہی ہے — ؟ کیا چہرے کی مماثلت ہے۔ نظروں کا دھوکہ یا اس بات پر یقین کیا جائے کہ ایک ہی وقت میں اس دنیا میں سات ایک ہی چہرے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ میں ابھی حیرت سے دیکھ رہا تھا اور یقینی طور پر وہ صوفیہ تھی — صوفیہ بھی مجھے پہچان گئی۔ میں اُس کے قریب آیا۔ اور آہستہ سے پوچھا۔

’صوفیہ......؟‘

’ہاں......‘

’صوفیہ مشتاق احمد......؟‘

’جی......‘

اُس نے نظریں جھکا لیں۔ ’لیکن یہاں میں وحیدہ ہوں۔ اور خدا کے لیے آپ یہاں مجھے وحیدہ کے نام سے ہی پکاریئے گا......‘

’وحیدہ؟‘

’جی۔‘

’مگر......نام بدلنے کے پیچھے......!‘

وہ مسکرائی تو اُس کے چہرے کے اندر چھپے غضب کے سناٹے کا اندازہ ہوا مجھے......

’کوئی لمبی کہانی نہیں۔‘

’پھر بھی......‘

’جگہ بدل گئی تو نام بھی بدل گیا۔‘

’لیکن جگہ کیوں بدلی؟‘

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ مجھے برف کا مجسمہ نظر آئی——

’جگہ کیوں بدلی جاتی ہے؟‘ وہ پوچھ رہی تھی......

’کوئی بھی وجہ ہوسکتی ہے۔‘

’جی......‘ وہ پھر آہستہ سے مسکرائی ’......آپ کو یاد ہوگا......میں نے آپ کو بتایا تھا......وہ پروپوزل......اور وہ حادثہ......‘

’ہاں......‘

وہ ہنس رہی تھی............ مجھے لگا، اب ان لوگوں کو آزاد کردینا چاہیۓ۔ ان لوگوں نے میری وجہ سے اپنی اپنی آزادی کو گروی رکھ دیا ہے۔‘

’ہونہہ۔ آگے......‘

’آگے کی داستان کوئی بہت لمبی چوڑی نہیں—— وہ نوجوان چلا گیا تو مجھے احساس ہوا، اب میں یہاں کیا کررہی ہوں—— میرے بھائی بہن اس سے زیادہ شاید میرے لئے کچھ نہیں کرسکتے۔ اور میری موجودگی ان سب کے لیے ناسور بن گئی ہے۔ مجھے احساس تھا، میرے جاتے ہی سب ٹھیک ہوجائے گا۔ سب اپنی اپنی دنیا میں لوٹ آئیں گے۔‘

’پھر......‘

’پھر کیا—— میں نے رات میں ایک چھوٹا سا بریف کیس اٹھایا۔ کچھ پیسے پڑے تھے۔ بغیر کسی کو بتائے میں نے گھر چھوڑ دیا۔‘

ان لوگوں نے تلاش کیا ہوگا۔ پولس میں رپورٹ؟‘

’نہیں میں اس کا بندوبست کرآئی تھی۔ میں نے ایک چھوٹی سی تحریر چھوڑ دی تھی کہ ’مجھے تلاش نہ کیجئے گا۔ کوئی فائدہ نہیں—— آپ لوگ بہت اچھے ہیں—— آپ نے جو کچھ کیا، وہ شاید ماں باپ بھی نہ کرپاتے—— اب آپ بھی اپنی زندگی جینے کی کوشش کیجئے اور میں بھی...... مجھے یقین تھا، اس تحریر سے وہ لوگ مطمئن ہوجائیں گے اور مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریں گے......‘

’اچھا......‘ میں نے گہری سانس لی۔ غور سے صوفیہ مشتاق احمد کی طرف دیکھا۔ وہ تمام چہرے آنکھوں میں زندہ ہوگئے تھے۔ ثریا مشتاق احمد۔ جججو، صوفیہ کا بڑا بھائی—— ایک گھر میں سہمے ہوئے قید، بے حد شریف لوگ، ایک جوان ہوتی ہوئی لڑکی کی شادی کے لیے الجھ گئے تھے۔ اور لڑکی بھی محض خوب سیرت نہیں۔ خوبصورت بھی—— اور ہم بھولے سے ایسے سماج کا حصہ ہیں، جہاں صوفیہ جیسی لڑکیوں کی شادی بھی عذاب بن جایا کرتی ہے۔ سلسلہ وار مجھے وہ سارے واقعات یاد آگئے۔ میں نے صوفیہ کی طرف دیکھا، جہاں اُس کے چہرے پر ان حادثات و واقعات کا کوئی عکس نہیں تھا۔ یا وہ جان بوجھ کر ان واقعات سے انجان بن رہی تھی۔ یا وقت کے حادثے میں اس نے اپنی زندگی سے کھرچ کھرچ کر ان

واقعات کو الگ کر دیا تھا۔ میں اب بھی اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

’کیا وہ لوگ پھر ٹکرائے۔؟‘

’ہاں،‘ وہ آہستہ سے بولی۔

’کہاں؟‘

’یہیں...... نینی تال میں.....‘

’نینی تال میں......؟‘

’ہاں۔ میں کوئین لورز کی طرف گئی تھی۔ یہیں پاس میں ایک پہاڑی ہے۔ وہاں کئی اچھے ریسٹوران بھی بنے ہوئے ہیں۔ کافی ٹورسٹ آتے ہیں۔ میں اپنی ایک سہیلی کے ساتھ گئی تھی۔ ہم ایک اوپن ریستوراں میں کافی پی رہے تھے۔‘

’پھر.....‘

’میں اچانک کسی کی آواز سن کر چونک گئی۔ میں نے دیکھا۔ میرے ٹھیک دائیں طرف کی کرسیوں پر وہ تینوں موجود تھے۔

’تینوں کون؟‘

’جیجو، اپیا اور بھیا،‘ صوفیہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ’وہ تیز تیز باتیں کرتے ہوئے ٹھہر گئے تھے۔ اور مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اور نہ صرف دیکھ لیا تھا بلکہ پہچان بھی گئے تھے۔‘

’پہچانتے کیوں نہیں۔ اتنے دنوں بعد تمہیں دیکھا تھا...... وہ تو خوش ہو گئے ہوں گے.....‘

صوفیہ کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی...... ’ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ مجھے احساس ہوا، شاید وہ لوگ مجھے دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔ پھر بھی میں اپنے یقین کو پختہ کرنا چاہتی تھی۔......‘

’کیسا یقین؟‘

’وہ یہ، کہ ان لوگوں نے واقعی مجھے دیکھا ہے یا یہ صرف میرا شک ہے ــــ؟ میں وہاں سے اٹھی اور چلتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ یہاں سے میں اس میز اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو آسانی سے دیکھ سکتی تھی۔ اور یقینی طور پر وہ لوگ مجھے وہاں سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے دیکھا...... پہلے اپیا مڑیں...... پھر پلٹ کر جیجو نے اُس جگہ کو دیکھا۔ جہاں میں بیٹھی تھی۔ پھر بھائی نے پلٹ کر اُس جگہ کو دیکھا۔ اب وہ تینوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اور اس بات سے مطمئن تھے کہ شاید میں انہیں نہیں دیکھ پائی۔ جیسا میں نے کہا، وہ اپنی اپنی زندگیوں سے مطمئن تھے۔ مجھے احساس تھا کہ میں ان کی زندگی میں اب کہیں بھی نہیں ہوں۔ پہلے تھی۔ مگر پہلے بھی بوجھ کی طرح تھی۔

میں وحیدہ کی اس حقیقت سے واقف تھا، اس لئے خاموش رہا ــــ اچانک میں نے دیکھا، وہ مسرت سے اٹھی۔ اُس کے ہاتھ پھیل گئے۔ جیسے شاخ پر بیٹھے ہوئے پرندے کو بانہوں میں لے رہی ہو ــــ وہ اُس سے باتیں کر رہی تھی۔

جھمبو...... تم جانتے ہونا...... وہ ابھی اڑنا سیکھ رہا ہے۔ تم اُسے آزاد چھوڑ دیتے ہو۔ تم کو اُس کا دھیان رکھنا چاہئے۔ جھمبو...... چلو جاؤ...... دیکھو...... وہ کہاں ہے...... جلدی جاؤ.....‘

اور میں نے دیکھا، وہ پرندہ اپنی جگہ سے اڑا اور تیزی سے اڑتا ہوا آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔ صوفیہ جواب ہمارے لئے وحیدہ تھی، میری طرف مسکراتی ہوئی پلٹی......

’یہ جھمبو ہے۔ یہاں کی زبان میں اسے جھمبو کہتے ہیں۔ وہ میری دوست ہے نا نا جو، آپ کیا جانیں گے...... وہ پھول بیچتی ہے...... اُس نے مجھے یہاں کے سارے پرندوں کے بارے میں بتایا ہے......‘

’اچھا......‘

جھمبو کا بچہ ہوا ہے...... بس کچھ ہی روز پہلے...... پہلے وہاں...... اُس شاخ پر اُس کا گھونسلہ تھا۔ جھمبو کو اُس کے ساتھ رہنا چاہئے نا......؟‘

وہ بجھ گئی تھی۔ اور یہ وقفہ مجھے اُس کے چہرے کا جائزہ لینے اور اسے پڑھنے کے لئے کافی تھا۔ میں اس احساس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ

وحیدہ ان پرندوں سے اس قدر مانوس کیوں ہے۔ ان میں زیادہ تر پرندے اڑان بھرتے ہوئے اپنے خاندان سے کٹ جاتے ہیں۔ جیسے مثال کے لئے ابھی یہ جھمبو...... میں نے وحیدہ کی آنکھوں میں صاف طور پر چھپے ہوئے درد کو محسوس کیا۔

’تم تو یہاں کے سارے پرندوں کو جانتی ہوگی۔؟‘

’ہاں۔‘ اُس نے معصومیت سے جواب دیا۔ سب میرے دوست ہیں۔‘

’پھر تو ان میں ہی وقت گزر جاتا ہوگا......‘

’نہیں۔ صبح اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ پھر گھر میں امی ابو ہیں۔ انہیں قرآن شریف اور گیتا سناتی ہوں......‘ وحیدہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی — ’وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ فرشتہ صفت۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ دنیا میں اتنے اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔‘

’وحیدہ‘

ناہید کی آواز گونجی تو وحیدہ چونک گئی۔ اُس نے جلدی سے سلام کیا۔

’سلام علیکم‘

’وعلیکم السلام۔‘

کمال یوسف ناہید کے ساتھ باہر آ گئے تھے۔ ناہید میری طرف دیکھ رہی تھی۔

’کیا آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔؟‘

میں نے ہاں کیا تو ناہید ایک دم سے چونک گئی۔

’کیسے جانتے ہیں؟‘

’آپ نے دلی میں اتنی بار تذکرہ کیا اور پھر یہاں بھی — کسی نہ کسی بات پر وحیدہ کا تذکرہ روز ہی نکل آتا ہے۔‘

’ہو ہو......‘ کمال یوسف زور سے ہنسا۔

’ویسے آپ سے بچ کر رہنا چاہئے مصنف صاحب۔‘ ناہید ناز کی آواز میں تلخی تھی۔

’تم یہاں کیا کر رہی ہو وحیدہ۔ چلو اندر چلو......‘

میں نے محسوس کیا۔ کمال کو دیکھتے ہوئے اُس کے اندر ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ شاید یہی کیفیت کمال کی بھی ہو۔ اور ممکن ہے ناہید بھی اس معاملے کو تھوڑا بہت سمجھتی ہو۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ وحیدہ کی موجودگی میں لاجو بجھ گئی تھی۔ ناہید نے لاجو کو چائے لانے کے لئے کہا تو اُس کی آواز میں تلخی کی جھلک تھی۔ ابھی لائی میم صاحب۔ جب وہ طشت میں چائے لے کر آئی تو میز پر چائے رکھنے کے بعد بھی ایک منٹ کھڑی رہی۔ وحیدہ کو دیکھتے ہوئے اُس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ پھر وہ سرعت سے کچن کی طرف لوٹ گئی۔ میں نے دیکھا کمال یوسف بھی محتاط انداز میں وحیدہ کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔ اور ناہید کی عقابی آنکھیں بغور دونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

وحیدہ نے چائے پینے کے بعد خالی کپ میز پر رکھ دیا۔ نگاہیں اٹھا کر ناہید کی طرف دیکھا۔

’آپ کی طبیعت تو اچھی ہے نا؟‘

’ہاں کیوں؟‘

’آپ کا چہرہ زرد نظر آ رہا ہے۔‘ وہ آہستہ سے بولی۔ اب چلوں گی۔ پھر کسی وقت آؤں گی۔‘

’اتنی جلدی کیا ہے؟‘

’نہیں کچھ کام ہے......‘

’ایسا بھی کیا کام......‘

’ابو انتظار کر رہے ہیں۔‘

’ٹھیک ہے......آتی رہنا‘

ناہید بولی ضرور مگر مجھے احساس ہوا اس کی بات میں کوئی وزن نہیں ہے۔ یہ وہ ناہید نہیں تھی، جو بار بار وحیدہ کا تذکرہ کیا کرتی تھی۔ ناہید کی شخصیت میں آتی ہوئی یہ نئی تبدیلی تھی۔

وحیدہ چلی گئی۔

میں وحیدہ سے ملنے۔ اور اُسے جاننے کا خواہشمند تھا۔ وہ اپنے تمام لوگوں سے کٹ گئی تھی۔ اپنے گھر سے کٹ گئی تھی۔ بھائی بہنوں سے جدا ہوگئی تھی۔ اور ایسے میں کسی جوان تنہا لڑکی کے لئے زندگی کے دن گزارنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

اس درمیان دو چار دن گزر گئے۔ وحیدہ نہیں آئی۔ اُس رات کو ہم ٹیرس پر بیٹھے تھے، جب ایک دلچسپ بات ہوئی۔ کسی بات کو لے کر یوسف اور ناہید دیر تک جھگڑتے رہے۔ پھر اچانک ناہید نے وحیدہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

’ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کوئی ملنے آتا ہے تو ڈائرکٹ گھر آتا ہے۔ وہ ہمارے مین گیٹ میں داخل ہو کر درختوں میں گم ہو جاتی ہے۔‘

’درختوں میں نہیں پرندوں میں۔‘

’پرندوں میں۔‘

’ہاں۔ وہ کسی نہ کسی پرندے کو تلاش کرتی ہوئی ہمارے یہاں آجاتی ہے۔‘

’اچھا...... مجھے لگتا ہے یہ پرندہ کافی بڑا ہے۔ اس کا قد تمہارے جتنا تو نہیں ہے؟ ناہید کافی دنوں بعد کھلکھلا کر ہنسی تھی......

کمال کے چہرے پر ناراضگی تھی۔ اب تم نے شک کا دامن تھامنا شروع کر دیا ہے—‘

’بالکل بھی نہیں۔‘

کمال نے طنز سے کہا—’تم پوری عورت ہوئی جا رہی ہو۔‘

’کیا؟‘ ناہید زور سے چیخی۔

’پوری عورت۔ شک کرنا عورتوں کا ہی کام ہے۔‘ کمال آہستہ سے بولا۔ اور اس میں برائی کیا ہے۔ عورت ہی تو ہو۔‘

’نہیں ہوں۔‘

’پھر مرد ہو؟‘

ناہید نے دوبارہ چیختے ہوئے کہا۔ یہ کیا عورت اور مرد لگا رکھا ہے۔‘ وہ سنجیدہ تھی—’تمہاری لغت بدل گئی ہے اور معنی بھی۔

’ابھی تک تو نہیں بدلی۔‘

’بدلی ہے۔ تم لوگوں نے دیکھنا ہی بند کر دیا ہے۔‘

’کس نے؟ مردوں نے؟‘

’نہیں تم لوگوں نے۔‘ ناہید کے لہجے میں ناراضگی تھی—بس مرد سننا چاہتے ہو تم لوگ۔ ہر جگہ ہر مقام پر مرد۔ اور اس مرد نام سے ہی تم لوگوں کی تسلی ہو جاتی ہے۔ اور اس کے نام کے ساتھ ہی خونخوار ہو جاتے ہو۔ کیوں ہے ایسا؟ یہ نام تمہارے اندر کی درندگی کو اتنا ابھار کیسے دیتا ہے کہ جانور ہو جاتے ہو—‘

’ایک مرد برا ہو جائے تو تمام مردوں کو جانور نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔‘

’اچھا......‘

ناہید اس بار زور سے ہنسی—’اچھے خیالات ہیں تمہارے۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ یہ مرد کچھ زیادہ ہی تمہارے وجود میں سانس لینے لگا ہے۔ اب مجھے اس مرد کو نکالنا ہوگا۔‘

ماحول میں خاموشی چھا گئی تھی۔ کمال یوسف بھی خاموش تھے۔ لیکن مجھے اس وقت گمان نہیں تھا کہ یہ رسمی نوعیت کے مکالمے محض مکالمے نہیں ہیں۔ آنے والے دنوں میں یہ مکالمے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بننے والے ہیں۔

اوراس درمیان وحیدہ کو لے کر خبر ملی کہ وہ اپنے بڑے ابو کو لے کر پریشان ہے۔تین دن پہلے ناگارجن سینی کو ہارٹ اٹیک آیا تھا۔
وحیدہ سے ملاقات کے بعد جو تفصیل سامنے آئی، وہ وحیدہ کے لفظوں میں ہی آپ کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(2)

ناگارجن سینی اُس دن صبح سے تکلیف میں تھے لیکن وہ کوشلیا کو اپنی تکلیف بتانے سے گھبرا بھی رہے تھے۔کوشلیا پریشان ہو جائے گی۔شام ہونے تک سینے کی تکلیف بڑھ چکی تھی۔وہ کچھ بے چینی محسوس کر رہے تھے۔وحیدہ کو آواز دے کر بلایا اور کہا— گیتا سناؤ۔وحیدہ دیر تک پڑھتی رہی۔اس درمیان کوشلیا بھی دو بار دیکھنے آئی۔پھر چلی گئی—

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔یہی کوئی ۸ بجے کا وقت ہوگا۔پہاڑیوں کی راتیں جتنی حسین لگتی ہیں اتنی ہی خوفناک بھی ہوتی ہیں۔رات کے اندھیرے میں جھل مل روشنیوں کے درمیان وادیاں اتنی سنسان اور ویران لگتی ہیں کہ وحشت ہوتی ہے—دور تک پہاڑوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔اور الگ الگ پہاڑیوں پر بنے ہوئے مکانات—لوگ اس وقت زیادہ تر گھروں میں ہوتے ہیں—شام ہوتے ہی مصروفیات سمٹ کر گھر تک محدود ہو جاتی ہیں—

وحیدہ نے گیتا پڑھتے ہوئے محسوس کیا، ابو کے چہرے پر درد کی چھٹپٹاہٹ۔اُس نے دریافت کیا تو ناگارجن بولے......

'نہیں بیٹی۔اس عمر میں کبھی کبھی گیس پھنس جاتی ہے۔گیس پھنس جاتی ہے تو پریشان کرتی ہے۔'

'کوئی تکلیف ہو تو ڈاکٹر کے یہاں چلیں ابو......؟'

'نہیں بیٹی۔'

'چائے یا کافی۔پینا چاہیں گے؟'

'نہیں بیٹی۔کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گا۔' ناگارجن سینی نے مسکرانے کی کوشش کی'— تم کتنا خیال رکھتی ہو میرا— تمہارے آنے سے گھر سورگ ہو گیا ہے۔'

وحیدہ مسکرائی کچھ بولی نہیں—

ناگارجن آہستہ سے بولے—ایک بیٹا آنے کو کہہ رہا ہے۔پتہ نہیں آنے میں دیر نہ ہو جائے۔'

''کیسی باتیں کرتے ہیں ابو—جایئے میں نہیں بولتی۔'

ارے میں تو مذاق کر رہا تھا۔بیٹی۔'

مگر وحیدہ کا دل بھی اداس تھا۔آج برسوں بعد اُسے اپنے گھر کے لوگ یاد آئے تھے۔امی ابو کا چہرہ نگاہوں میں بجلی کی طرح کوندا تھا۔سب کتنی جلد چلے گئے۔پھر بجیا اور جیجو کا چہرہ ابھرا۔یہ لوگ اُس کے لئے کتنا پریشان رہتے تھے......زندگی کا سفر بھی عجیب ہے۔ایک لمحے میں سب کھو جاتا ہے۔وہ لوگ جن سے کبھی دوریوں کا تصور بھی ممکن نہیں تھا اور ایک لمحے میں زندگی میں نئے لوگ شامل ہو جاتے ہیں۔کبھی جو خواب وخیال میں بھی نہیں آئے۔زندگی اُن کے ہمراہ شروع ہو جاتی ہے—

آج صبح سے اُس کے وجود میں بھی ہلچل تھی۔جیسے......کچھ ہونے والا ہے......مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ کیا ہونے والا ہے......وہ خوفزدہ

تھی...... وہ برسوں بعد خوف کو اپنے وجود میں رینگتے اور پھسلتے ہوئے محسوس کر رہی تھی......

کچھ ہونے والا ہے......

مگر کیا......؟

کچھ تو ہونے والا ہے......

اب اور کیا برا ہوگا......؟

وحیدہ نے کوشش کی کہ اپنے دوست پرندوں کی یادوں میں خود کو بہلانے کا بہانہ تلاش کر سکے مگر یہ بھی ممکن نہ ہو سکا——

اُس شام اُس نے پہلی بار اس گھر میں خزاں کا رنگ دیکھا تھا اور اسے اس رنگ سے وحشت ہوئی تھی—— ابو کے پاس سے ہو کر وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ یہاں دیواروں پر بھی اُس نے دنیا بھر کے پرندوں کی تصویریں لگا رکھی تھیں۔ اب یہی اُس کی دنیا تھی—— دل ڈوبتا محسوس ہوا تو کھڑکی کھول کر باہر کا جائزہ لیا—— رات کے سناٹے میں جھینگروں اور پتنگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں—— درخت پرندوں سے خالی تھا۔ سامنے والی سڑک سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے ستاروں کا جمگھٹ اُسے اچھا لگا۔ اور ان کے درمیان سے چاند کا سفر بھی اس وقت طلسمی کہانیوں جیسا لگ رہا تھا۔ اس نے ماحول سے خود کو نکالنے کی کوشش کی مگر اندر ڈر اب بھی موجود تھا۔

ایک بجلی چمکی...... اور اس بجلی میں ابو کا چہرہ چمکا اور اس چہرے کے ساتھ ایک دوسرا چہرہ بھی تھا۔ امی کا فرشتوں جیسا معصوم چہرہ...... ایک چہرہ جو گم ہو گیا تھا۔ ایک چہرہ جو پھر سے زندہ ہو گیا تھا——

ایک گھر، جواب کہیں نہیں تھا......

وہ گھر...... گمشدہ گھر خیالوں میں موجود تھا۔ تنگ گلیوں میں آباد ایک پرانا سا مکان—— اور شفقتوں والے مہربان چہرے...... محبت سے آواز دیتے ہوئے ہونٹ...... صوفیہ...... صوفیہ......

جی امی...... ابھی آئی......

صوفیہ بیٹی...... چائے پڑے ہوئے مدت ہو گئی۔

ابو ابھی لائی......

وہ دوڑ رہی ہے...... یہ ننا کا کمرہ ہے۔ ننا تسبیح کے دانوں پر ہاتھ۔ پھیر رہی ہیں...... یہ کلوا ہے...... یہ اپیا کا کمرہ...... یہ جیجو کا...... پاؤں میں رفتار سما گئی ہے...... ہر کمرہ زندگی کے نور سے معمور...... اور ایک لمحے میں گھر گم...... محبت بھرے چہرے گم......

ایسا لگتا ہے...... وہ ابھی باتیں کرتے ہیں۔ اور پھر لگتا ہے، وہ کہیں نہیں ہیں۔ وہ گھر سے زندگی تک کہیں نہیں ہیں۔ اُن تک پہنچنے والے سارے راستے مسدود...... لوگ زندہ چہروں میں موت کو کیوں نہیں پڑھتے......؟

کہ صوفیہ ابھی ہے...... اور ابھی نہیں رہے گی......

ابھی باتیں کر رہی ہے...... اور پھر باتیں بھی وداع کی پہاڑیوں میں کھو جائیں گی......؟ موت کا ایک لمحہ سب کچھ بکھیر دیتا ہے......

وہ پھر صوفیہ سے وحیدہ بن گئی...... آنکھوں میں نمی آ گئی تھی...... آنکھوں کو خشک کیا—— ٹھیک اُسی وقت ایک چیخ سنائی دی۔

'وحیدہ۔ جلدی آؤ......'

وہ تیز تیز سیڑھیاں اترتی ہوئی امی کے کمرے میں گئی تو انہیں پاگلوں کی طرح روتے ہوئے پایا......

'یہ کچھ بولتے نہیں......'

'کیا——' میں دیکھتی ہوں......، وحیدہ نے سانس برابر کی۔ ابو کی طرف دیکھا۔ نبض دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس کا مطلب زندگی موجود ہے۔ ایک زمانہ تھا، جب وہ میڈیکل کرنا چاہتی تھی۔ مگر خدا کو منظور نہ تھا۔ پھر مجبوریاں حاوی ہوتی چلی گئیں۔

'نبض چل رہی ہے۔ گھبرائیے نہیں۔ انہیں فوراً اسپتال لے جانا ہوگا'

’مگر کیسے......؟‘
امی مسلسل روئے جا رہی تھیں۔کون لے جائے گا انہیں اسپتال— پہاڑیوں پر کوئی نہیں ملتا۔کس سے باتیں کرے گی۔؟‘
’کسی سے بھی نہیں۔‘
’پھر کیسے لے جائے گی......؟‘
’میں ہوں نا......، وحیدہ کے لہجے میں اعتماد تھا۔میں نے ڈرائیونگ سیکھی ہے۔باہر ابو کی کار کھڑی ہے۔میں ڈرائیو کرلوں گی......‘
’ارے یہ پہاڑی سڑکیں ہیں۔تو نے کبھی ان سڑکوں پر ڈرائیو نہیں کیا ہے۔‘
’امی۔میں ہوں نا......ابو کو کچھ نہیں ہوگا۔وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ٹھہریے۔پہلے میں گاڑی نکال لوں۔‘

وحیدہ کے بدن میں جانے کہاں سے قوت آ گئی تھی۔اُس نے سوچ لیا تھا، اُسے کہاں جانا ہے۔یہاں سے دوسرے موڑ، یعنی پہاڑی کے اُس طرف پرائیویٹ اسپتال تھا۔ڈی مورو اسپتال......گاڑی کی کنجی لے کر وہ باہر کی طرف بھاگی۔پورٹیکو سے گاڑی نکال کر گھر کے دروازے پر لگا دیا۔پھر امی کا سہارا لے کر ابو کو گاڑی تک لے آئی— دروازے پر تالہ لگایا۔سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔لیکن یہ لمحے قیمتی بھی تھے اور فیصلہ کن بھی۔اور یہی صحیح ہے کہ اُس نے ان پہاڑی علاقوں میں اس سے پہلے کبھی گاڑی نہیں چلائی تھی۔لیکن اُسے ہر موڑ کا پتہ تھا۔گاڑی چلانے سے پہلے اُس نے امی سے صرف اتنا کہا۔

’ابو کو کچھ نہیں ہوگا۔آپ بھگوان کو یاد کیجئے۔میں اللہ کو یاد کرتی ہوں۔دعا کیجئے۔دعا کا وقت ہے۔‘

گاڑی دو ایک جگہ اچھلی مگر وحیدہ نے رفتار پر قابو پالیا۔اور کچھ ہی دیر بعد اُس کی گاڑی ڈی مورو اسپتال کے باہر کھڑی تھی۔دروازہ کھولتے ہی اُس نے اسپتال کے گارڈس سے کہا—

’ایمرجنسی۔‘

ان راتوں میں، پہاڑیوں پر بنے اسپتالوں میں بھیڑ نہیں ہوتی۔اتفاق سے کئی ڈاکٹر نائٹ شفٹ میں تھے۔فوراً ناگارجن سینی کو آئی سی یو میں لے جایا گیا۔

وارڈ کے باہر امی کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔وحیدہ بار بار دعائیں پڑھ رہی تھی۔اُس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے قطرے نکل کر رخسار پر پھیل رہے تھے۔یہ آدھا گھنٹہ قیامت کا گھنٹہ ثابت ہوا۔ڈاکٹر نے باہر آ کر بتایا۔

’ہارٹ اٹیک آیا تھا۔مگر اب نارمل ہیں۔ابھی ان سے کوئی نہیں مل سکتا۔‘
’دور سے دیکھ تو سکتی ہوں......‘
’نہیں۔ابھی نہیں— پوری طرح آؤٹ آف ڈینجر نہیں کہا جا سکتا۔‘

امی کو سہارا دے کر اُس نے وہاں لگے ہوئے صوفے پر بیٹھا دیا۔وہ اکثر اپنے دل پر بھروسہ کرتی تھی۔اُسے یقین تھا۔ابو کو کچھ نہیں ہوگا۔‘

وارڈ بوائے ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔اسپتال میں ریسپشن پر بیٹھی ہوئی لڑکی کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔وحیدہ کو احساس ہو گیا تھا کہ صبح سے اس کا دل کس بات کے لئے گھبرا رہا تھا۔لیکن اب وہ مطمئن تھی......امی کے آنسو خشک تھے۔وہ نظریں جھکائے ہوئے پراتھنا کر رہی تھیں......صبح ہوتے ہوتے ڈاکٹر نے خوشخبری دے دی کہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔لیکن ابھی انہیں کچھ دن اسپتال میں ہی رہنا ہوگا۔

☆☆

ابو اسپتال سے گھر آئے تو دو دنوں تک اپنے خیالوں کی دنیا میں گم رہے۔وحیدہ کو اس بات کا احساس تھا کہ شاید ابو اپنی بیماری سے ڈر گئے ہیں۔ایک بار ہارٹ اٹیک آیا تو دوسری بار بھی آ سکتا ہے۔ممکن ہے انہیں اس بات کا احساس ہو رہا ہو کہ اب اُن کی زندگی بہت کم بچی ہے۔مگر اُس دن جب دوپہر کے وقت۔انہوں نے وحیدہ کو آواز دی اور وحیدہ نے ان کے خیالات سنے تو محسوس ہوا، ابو تو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔

ناگارجن سینی نے پیار سے وحیدہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔

’مجھے کوشلیا نے سب کچھ بتا دیا۔ان پہاڑی سڑکوں پر کسی اجنبی کے لئے ڈرائیو کرنا آسان نہیں ہوتا وحیدہ۔مگر اس وقت جو ممکن تھا، وہ تم نے

کر دکھایا...... کچھ بھی ہوسکتا تھا، مگر تم کو صرف میرا خیال تھا اور اس خیال کے آگے تم چٹان کی طرح کھڑی تھی۔ میرے بچے بھی شاید اس موقع پر وہ نہیں کرتے، جو تم نے کر دکھایا......'

ابو......' اس نے بولنا چاہا۔ مگر نا گارجن نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

'آج صرف مجھے بولنے دو بیٹی۔ میری بات غور سے سنو۔ میرا بیٹا آنے والا ہے۔ سنگاپور سے۔ لیکن میں اُس کی آمد سے خوش نہیں ہوں۔'

'کیوں ابو......'

'وہ میرے لیے نہیں آرہا ہے— اس عمر میں بیٹے اپنے ماں باپ کے لئے نہیں آتے۔ وہ آجاتے ہیں یہی غنیمت ہے۔ اور ہم انہیں دیکھ لیتے ہیں۔ مگر وہ پیسوں کے لئے آتے ہیں بیٹی۔ ایک وقت میں یہ پیسے ماں باپ سے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔'

'ایسا نہیں ہے ابو...... ہوسکتا ہے، وہ ایسا نہ سوچتے ہوں......'

نا گارجن نے وحیدہ کی بات کاٹ دی۔ ان کی آنکھیں چھت کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے دوبارہ وحیدہ کی طرف دیکھا......

'میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تم سے۔ اور امید کرتا ہوں تم برا نہیں مانو گی۔'

'جی ابو' وحیدہ آہستہ سے بولی۔

'دیکھو بیٹی— موت ابھی، ایک جھٹکا دے کر چلی گئی۔ مگر ابھی زندہ ہوں۔ مرنے سے نہیں ڈرتا۔ ذمہ داریوں کے ادھورے رہ جانے سے ڈرتا ہوں۔ بھگوان نے ایک بات صاف کر دی بیٹی۔ سوچتا تھا، رشتے آسمان میں ہی بنتے ہیں۔ رشتے اسی زمین میں بنتے ہیں...... اور جو رشتے زمین پر بنتے ہیں وہ زیادہ مستحکم ہوتے ہیں...... سنو بیٹی...... دو دنوں سے یہی سوچ رہا تھا۔ میری آنکھیں بند ہوگئیں تو تم کہاں جاؤ گی؟ کیا کرو گی؟'

'ابو...... میری فکر نہ کریں۔ یہ سب نہ سوچا کریں ابو۔'

نا گارجن نے دوبارہ خاموش رہنے کا اشارہ کیا— 'سنو، بیٹی، جو بات کہنے جا رہا ہوں، وہ اکیلی میری نہیں ہے۔ کوشلیا کی بھی ہے۔ کوشلیا بھی یہی چاہتی ہے۔ میری آنکھیں بند ہوئیں تو میرے بیٹے سب سے پہلے اس مکان پر قبضہ کرنا چاہیں گے۔ اب میری بات سنو...... آج میں نے اپنے وکیل کو بلایا ہے۔'

'جی ابو......، وحیدہ کو خوف کا احساس ہوا۔ کیوں ابو؟'

'میرے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے باہر ہیں۔ اور ایک تم ہو۔ میں تمہارے اور اپنے رشتے کو قانونی مضبوطی دینا چاہتا ہوں۔ میرے پیسوں پر جتنا حق میرے بیٹوں کا ہوگا، اتنا ہی تمہارا ہوگا بیٹی۔ میں ایک حصہ ابھی سے تمہارے نام نکال کر الگ کرنا چاہتا ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ان پیسوں سے تم اپنی زندگی بنانے اور سنوارنے کا کام کرو......'

نا گارجن خاموش ہوئے۔ وحیدہ کی طرف دیکھا۔ وحیدہ کسی پتھر کے مجسمہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ آنکھیں اشکبار۔ لفظ گم...... اُس نے نگاہیں اٹھائیں۔ ابو کہتی ہوئی نا گارجن کی بانہوں میں جھول گئی۔ پھر آنسوؤں کو خشک کیا۔ لہجے میں اعتماد پیدا کیا۔

'لیکن میں ان پیسوں کو قبول نہیں کروں گی ابو...... کسی قیمت پر نہیں۔'

'جانتا تھا تم یہی کہو گی...... لیکن تمہیں قبول کرنا ہوگا بیٹی۔ ابو کہتی ہو تو بیٹی کے لئے باپ کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔'

'نہیں ابو...... کسی بھی قیمت پر نہیں اور یہ میرا فیصلہ ہے ابو......' آپ بول چکے اور میری سنیں......' وحیدہ نے ہاتھوں سے اشارہ کیا— 'میں بھی خون کے رشتے کو نہیں مانتی۔ رشتے اس دنیا میں بنتے ہیں۔ اور جو یہ رشتہ آپ سے میرا ہے، وہ ان پیسوں سے بلند ہے۔'

'جیئے گی کیسے—؟ نا گارجن زور سے بولے— 'قدم قدم پر خوفناک جانور ہیں وحیدہ۔ لوگ جینا مشکل کر دیں گے۔'

'نہیں کریں گے۔ آپ ہیں۔ آپ کی دعائیں ساتھ ہیں۔ اور ابو...... میں نے آزمایا ہے...... راستہ بن جاتا ہے۔ راستہ بننے لگتا ہے...... اس رشتے میں پیسے کو نہ آنے دیجئے۔ میرے لئے یہ پیار بیش قیمت ہے۔ یہاں پیسہ آگیا، تو میں اپنے آپ کو کھو دوں گی۔ بڑی مشکل سے اپنے

آپ کو پایا ہے ابو...... برسوں لگے ہیں۔'

اُس کی آنکھیں نم تھیں۔

کندھے پر کسی نے شفقت بھرا ہاتھ رکھا تو اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ کوشلیا تھی۔ کوشلیا کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

'بچے ان پیسوں کی قدر نہیں کریں گے بیٹی۔ ہم نہیں ہوں گے تو ہم یاد بھی نہیں آئیں گے—'

'کہاں جائیں گی آپ—؟ آپ دلوں میں رہتی ہیں امی اور آپ دلوں میں رہیں گی ہمیشہ۔'

ناگارجن بستر پر لیٹ گئے۔ آہستہ سے بولے۔

'یہ بٹیا رلا دیتی ہے۔ باپ کو ذمہ داری بھی ادا کرنے سے روک دیتی ہے۔'

وحیدہ نے مسکرانے کی کوشش کی...... 'کچھ بھی بول لیجئے ابو......بس موت کی باتیں نہ کیجئے۔ یہ حقیقت مجھے توڑتی ہے۔ پاگل کر دیتی ہے۔ آپ لوگوں کو کبھی کچھ نہیں ہوگا......' وحیدہ کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا......

'وہ چھپی آ گئی ہوگی۔ میں ابھی آتی ہوں امی'

'چھپی......؟ ناگارجن چونک کر بولے......'

'ایک چڑیا ہے۔ ابو......ان دنوں میری دوست وہی ہے۔'

(3)

مجھے یہاں رہتے ہوئے اب کافی دن ہو گئے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا۔ اب ایک دو روز میں دلی واپس ہو جاؤں گا۔ تنہائی میں، ان کہانیوں کی کڑیاں جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے، کمال یوسف اور ناہید کی کہانی ایک ایسے انجام پر پہنچ چکی ہے، جہاں کبھی بھی کوئی دھما کہ ہوسکتا ہے۔ مگر شاید ان دونوں کو جوڑنے والی کڑیوں کا نام باشا تھا۔ باشا ذرا بھی بیمار ہوتا تو دونوں کی پریشانیاں دیکھنے کے لائق ہوتیں۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ اس سفر نے میری ملاقات صوفیہ مشتاق احمد سے بھی کرادی تھی۔ اور اس نئی نئی سی صوفیہ میں مجھے ایک خود اعتماد لڑکی کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اُس روز صوفیہ یعنی وحیدہ سے دوبارہ ملاقات کا موقع ملا۔ اپنے گھر کے باہر وہ اکیلی تھی اور پتھر کے بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھی تھی...... اُس دن وہ دیر تک مجھے پرندوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ مجھے اُس نے بتایا کہ یہاں کوئی سو سے زیادہ قسمیں مسافر پرندوں کی ہیں...... کچھ پرندے موسم سرما میں یہاں اپنا آشیانہ بناتے ہیں۔ اور کچھ گرمیوں کے موسم میں روس یا شمالی یوروپ کو واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اور کچھ پرندے صرف گرمیوں کے موسم میں آتے ہیں۔ موسم کے سرد ہوتے ہی افریقہ جیسے ملکوں کی طرف پرواز کر جاتے ہیں...... جو پرندے باہر سے آتے ہیں۔ ہم انہیں مہمان پرندے کہتے ہیں......

'مہمان پرندے؟'

'میں بھی تو مہمان ہوں۔' اور آپ بھی — وہ مسکرائی...... زیادہ تر مسافر پرندے آبی پرندے ہوتے ہیں...... جیسے مرغابیاں، کونجیں...... یہ زیادہ تر جھیلوں کی سطح پر نظر آتی ہیں...... ہاں، خشکی پرندے کم ہوتے جا رہے ہیں...... جیسے چڑیاں، ٹیٹریاں...... چکور...... تلور...... وہ ایک بار پھر مسکرائی — پرندے سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ انہیں پنجرے میں قید دیکھنا چاہتے ہیں۔ جبکہ وہ اپنی آزادی سے پیار کرتے ہیں......

وہ کہیں اور دیکھ رہی تھی' ...... میں آزادی کو سمجھ ہی نہیں سکی۔ جب سمجھنا چاہا تو دیر ہو چکی تھی......' اُس نے مسکرانے کی کوشش کی...... اڑتے ہوئے پرندوں کا ایک غول آیا تو وہ اچانک خود کو سمیٹتے ہوئے ان کی طرف بھاگی، تیز تیز ہاتھ ہلاتے ہوئے انہیں کچھ اشارہ کرتی رہی۔ پھر میری طرف مڑی......

'یہ مسافر پرندے تھے...... جانے کہاں سے آٹپکتے ہیں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو ایک خاص موسم میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے ماریا نے بتایا تھا۔ ان میں وہ پرندے ہیں، جو اپنے گھونسلوں کے آس پاس رہتے ہیں...... کتنا مزہ آتا ہوگا۔ ایک ساتھ ایک گھونسلے میں...... پھر آزادی سے ہوا میں اڑتے ہوئے اپنا علاقہ چھوڑ کر کسی اور دیس میں نکل جانا...... اور آپ دیکھیں، ان میں سب سے آگے ایک پرندہ ہوتا ہے، جو رہنما پرندہ کہلاتا ہے۔ باقی پرندوں کی رہنمائی کرتا ہوا......'

وحیدہ ایک بار پھر بجھ گئی تھی۔ رہنمائی کرنے والے کھو جائیں تو آپ کے پاس سے ایک پوری دنیا کھو جاتی ہے...... ہے نا......'

پھر وہ دیر تک مجھے قطبی پرندے، سائبیریا سے آنے والے پرندوں اور ان کی رفتار کے بارے میں بتاتی رہی۔ میں نے ایک بات خصوصی طور پر نوٹ کی...... ان پرندوں کے ساتھ وہ اپنی ذات کے سفر میں رہتی ہے...... مسلسل...... وحیدہ ماضی کو بھول ہی نہیں پائی۔ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ اُس میں زندہ ہے۔ جبکہ وہ یہ احساس کراتی ہے کہ وہ گزرے حالات سے واپس نکل آئی ہے۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے۔

اس وقت میں بھی ایک پرندہ تھا اور ایک جوکر...... میں اپنی جگہ سے اچھل اچھل کر اڑنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ مگر وحیدہ سنجیدہ تھی۔ جب اُس کے لئے برداشت کرنا مشکل ہوگیا تو وہ آہستہ سے بولی۔

'پلیز ایسا مت کیجئے۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'

☆☆

اُس دن رات ہوتے ہی میں نے فیصلہ کمال یوسف کو سنا دیا۔

'میں دلی واپس جا رہا ہوں۔'

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دیر تک میرے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

'صورتحال ابھی بھی نازک ہے۔ اور میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس طرح کی زندگی میں کب تک اور کیسے گزار سکتا ہوں۔ اور سچ پوچھیے تو آپ کو یہاں بلانے کے پیچھے مقصد بھی یہی تھا—— آپ کہانیاں لکھتے ہیں۔ ہزار طرح کی زندگیاں آپ کے سامنے آتی ہیں—— ان سے الگ ہزار طرح کی زندگیوں کا آپ تعاقب کرتے ہیں اور سایہ کی طرح پیچھا کرتے ہیں۔ مگر آپ یہ جانتے ہیں کہ جو کچھ آپ چاہتے ہیں، اُس سے الگ بھی کئی طرح کی انوکھی زندگیاں ہوتی ہیں، جو تحریر میں کبھی نہیں لائی جاتیں—— شاید میری دلی میں آپ سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو میں آپ کو بلاتا بھی نہیں۔ آپ ایک رائٹر ہیں اور میں سمجھتا ہوں، زندگیوں کو سمجھنا، معنی نکالنا مجھ سے یا عام انسانوں سے کہیں بہتر آپ لوگ کر سکتے ہیں اور اتفاق سے آپ ناہید سے بھی مل چکے ہیں۔ اور یہ میرے لئے آسانی تھی کہ آپ کو یہاں بلایا جا سکتا ہے۔'

وہ سانس لینے کے لئے رکا۔ غور سے میری طرف دیکھا۔ پھر کہنا شروع کیا۔ اور اس بارے میں جو کچھ میرے ساتھ گزرتا رہا، میں آپ کو بتاتا بھی رہا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ ناہید پہلے ایسی نہیں تھی۔ ممکن ہے اگر ایسی ہوتی تو میں اس سے شادی ہی نہ کرتا۔ مگر اچانک اس سطح پر ایک بدلے ہوئے باغی کردار میں آجانا میرے لئے پریشانی کا سبب ہے اور آپ بہتر جانتے ہیں کہ باشا کے ہوتے ہوئے میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا...... اب جیسے کل ہی کا واقعہ ہے......'

کمال یوسف ایک لمحے کے لئے رکا۔ وہ دیر تک چھت کی طرف دیکھتا رہا جیسے جملے جوڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر گہری سانس کھینچ کر اس نے کہنا شروع کیا—— 'ادھر وہ ٹھیک تھی اور مجھے لگ رہا تھا، معاملات کسی حد تک قابو میں ہیں۔ کل رات کے ا بجے اچانک وہ اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اُس نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا آنکھیں بند کرلو...... میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے کچھ دیر کے لئے محسوس ہوا کہ پچھلی تمام باتوں کو بھلا کر شاید اُس کے اندر محبت کا گمشدہ جذبہ پھر سے بیدار ہو رہا ہو۔ مگر یہ میری غلط فہمی تھی۔ اچانک مجھے ہونٹوں پر کچھ پھسلتا ہوا محسوس ہوا......'

'پھسلتا ہوا......'

'جی ہاں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس کے ہاتھ میں ایک سرخ رنگ کی لپسٹک تھی اور وہ پورے ہوش وحواس میں میرے ہونٹوں پر لپسٹک لگانے کی کوشش کر رہی تھی—— میں زور سے چلایا۔ پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔ اُس کا جواب تھا، تمہیں خوبصورت بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تمہارے ہونٹ سگریٹ پی کر سیاہ ہوتے جا رہے ہیں۔ میرے غصہ کا عالم یہ تھا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس کا گلہ گھونٹ دیتا۔ یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ناہید بالکل بھی میک اپ نہیں کرتی۔ ممکن ہے میک اپ کرنا بھی اسے عورتوں کا ہی مشغلہ نظر آتا ہو اور ممکن ہے مجھے لپسٹک لگاتے ہوئے وہ میرے اندر ایک عورت کی موجودگی محسوس کر رہی ہو اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں اس قدر غصہ میں تھا......لیکن میں نے فوراً ہی خود کو سنبھالا۔ وہ ہاتھوں میں لپسٹک لیے ہوئے بالکل مردوں والے انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

'لگالو......اچھے لگو گے......'

'تم پاگل ہوگئی ہو۔'

'ہوگئی ہوں۔ لیکن پھر کہتی ہوں۔ لگالو......ہونٹ خوبصورت ہو جائیں گے۔'

'مرد اپنے ہونٹوں پر لپسٹک نہیں لگاتے......'

وہ زور سے ہنسی— 'تم کب سے مرد بن گئے—اور یہ بار بار خود کو مرد کہنا بند کرو گے یا نہیں۔ میں کہتی ہوں......دو منٹ بھی نہیں لگیں گے۔ میری بات مان لو......'

میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اور دیر تک غصے سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور اس درمیان وہ مسکراتی ہوئی میری طرف دیکھتی رہی۔

'کمال۔ تم پہلے میری ہر بات مان لیتے تھے۔ اب تم میں ضد آ رہی ہے اور تم جانتے ہو، تمہاری ضد میں پسند نہیں کرتی......

'یہ ضد نہیں ہے۔'

'پھر کیا ہے کمال۔ بس ایک فرمائش ہی تو ہے۔ چھوٹی سی فرمائش۔ تم ان فرمائشوں کو بھی پورا نہیں کر سکتے۔؟'

'میں نے تمہاری کئی ایسی فرمائشیں پوری کی ہیں۔ لیکن اب تمہاری ایسی کوئی فرمائش پوری نہیں کروں گا۔' میں زور سے ہنسا۔ 'چلو۔ خوش ہوں۔ تم اپنے لئے ایک لپسٹک تو لائی۔ تمہارے ہونٹ خوبصورت ہیں۔ رس سے بھرے ہوئے......' میں اسے جلانے کی کوشش کر رہا تھا...... اور یہ جو تمہارے ہونٹ اوپر تک ابھرے ہوئے ہیں نا...... یہی ہونٹ میرے آئیڈیل ہیں...... یہاں گوشت کا گودا زیادہ ہے۔ رس سے بھرا......غور سے ان جگہوں پر دیکھو تو بیشمار سرخ لکیریں ملتی ہوئی مرد کے جوش جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں اور بیساختہ بوسہ لینے کی خواہش ہوتی ہے......'

وہ زور سے چیخی۔ 'تم پرورٹیڈ ہو۔ ذہنی مریض ہو۔ تمہیں ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت ہے۔' وہ پھر چیخی۔ میں آخری بار کہتی ہوں، لگا لو...... ورنہ......'

'ورنہ کیا......' میں نے بھی غصہ سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور اس بار ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھوں سے لپسٹک چھین لیا۔ کھلی ہوئی لپسٹک کے سرخ رنگوں نے میری انگلیوں پر اپنے نشانات چھوڑ دیے تھے—میں نے لپسٹک کو غصے میں کھڑکی سے باہر پھینک دیا...... مجھے یقین تھا وہ مجھ پر چلائے گی، کاٹنے کو دوڑے گی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ کم از کم دس منٹ تک وہ اپنی جگہ پر پتھر کا بت بنی بیٹھی رہی۔ پھر میں نے دیکھا—واش بیشن پر جا کر اُس نے اپنے چہرے کو دھویا۔ ممکن ہے ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے اندر کے غصے کو خارج کر رہی ہو۔ کچھ دیر بعد وہ بستر پر آئی اور سر تک چادر کھینچ لی۔'

کمال نے میری طرف دیکھا— 'مجھے ابھی بھی لگتا ہے اُس کا غصہ کم نہیں ہوا ہے۔ وہ کسی دن کوئی اور فرمائش کے ساتھ میرے سامنے آ سکتی ہے۔ لیکن اب میں نے بھی سوچ لیا ہے، میں اس کی ایسی کوئی فرمائش پوری نہیں ہونے دوں گا۔'

اُس نے آہستہ سے کہا— 'کیونکہ اب اُس کی ہر فرمائش میری مردانگی سے ہو کر گزرتی ہے۔ اور مجھے پریشان کر جاتی ہے۔'

کمال یوسف نے بے بسی سے میری طرف دیکھا— 'کیا آپ بتائیں گے کہ ان صورتوں میں مجھے کیا کرنا چاہئے، یا کیا قدم اٹھانا چاہئے۔ ؟'

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ظاہر ہے میں کسی ایسے قدم کے بارے میں نہیں کہہ سکتا تھا، جو کمال کی ازدواجی زندگی کے لئے خطرہ پیدا کرے۔ کیونکہ بکھرتے ہوئے گھر کو بچانا بھی میری ذمہ داری تھی۔ لیکن مشکل یہ تھا کہ ناہید نے زندگی کا جو راستہ اختیار کیا تھا، وہاں کمال کتنے دنوں تک خود کو روک سکتا تھا—اور ایسی صورت میں جب بقول کمال، مسلسل اُس کی مردانگی پر ضرب پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہو—

'مردانگی—؟'

میری سوچ بار بار اسی مقام پر آ کر ٹھہر جاتی تھی۔ فرض کیجئے اگر کمال اس پورے معاملے کو مردانگی سے نہ جوڑتا تو کیا یہ معاملہ اتنا سیریئس ہو سکتا تھا—؟ مثال کے لیے میں کچھ دیر کے لئے اس پورے معاملے کو الٹ دیتا ہوں۔ رات کے کسی لمحے ایک شوہر محبت سے اپنی بیوی کو مردانہ لباس پہننے کو کہتا ہے—

فرض کیجئے شوہر مردانگی کے تصور سے کھیل کے بہانے اپنی بیوی کے وجود میں ایک مرد دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے تو کیا بیوی کا وہی ردعمل ہوگا، جو کمال یوسف کا ہوا؟ کیا اس سے عورت کے 'عورت پن' پر اتنی ہی چوٹ پڑتی، جتنی چوٹ کمال کی مردانگی پر پڑی؟ جبکہ دوسرے مردوں کے مقابلہ میں کمال یوسف کی شخصیت میں صبر بھی ہے اور برداشت کا مادہ بھی۔ پھر اگر ایک شریف خاندانی مرد جو اپنے ازدواجی رشتہ کو بکھرنے سے

روکنا چاہتا ہے، اگر وہ مردانگی میں آنچ آنے سے اس قدر متشدد ہوسکتا ہے تو عام مرد کی فکر کیا ہوگی—؟ جہاں تک میرا خیال ہے، کسی عورت کا رد عمل اتنا گہرا نہیں ہوگا، جو اس وقت کمال یوسف کا تھا اور میں اُس کی شخصیت کو مردانگی کے آئینہ میں بکھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا—اور ناہید ناز کی بات پختہ ہوتی جا رہی تھی کہ مرد ہر جگہ اپنی مردانگی کو سامنے رکھ دیتا ہے۔ صدیوں میں اسی مردانگی کو ڈھوتے ہوئے مردوں نے عورت کو استعمال بھی کیا اور اس کا استحصال بھی۔ اور بدلے ہوئے وقت اور حالات میں بھی وہ اسی مردانگی کو ڈھوئے جا رہا ہے—

میں نے کمال کو مشورہ دیا کہ جیسے اس نے اتنے دنوں تک صبر اور ہمت سے کام لیا، ویسے وہ کچھ اور دن انتظار کرے۔ ممکن ہے آنے والے وقت میں صورتحال بہتر ہو جائے—اس لیے کہ باشا کی موجودگی میں بہتر یہ ہے کہ خاندان کو بکھرنے سے روکا جائے۔ وہ کچھ دیر تک سر ہلاتا رہا۔ جیسے اُس کی بھی سوچ یہی ہو۔

اب یہاں میرا کام ختم ہوگیا تھا۔ مجھے دلی کے لئے روانہ ہونا تھا لیکن میرا دل بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ مجھے بہت جلد ان وادیوں میں دوبارہ آنا ہوگا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ کچھ اس سے بھی خوفناک صورتحال پیدا ہونے والی ہے—مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ ایک بار پھر وقت نے ایک نئی اور خوفناک کہانی کے لئے میرا انتخاب کیا ہے۔ اور اس کہانی کو قارئین تک پہنچانا میرا فرض ہے۔

میں جب روانہ ہوا تو میری آنکھیں ناہید اور صوفیہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن یہ اتفاق تھا کہ ناہید گھر میں موجود نہیں تھی۔ میں سفری بیگ لے کر باہر آیا تو یقین تھا کہ صوفیہ پرندوں کو تلاش کرتی ہوئی کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔ لیکن چلتے ہوئے صوفیہ سے ملاقات نہ ہونے کا بھی مجھے افسوس رہا—

میں نینی تال سے دلی آ گیا——

دلی کی مصروفیات اور شب و روز میں، کچھ دنوں تک اس کہانی کو بھول گیا—مجھے یقین تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہوگا— مگر اندر سے ایک آواز کبھی کبھی ٹھہر ٹھہر کر مجھ پر حملہ کرتی تھی کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے کمال یوسف سے فون پر رابطہ کرنا چاہئے۔ مگر میں نے جان بوجھ کر رابطہ نہیں کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ایسی کوئی آفت دوبارہ آئی تو کمال مجھے فون ضرور کریں گے—

اس درمیان چھ ماہ گزر گئے۔

ایک دن اچانک۔ مجھے فون پر کمال یوسف کا پیغام ملا۔

'فوراً آجائیے— کہانی بھیانک ہوگئی ہے۔ زندگی میں بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ آپ کا آنا ضروری ہے۔'

پیغام میں کسی بھی بات کی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ لیکن اب میرا دوبارہ نینی تال جانا ضروری ہوگیا تھا—اور مجھے یقین تھا کہ ان وادیوں میں ایک نئی کہانی میرا انتظار کر رہی ہے—

بارشِ سنگ

In the beginning was the Word, and the Word was with God, and the Word was God.

(1)

نینی تال کے لئے دوبارہ نکلتے وقت کمال یوسف کے پیغام کا آخری جملہ مجھے بار بار پریشان کر رہا تھا۔ زندگی میں بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے......' میں چاہتا تو فون پر یہ باتیں اس سے دریافت کر سکتا تھا۔ مگر وہاں پہنچنے تک میں اپنے تجسس کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ آخر زندگی میں کیا تبدیلی آئی ہو گی— ؟ لیکن اُس سے پہلے ایک جملہ اور تھا— کہانی بھیانک ہو گئی ہے— دلی آئے ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے۔ کیا صرف ان چھ مہینوں میں بہت کچھ تبدیل ہو گیا— ؟ جیسا کہ کمال یوسف نے لکھا، کہانی بھیانک ہو گئی ہے۔ میں بار بار اس جملے پر آ کر رک جاتا تھا۔ آخر اس درمیان ایسی کیا بات ہو گئی ہو گی کہ کمال یوسف یہ لکھنے پر مجبور ہوا— نینی تال کی ہوشربا وادی میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں کچھ لمحے کے لئے کمال یوسف، ناہید اور صوفیہ مشتاق احمد کی کہانیوں سے الگ قدرتی مناظر میں کھو جانا چاہتا تھا۔ مجھے ایک انگریزی نظم کی کچھ لائنیں یاد آ رہی تھیں۔

'یہاں جو کچھ ہے تمہارے لئے ہے /
تمہاری آنکھوں کے لئے /
اور جو کچھ تم سمیٹ سکتے ہو /
وہ تمہارا ہے۔'

میں نہیں جانتا، میں نے کچھ سمیٹنے کی کوشش کی یا نہیں۔ سمیٹنا چاہا تو ناہید ناز کی کہانیوں کے صفحے کھل جاتے۔

'ایک دن اس سرزمین پر
عورت نہیں ہو گی /
ایک دن سبزہ سے خالی ہو جائے گی زمین /
پھر ایک دن

اور — کسی نے کہا تھا— سب سے پہلے عورتیں رخصت ہوں گی اس سرزمین سے۔ مرد وحشی اور درندے ہو کر اپنا ہی لہو بہاتے ہوئے نظر آئیں گے— حقیقت یہ ہے کہ دلی کے ان چھ مہینوں میں، میں ناہید ناز کی زندگی کے خوفناک ترین صفحوں سے بندھ کر رہ گیا تھا— اور جیسا کہ ناز نے اپنی کہانی سناتے ہوئے غصے سے کہا تھا......عورت ہر بار ایک جسم ہوتی ہے۔ عورت ہر بار ایک آگ ہوتی ہے۔ میں عورت کے وجود سے یہ جسم کھینچ لینا چاہتی ہوں...... میں مرد کو ایک جسم بنانا چاہتی ہوں...... جیسے مرد ہر بار یہ سوچے کہ وہ مرد کم ایک جسم زیادہ ہے، جیسے آنکھیں کھولتے ہی لڑکیاں......اور لڑکیوں سے بنتی عورت ہر لحمہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ وہ لڑکی یا عورت بعد میں ہے...... پہلے ایک جسم ہے۔ اور مرد اس جسم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑا کرتا ہے۔ اسے اذیت دیتا ہے۔ اس کی جسمانی کمزوریوں پر حاوی ہوتا ہے......'

'لیکن جسم تو مرد کے پاس بھی ہوتا ہے؟'

'نہیں— ' وہ پہلے چیخی پھر زور سے ہنسی تھی......جسم کہاں ہوتا ہے، وہ تو کچا پکا لوہا ہوتا ہے......' وہ کہتے کہتے اپنے ہی الفاظ کی کشمکش میں گم تھی......لوہا نہیں......مگر مرد اسے جسم نہیں سمجھتا۔ جسم تو بس عورت کو سمجھتا ہے......گوشت خور......'

مجھے یاد ہے، اُس وقت وہ دور کہیں، کھڑکی کے اُس پار دیکھ رہی تھی...... میں اُس کے لفظوں کی یورش میں گم تھا۔ مرد کے پاس جسم کہاں ہوتا ہے...... میں نے خود کا جائزہ لیا......آنکھوں کے آگے مردانہ علاج سے لے کر کنڈوم تک کے اشتہارات گھوم گئے۔ ناز جو کچھ کہہ رہی تھی وہ ممکن ہے ناز جیسی عورتوں کے لئے نفسیات کا ایک پہلو ہو، مگر ہزار ایسی عورتیں بھی ہیں اور ان اشتہاروں میں بھی، جو مردانہ جسم کو ہوس بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اشتہار سہی، لیکن مرد کو بھی کہیں نہ کہیں عورت ایک جسم کے طور پر دیکھتی ہے۔ مگر بقول ناز، مردوں کے پاس جسم کہاں ہوتا ہے— اور اُس کی جنگ اس بات سے بھی تھی کہ مرد جب دیکھتا ہے تو لڑکی یا عورت غائب ہو جاتی ہے اور محض اُس کی جگہ ایک جسم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ پہلو بھی اُسی نفسیات سے وابستہ ہو، ناز نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور مسلسل جبر برداشت کرتی ہوئی وہ مردوں سے نفرت کرنے لگی تھی—

☆☆

اس بار نینی تال کی فضا بدلی ہوئی معلوم ہوئی۔ درختوں پر بھی خوشحالی کی جگہ ویرانی کا احساس ہوا۔ گھر میں میرا استقبال کمال یوسف نے کیا مگر اُس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگا جیسے وہ ان لمحوں میں کسی کشمکش سے گزر رہا ہو اور مجھے دیکھ کر تھوڑا پریشان بھی ہے۔

وہ آہستہ سے بولا'......سب کچھ بدل گیا ہے......'

'ہاں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے......'

پھر اُس نے بہت پیار سے آواز دی'......صوف......'

اور اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ بیڈ روم سے ناہید کی جگہ شلوار اور جمپر میں ملبوس صوفیہ بھاگی ہوئی آئی تھی۔ مجھے جلدی سے سلام کرنے کے بعد وہ وحشت زدہ انداز میں کمال کی طرف مڑی۔

'تم ٹھیک تو ہو......؟'

'ہاں کیوں؟'

'تم نے اتنی زور سے آواز دی......میں تو پریشان ہو گئی۔'

'مہمان آئے ہیں......'

صوفیہ نے جلدی سے کمال کا ہاتھ چھوڑا......'میں ابھی چائے بنا کر لائی' کہتی ہوئی اندر کمرے کی طرف غائب ہو گئی—

میں نے سفری بیگ بستر پر رکھ دیا۔ اب میں کمال کی طرف دیکھ رہا تھا—

'سب کچھ بدل گیا ہے......'

'ہاں۔'

'شاید سب کچھ بدلنے کے لئے ہی ہوتا ہے......'

'شاید......'

'چائے پی لو...... پھر تم سے دریافت کروں گا کہ یہ سب کیسے ہوا......'

یہ وہی کمرہ تھا جہاں میں پہلے بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر اب یہ کمرہ مختلف تھا۔ دیواروں کے رنگ تک تبدیل ہو گئے تھے۔ بستر پر خوشنما چادر بچھی تھی۔ مجھے صوفیہ کو دیکھ کر حیرانی تھی۔ اور خاص کر جس طرح وہ کمال کے آواز دینے پر بھاگ کر آئی تھی، یہ بات مجھے پریشان کر رہی تھی...... وہ مکمل طور پر ایک بدلی ہوئی صوفیہ تھی۔

چائے پینے کے بعد میں نے کمال کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ مڑا اور بستر کے قریب والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

'کہاں سے سناؤں؟' وہ ابھی بھی کشمکش میں تھا۔

'ناہید کہاں گئی؟'

'چلی گئی۔'

'کہاں؟'

'یہ ہمیں بھی نہیں معلوم......'

'لیکن یہ کب ہوا؟'

'جب آپ گئے تھے، اُس کے کچھ ہی دنوں بعد—

'اوہ......' میرے لئے شاکنگ نیوز تھی— لیکن ابھی میں جان بوجھ کر ناہید کے معاملے کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ ابھی سب سے پہلے مجھے صوفیہ کے بارے میں پوچھنا تھا۔ ناہید کے بارے میں مجھے حیرانی تھی۔ آخر وہ اس طرح کیسے جا سکتی ہے— جب میں نے اس کا اظہار کمال یوسف سے کیا تو اُس نے لمبی سانس لی۔ میری طرف دیکھا......

'مجھے خود حیرانی ہے۔'

'باشا کہاں ہے؟'

باشا صوفیہ کے پاس رہتا ہے۔ صوفیہ باشا میں اتنی گھل مل گئی ہے کہ اب اُسے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'

'ہونہہ—' میرے اندر کشمکش چل رہی تھی۔ میں نے غور سے کمال یوسف کے چہرے کا جائزہ لیا۔

'تم نے اسے تلاش نہیں کیا......'

'کیوں نہیں کیا۔ سب جگہ کیا۔ پولس میں رپورٹ لکھوائی۔ مگر......'

وہ آگے بولنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے روک دیا۔

'ابھی ناہید کی کہانی روک دو۔ ہم اس کہانی پر بعد میں آئیں گے۔ ابھی میری دلچسپی صوفیہ میں ہے۔ صوفیہ یہاں کیسے—؟ ویسے کچھ معاملات تو میری سمجھ میں آنے لگے ہیں۔ مگر یہ سب اچانک......'

'یہ سب اچانک ہی ہوا۔' کمال یوسف کی نگاہیں کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

'یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ جب ناہید جا چکی تھی۔ ہم اُسے تلاش کرتے ہوئے پریشان ہو چکے تھے— پولس کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا کہ اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے— مجھے افسوس ہے لیکن شاید ناہید نے خود ہی یہ خوفناک راستہ اپنے لئے منتخب کیا تھا— پولس کا خیال تھا، پہاڑیوں سے کود کر اُس نے جان دے دی۔ ایسی وارداتیں یہاں اکثر ہوا کرتی ہیں...... میرے لئے مشکل یہ تھی کہ میں باشا کی پرورش کیسے کر پاؤں گا—؟ وہ

بھی اکیلے......

باشا...... مجھے تعجب تھا۔ ناہید نے باشا کے بارے میں کیوں نہیں سوچا...... اچانک ناہید کا غائب ہوجانا۔ مجھے یہ پوری کہانی ہی پراسرار نظر آرہی تھی...... میں غور سے کمال کا چہرے پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔

'تو ناہید ایک دن اچانک چلی گئی......؟'

'اچانک نہیں۔'

'کوئی حادثہ ہوا تھا— ؟'

'ہاں ......وہ میں آپ کو بتانے والا تھا......'

'نہیں ......ابھی اُس حادثے کے لئے رک جاؤ— تو ناہید چلی گئی اور تم نے اُس کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اور پولس کا بھی یہی خیال تھا کہ کوئی پہاڑی سے کود کر جان دے دے تو یہاں لاشیں برامد کرنا آسان نہیں۔'

'ہاں۔'

اور تم نے سوچ لیا کہ اُس حادثے کے بعد، یعنی جو تم مجھے آگے بتاؤ گے، اُس کے بعد ناہید نے اچانک گھر چھوڑ دیا۔ اور اتنا بڑا فیصلہ۔'

'ہاں۔'

'میں یہی بات ماننے کو قطعی تیار نہ تھا۔ یعنی ناہید جیسی لڑکی جو زندگی کے اتنے سرد وگرم کو قریب سے دیکھنے کے بعد بھی زندہ رہی، اتنا خوفناک فیصلہ کیسے کرسکتی تھی— ؟ اگر اُس نے یہی فیصلہ کیا تھا تو اس کی زندگی میں پہلے بھی ایک ہزار مواقع آئے ہوں گے جب وہ اس قسم کا فیصلہ کرسکتی تھی— پھر اُس نے ان لمحوں میں یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا— ؟ کیا شادی سے پہلے کی بغاوت اور شادی کے بعد کی زندگی اور بغاوت میں فرق ہوتا ہے— ناہید کا چہرہ آنکھوں کے پردے پر لہراتا تو احساس ہوتا، ناہید ایسا نہیں کرسکتی۔ مگر کمال یوسف کی باتوں پر بلاوجہ شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی میرے پاس۔ اس درمیان گفتگو کرتے ہوئے ہم چھت پر آ گئے تھے۔

کمال گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔ ظاہر ہے، ناہید کے ساتھ ایک لمبا ساتھ رہا تھا۔ کچھ موقعوں پر اُس کے لہجے کی تھرتھراہٹ بھی میں نے محسوس کی تھی۔ چھت سے نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ دور تک پہاڑیاں اور جھیلیں نظر آرہی تھیں۔ یہاں شہر کسی حسین ساحرہ کی طرح نظر آرہا تھا۔ دلکش بھی۔ دلفریب بھی۔ اور یہ وہی لمحہ تھا جب تیز تیز بھاگتی اور سانسوں کو برابر کرتی صوفیہ مشتاق احمد ہماری تلاش میں چھت پر آ گئی تھی۔ کمال کو دیکھ کر اس کے وحشت بھرے چہرے پر ایک چمک پیدا ہوئی۔ آگے بڑھ کر ٹھیک اُسی انداز میں اُس نے کمال کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا—

'کیوں چلے جاتے ہو بغیر مجھ سے کچھ کہے......'

کمال ہنسا— 'ارے ہم چھت پر آئے تھے۔ اپنے ہی گھر میں ہیں۔'

'کہیں بھی ہو۔ بتا کر آنا چاہیے نا......' وہ چوری سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایسے مت جایا کرو کمال......تم جانتے ہونا، میں پریشان ہوجاتی ہوں......'

'کیوں ہوتی ہو......کمال مسکرایا......

'میں نے پہلے بیڈروم دیکھا۔ تم وہاں بھی نہیں تھے۔ برآمدے میں گئی۔ وہاں بھی نہیں۔ دیکھو...... میرا دل ابھی بھی کانپ رہا ہے......' وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی......

کمال نے مسکرانے کی کوشش کی۔ 'صوف......تم ابھی جاؤ۔ ہم لوگ کچھ سیریس باتیں کررہے ہیں۔'

'چائے لاؤں؟'

'نہیں رہنے دو......'

دیکھو۔' 'یہیں رہنا۔ بغیر مجھے بتائے کہیں مت جانا......'

آخری جملہ کہہ کر میری طرف ندامت سے دیکھتے ہوئے وہ واپس لوٹ گئی تھی— میں جاتے ہوئے اُس جگہ کو دیکھتا رہا، جہاں سے ابھی

ایک سکنڈ، کچھ لمحہ پہلے وہ اوجھل ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہے۔ مگر میں کمال یوسف سے جاننے کا خواہشمند تھا اور جاننے کے درمیان ناہید ناز کی یہ خوفناک کہانی سامنے آ گئی تھی۔

میں نے کمال کی طرف دیکھا...... ہاں تو تم بتا رہے تھے...... ناہید چلی گئی...... اور تم نے تلاش کرنے کی کوشش بھی کی— مائی گاڈ۔ اتنا بڑا حادثہ...... زندگی سے ناہید جیسی کسی عورت کا اس طرح گم ہو جانا...... کیا تمہیں لگتا ہے، یہ ایک بھول جانے والا حادثہ ہے؟ تم اس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ باشا کی ماں تھی۔ تمہاری بیوی تھی...... تم نے لو میرج کی تھی...... کیا اس کا گم ہونا صرف ایک حادثہ تھا؟ مجھے معاف کرنا کمال...... مجھے لگا کہ تم دیوانوں کی طرح اسے تلاش کرتے......

''میری کوشش اسی طرح کی تھی— اس کی آواز کمزور تھی۔ مگر جانے سے پہلے...... آپ نہیں جانتے......' اس کی آواز ایک بار پھر بجھ گئی تھی۔ اُس نے مجھے وہ مینٹل اسٹروک دیا تھا کہ...... وہ لمبی سانسیں لے رہا تھا...... ہاں یہ سچ ہے کہ اُس کے جانے کے بعد اس کو لے کر میں زیادہ اذیت سے نہیں گزرا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اُس نے محبت کے لئے میرے دل میں کہیں کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ کمال یوسف تھوڑی دیر کے لئے رکا اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے تھے...... میں آہستہ آہستہ ناہید سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس ویرانی اور خزاں میں صوف کی موجودگی مجھے خوش کرتی تھی...... اور میں بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ میری موجودگی میں صوف تھوڑا سا پریشان ہو جاتی ہے۔ اور شاید ناہید آہستہ آہستہ اس حقیقت کو سمجھنے لگی تھی......

'کبھی اُس نے اس بارے میں کچھ پوچھا؟'

'نہیں۔'

پھر ممکن ہے، یہ محض تمہارا خیال ہو......'

'ہو سکتا ہے......'

'پھر کیا ہوا؟'

'اس دن رات کے دو بجے ہوں گے۔ لاجو جا چکی تھی اور اُس کی بہن رُکمنی واپس آ گئی تھی۔ وہی باشا کو سنبھالتی ہے......'

وہ کہتا کہتا رکا۔ میں نے غور سے کمال کے چہرے کی طرف دیکھا...... مجھے لاجو کی یاد آ گئی۔ برساتی ندی کی طرح اپنے حق پر قبضہ کرنے والی۔ مجھے وہ منظر یاد آ گیا، جہاں وہ دیوانگی کے عالم میں کمال کے ہونٹوں کا بوسہ لے رہی تھی......

'لاجو کیوں گئی؟ میں نے پوچھا۔

'ناہید نے اُسے نکال دیا۔ اور اُس کی بہن کو واپس بلا لیا۔'

'کیا ناہید نے کچھ دیکھا تھا......؟'

'شاید نہیں۔'

کیا ناہید کو کچھ شک ہوا تھا......؟'

'نہیں۔'

'پھر اچانک۔'

وہ ہماری گورنیس رُکمنی کی جگہ تھی۔ رُکمنی آنے والی تھی۔ اس کا فون آ گیا تھا۔ مگر اس سے ایک دن پہلے ہی ناہید نے لاجو کو بلا کر جانے کے لئے کہا۔ ناہید نے کہا...... تم باشا کے حصے کا دودھ پی جاتی ہو...... لاجو نے حیرت سے کہا...... میں دودھ تو پیتی ہی نہیں...... ناہید نے چیخ کر کہا۔ زبان مت لڑاؤ۔ تم باشا کا حق چھین رہی ہو۔ اور میں تمہیں یہ حق چھیننے نہیں دوں گی۔'

'کیا تم کو بھی لگتا ہے کہ لاجو ایسا کرتی ہو گی؟'

'لاجو کو باشا کے حصے کا دودھ پینے کی کیا ضرورت تھی؟

'مجھے نہیں لگتا۔ میں لاجو کو جانتا تھا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ یا وہ ایسا کوئی کام نہیں کر سکتی تھی کہ ناہید اُسے ہٹانے کے بارے میں سوچ سکے۔'

میں نے غور سے کمال کی طرف دیکھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ محبت نے کہاں کہاں خاموشی سے اپنی بستیاں آباد کر رکھی ہیں۔

’کیا لاجو مل کر گئی تھی؟‘

’مجھ سے۔؟‘

’ہاں۔‘

’اتفاق سے میں اُس دن گھر میں ہی تھا۔ میں اتنا جانتا تھا کہ اُس نے ناہید سے زیادہ باتیں نہیں کی ہوں گی۔ میں نے خود کو باتھ روم میں بند کر لیا تھا۔ میں جانتا تھا، لاجو کی نگاہیں مجھے تلاش کرنے کی کوشش ضرور کر رہی ہوں گی۔ جب مجھے احساس ہوا کہ وہ جا چکی ہے۔ پھر میں اپنے کمرے میں واپس لوٹا۔

میری الجھن یہ تھی کہ ناہید نے لاجو پر جھوٹا الزام کیوں لگایا۔ وہ بھی ایک معمولی سا الزام۔ میں پھر کہانی پر لوٹ آیا تھا۔

’ہاں تم بتا رہے تھے کہ اُس رات......‘

کمال یوسف نے میری طرف دیکھا— ’وہ ایک خوفناک رات تھی......بہتر یہ ہے کہ میں آپ کو وہ پورا منظر دکھا دوں...... کیونکہ اسی رات سے میری زندگی کا نیا سفر شروع ہوتا ہے۔‘

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ کچھ دیر تک وہ اپنے خیالوں میں گم رہا۔ جیسے ماضی کی چھک چھک کرتی ہوئی ریل اس کی نگاہوں کے آگے سے گزر رہی ہو۔

(2)

سالوے پوائنٹ سے لے کر ہائی وے تک جاتی ہوئی سڑک تک سناٹا ہی سناٹا تھا۔ کمال یوسف کی مشکل یہ تھی کہ ان دنوں زیادہ تر خود کو دوسرے کاموں میں بہلانے کی کوشش کرتا— تنہا ہوتا تو ناہید کا خیال، یادوں کی کشتی کا بادبان کھولے اسے ڈرانے آجاتا۔ وہ ابھی تک پولس اور قانون کی دسترس سے پوری طرح باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ مگر اس معاملے میں بہت حد تک صوفیہ کے کہنے سے ناگارجن سینی نے اس کی مدد کی تھی۔ اُن کے کئی جاننے والے پولس میں بڑے عہدوں پر تھے۔ ایک تو پولس کمشنر ہی تھے، جو پہلے ہردوئی میں تھے۔ اور اکثر ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ عام طور پر اس طرح کے معاملات میں ایک شوہر شک کے گھیرے میں ہوتا ہے۔ پولس کو یہ بات سمجھانے میں پریشانی ہوئی کہ جب اُس پر نفسیاتی دورے پڑتے تھے تو وہ ڈاکٹر کے پاس لے کر کیوں نہیں گیا— پولس نے جب آپسی تعلقات کے بارے میں جانا تو شک کی سوئی مزید گہری ہوگئی۔ لیکن تفتیش اور کھوج بین کے دوران کسی لاش کا نہ ملنا بھی اُس کے حق میں رہا— جیسے ناگارجن سینی کا کہنا تھا کہ کوئی ضروری نہیں ہے، اُس نے کسی پہاڑی پر چڑھ کر چھلانگ ہی لگائی ہو۔ ممکن ہے وہ کہیں چلی گئی ہو اور ممکن ہے وہ واپس آجائے۔ لیکن واپس آنے کی بات پر کمال مطمئن تھا۔ جن حالات میں اور جس طریقے سے ناہید گئی تھی، وہ جانتا تھا، وہ واپس نہیں آئے گی— اب دو سوال تھے جن کا جواب اُسے آسانی سے نہیں ملا۔ ناہید کیوں گئی؟ اور ناہید نے جانے کے لئے اُس آخری حادثے کا انتخاب کیوں کیا......؟ معاف کیجئے گا، اس آخری حادثے کی رپورٹ قارئین کو بعد میں دی جائے گی۔ ایک سوال اور بھی تھا کہ کیا ناہید نے واقعی کسی پہاڑی سے چھلانگ لگایا ہوگا—؟ رشتوں کی تلخی کے باوجود اس حادثے پر غور کرنا کمال کے لئے آسان نہ تھا۔ اس دوران ان واقعات کا سب سے زیادہ اثر صوفیہ پر ہوا تھا۔ اور صوفیہ برابر اس کے گھر آنے لگی تھی۔ باشا کو دیکھنا۔ رکمنی کے ساتھ مل کر چائے اور کھانا بنا دینا......کئی بار ناہید کو یاد کرتے ہوئے اس نے صوفیہ کو آنسو بہاتے

ہوئے بھی دیکھا تھا۔مگر حقیقت یہی تھی کہ ناہید چلی گئی تھی —اور ناہید کا آنا ممکن نہیں تھا— کم وبیش وہ یہی سوچتا تھا۔ وہ صوفیہ کی بڑی بڑی گہری آنکھوں میں ڈوب جاتا تھااور حقیقت یہ ہے کہ ناہید کی موجودگی میں ہی وہ صوفیہ کی طرف اپنی بڑھتی کشش کو محسوس کرنے لگا تھا۔صوفیہکو خوف اس بات سے تھا کہ اب کیا کروگے......؟

وہ معصوم صورت بنا کر پوچھتی۔تمہیں کھانا کون دے گا؟

'رکمنی ہے نا......؟

'رکمنی کب تک دے گی......؟'

'نہیں جانتا۔'

'باشا کی دیکھ بھال کون کرے گا—؟'

'نہیں جانتا۔'

'اتنی لمبی زندگی۔کیسے گزاروگے......؟ کیوں گئی وہ......؟ واپس آئے گی نا......؟' صوفیہ جب اپنی ہی باتوں سے لہولہان ہوجاتی تو اُس کی خواہش ہوتی آگے بڑھ کر وہ اسے باہنوں کے گھیرے میں لے لے۔اپنے ہونٹ اس کے کانپتے ہونٹوں پر رکھ دے۔مگر اخلاقیات......تہذیب کے پڑھے ہوئے چھوٹے چھوٹے سبق اسے روک دیتے۔پتہ نہیں کیوں،اُسے لگتا،اگر وہ ایسا کرتا ہے تو صوفیہ کو برا نہیں لگے گا۔کیونکہ اب یہ صوفیہ بھی اس کے لئے نرم جذبات رکھتی ہے،اور اسے اس بات کا احساس تھا کہ شاید ناگارجن سینی بھی اس بات کو جانتے ہیں—اور کئی موقعوں پر وہ صوفیہ کی بات چھیڑتے ہوئے خاموش ہوگئے۔اس درمیان اُس نے صرف ایک بات محسوس کی تھی۔پرندوں کی طرف صوفیہ کی کشش بہت حد تک کم ہوگئی تھی۔گو ابھی بھی وہ باہر برآمدے میں جاکر درختوں کے پاس کسی دوست چڑیا کو تلاش کرتی مگر وہ جلد ہی واپس آجاتی۔اور بقول ناگارجن سینی،ہم تو فقط بزرگ سائبان ٹھہرے،وہ پرندوں میں پیار تلاش کرنے جاتی تھی......

'پرندوں میں......'

'پرندوں کی جگہ کوئی انسان آگیا تو......' ناگارجن نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'......میرا تجربہ کہتا ہے......وہ انسان کی ہو جائے گی اور ایسے ہوجائے گی کہ والہانہ پن اور دیوانگی دونوں ساتھ ہوگی۔'

میں اس وقت ناگارجن سینی کی اس دلیل کو سمجھ نہیں سکا تھا۔لیکن میں نے ان کے الفاظ میں اترنے کی کوشش کی تو ایسا لگا جیسے یہ جملے صرف میرے لئے ادا کئے گئے ہوں۔ناہید اور صوفیہ کا موازنہ کرتا تو یہ موازنہ آسمان اور زمین کا ہوتا۔ایک سرکش ندی کی طرح باغی اور دوسری معصوم میمنے جیسی—اور مجھے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ اب مجھے صوفیہ سے اپنے دل کی بات کہہ لینی چاہئے۔ایسا نہ ہو کہ پھر دیر ہوجائے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی دن گزر گئے تھے اور میں ناہید کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔وہ زندہ ہوتی تو واپس ضرور آتی۔حویلی میں کوئی نہ تھا جہاں وہ واپس جائے......

میں نے اس کی تلاش میں جوناگڑھ کی حویلی میں ایک قاصد بھی بھیجا جو ایک ٹکا سا جواب لایا......ایک داڑھی والا ملا۔زیادہ عمر نہیں تھی۔اس نے کہا مرگئی ہوگی۔یہ بھی کہا کہ یہاں آتی تو یہی حشر ہوتا۔ناہید کے پاس کوئی دوسرا گھر نہیں تھا اور مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ رکمنی باشا کا ویسا خیال نہیں رکھ پارہی ہے،جیسا کہ اسے رکھنا چاہئے۔وہ صرف اپنی ذمہ داریاں ادا کررہی ہے۔

اس دن پھر اسے پولس اسٹیشن بلایا گیا تھا۔اور وہاں جانے سے پہلے ایک بات ہوئی۔کمال نے بہت دنوں بعد آسمان میں اڑتے ہوئے ایک گدھ کو دیکھا تھا۔عقب میں اڑتے ہوئے کوؤں کا غول تھا اور اس وقت آسمان کوؤں کی کاؤں کاؤں سے گونج رہا تھا۔

کمال پولس اسٹیشن پہنچا تو پولس افسر کوشاری میز پر پاؤں پھیلائے ہوئے چائے پی رہا تھا۔اس کا ایک اسسٹنٹ پاس میں ہی کھڑا تھا۔کوشاری نے اپنے اسسٹنٹ کو بھدا سا اشارہ کیا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔پھر پوچھا......

'اچھا بتاؤ۔کیسے مارا اُسے؟'

'کسے؟'

’اب مورکھ نہ بناؤ ہمیں۔ بیوی کو......‘

’میں نے نہیں مارا۔‘

’مارا تو تم نے ہے۔‘ وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔ مارا کیسے...... ’پہاڑی سے دھکا دیا یا گھر میں خون کر دیا پھر لاش پہاڑی پر سے پھینک دی۔‘

’دیکھیے۔ میں نے نہیں مارا...... ’کمال کی زبان گنگ تھی......

’ارے مارنے کے تو سو طریقے ہو گئے ہیں اور پہاڑیوں میں تو ایک ہی طریقہ عام ہے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ اتنی ساری پہاڑیاں...... کہیں بھی لے جاؤ۔ دھکا دے دو......‘

’میں نے نہیں مارا...... ’کمال آہستہ سے بولا......

وہ اتفاق تھا کہ گھر سے نکلتے ہوئے کمال کی ملاقات ناگارجن سینی سے ہو گئی تھی اور ناگارجن نے اپنے کمشنر دوست کو فون کر دیا تھا۔ جس وقت کوشاری بھدے الفاظ میں ناہید اور اس کے تعلقات کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ (یہ معاملہ ایسا تھا کہ اُسے ناہید اور اپنے خراب تعلقات کے بارے میں بہت سی باتیں پولس والوں کو بتانی پڑی تھیں اور اس وقت اسے افسوس ہو رہا تھا کہ ان باتوں کو آسانی سے چھپایا جا سکتا تھا۔) کوشاری نے فون اٹھایا تو اچانک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ فون پولس کمشنر کا تھا اور فون کے بعد ہی اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔

’جاؤ جی۔ گھر جاؤ — عیش کرو —‘

کمال کو گھر آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی — اُس نے دیکھا — یہ صوفیہ تھی جو ہڑبڑائی اور گھبرائی ہوئی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اور چہرہ الجھن اور کشمکش کی کہانی بیان کر رہا تھا — اس وقت صوفیہ کی آمد اسے اچھی لگی مگر صوفیہ کو الجھن میں دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

’کیا بات ہے......؟

’وہ آ گیا ہے......‘ اُس کا لہجہ ڈرا ڈرا تھا —

’کون آ گیا ہے؟‘

وہی...... بتایا تھا نا...... وہ آنے والا ہے......‘

’کون؟‘

اس بار میرے سوال پر وہ ذرا زور سے چیخی تھی — آپ سب بھول جاتے ہیں — آپ کو بتایا تھا — وہ.................. —

اچانک مجھے یاد آیا۔ دو دن پہلے باشا کو کھلاتے ہوئے صوفیہ نے بتایا تھا کہ ناگارجن جی کا چھوٹا بیٹا آنے والا ہے — صوفیہ اسی بیٹے کے بارے میں بات کر رہی تھی —

’ناگارجن جی کا بیٹا!‘

’ہاں۔‘

’اس سے ڈرتی ہو؟‘

صوفیہ کی آنکھوں میں خوف تیر رہا تھا — وہ اچھا نہیں ہے۔ آج ہی ابو اور امی سے اس کا جھگڑا ہوا ہے — مجھے ایسی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے —

’کیسی آنکھوں سے؟‘

’مجھے بتانا پڑے گا۔؟ — نہیں سمجھ سکتے —‘

اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے اب وہ رو دے گی۔ اُس کی آنکھیں نم تھیں اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح وحشت زدہ...... میں گہری سوچ میں تھا اور اس

وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ کیا صوفیہ کو روک لوں — ؟ مگر اس گھر میں صوفیہ کیوں رُکے گی؟ کس رشتے کی بنا پر............

'میں سوچتی ہوں.....' صوفیہ کہتے کہتے ٹھہر گئی —

'کیا.....؟

'میں بھاگ جاؤں.....' وہ رو رہی تھی — اور بس یہی لمحہ تھا، کمال کو احساس ہوا جیسے اچانک بدن میں خون کا دوران تیز ہو گیا ہو۔

'نہیں صوفیہ..... بھاگنا مت.....'

ہزاروں بکھری ہوئی پرچھائیاں مل کر پیار بن گئے تھے۔ اور اس ایک لمحے میں زندگی آ گئی تھی۔ کمال نے صوفیہ کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تھا — بالکل اچانک.....اور صوفیہ........... جو اس لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس کے سینے سے لگی ہوئی آنسو بہا رہی تھی............ اُس کی سسکیاں تیز تھیں......

'بھاگ جاؤں گی..... میں بھاگ جاؤں گی۔ تب سے بھاگ ہی تو رہی ہوں..... زندگی سے بھاگتی پھر رہی ہوں..... پھر بھاگ جاؤں گی......

'نہیں — تم نہیں بھاگو گی صوفیہ —

وہ میری قید سے نکلی۔ آنسوؤں میں موٹے موٹے قطرے تیر رہے تھے — 'پھر کہاں جاؤں گی میں.....'

کمال نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس معصوم پری کو بہت پیار کرنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ ہاتھ آگے بڑھے۔ صوفیہ کے آنسوؤں کو خشک کیا۔ دونوں ہاتھوں میں صوفیہ کا چہرہ لیا.....

'کوئی پریشانی ہے تو تم یہاں رہ سکتی ہو۔ ابھی سے.....اسی لمحہ سے.....'

صوفیہشاید اسی لمحے کی منتظر تھی یا خدا معلوم اس کے اندر کیسی کشمکش چل رہی تھی — ادھر اس کی تلاش میں ناگارجن سینی آ گئے تو وہ ان کے ساتھ چلی گئی۔ جاتے ہوئے پلٹ کر صوفیہ نے اس کی طرف دیکھا — کمال اپنی جگہ پتھر کے مجسمہ کی طرح کھڑا تھا..... جیسے اچانک ہوا کے تیز جھونکے اُس کی محبوب شئے کو اُڑا کر اس سے کہیں دور لے گئے ہوں.....جسم میں وہ خوشبو ابھی بھی رچی بسی تھی..... ابھی بھی وہ سہمی آنکھیں، آنکھوں کی پتلیوں میں تیر رہی تھیں..... میں بھاگ جاؤں گی......

'اس رات دیر تک کمال یوسف کو نیند نہیں آئی — ناہید کا خوف کہیں دور چلا گیا تھا — اور صوفیہ کے نرم و نازک جسم نے اس کی جگہ لے لی تھی.....رات آدھی سے زیادہ ہو گئی تھی۔ تیز ہوا تھی۔ کھڑکی کے پٹ ڈول رہے تھے۔ دو بار باشا کے رونے سے اس کی نیند ٹوٹی — دونوں بار رکمنی بھاگتی ہوئی آئی۔ باشا کو گود میں لیا..... بہلایا۔ پھر سلا دیا.....رات کے ۳ بجے ہوں گے کہ اچانک دروازے کی بیل سن کر وہ چونک گیا...... کوئی تیز تیز دروازہ پیٹ رہا تھا۔ کمال تیزی سے اٹھا — دوڑ کر باہر آیا — دروازہ کھولا.....اور اچانک جیسے اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ صوفیہ تھی..... جو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی وہ اُس کے جسم سے بری طرح لپٹ گئی......

'صوفیہ.....'

قیامت برپا کرنے والی سسکیاں تھیں۔ صوفیہ کے ہاتھوں نے سختی سے اسے تھاما ہوا تھا۔ جیسے پکڑ ڈھیلی ہوئی تو وہ بکھر کے رہ جائے گی............ وہ پھر چلایا......

صوفیہ.....کیا ہوا ہے......

صوفیہ..... کچھ بولو تو سہی......

اُسے احساس ہوا.....صوفیہ کے ہاتھوں کی گرفت آہستہ آہستہ کمزور ہو رہی ہے......

صوفیہ.....کمال ایک بار زور سے چلایا......

اُسے احساس ہوا.....اس کے سینہ سے لگی ہوئی صوفیہ کا سر ڈھلک گیا ہے.....وہ بیہوش ہو گئی تھی......

صوفیہ......

ایک بیہوش جسم اس کے ہاتھوں میں جھول رہا تھا اور یہ لمحہ کمال کو حقیقت سے نکال کر پریوں کے دیس پہنچا گیا تھا۔ بانہوں میں ایک نازک سا جسم اوران لمحوں میں صوفیہ نے خود کو اُس کے حوالے کر دیا تھا— صوفیہ کے سرد جسم کو گود میں لیے وہ بستر تک آ گیا۔ بستر پر لٹایا۔ منہ پر پانی کا چھڑکاؤ کیا تو اچانک تیز چیخ کے ساتھ وہ اٹھی اور دوبارہ اس سے لپٹ گئی......

’وہ میرے کمرے میں تھا......‘

’کون......‘

’وہی......‘

صوفیہ سسکیاں لے رہی تھی...... میں وہاں نہیں رہ سکتی۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو اُس کی گرفت سے آزاد کیا ہے......وہ شاخوں کی طرح کمال سے لپٹی ہوئی اس کے وجود میں اپنا تحفظ دیکھ رہی تھی۔

کمال آہستہ سے بولا ’......اب تم کہیں نہیں جاؤ گی صوفیہ......تم یہیں رہو گی۔‘

صوفیہ بڑی بڑی آنکھیں نکالے خوفزدہ سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہونٹ خاموش تھے اور جسم ابھی بھی کانپ رہا تھا......

’وہ میرے...... کمرے میں تھا...... مجھے مار ڈالے گا......‘

اُس کی آنکھیں خوف میں ڈوبی تھیں— باہر اچانک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز ہوئی تو کمال چونک گیا۔ اُس نے پلٹ کر صوفیہ کو دیکھا— دوڑ کر دروازہ کی طرف بھاگا— دروازہ کھولا تو دروازے پر حیران پریشان سے ناگارجن کھڑے تھے۔

’صوفیہ آئی ہے نا......‘

’آپ آیئے میرے ساتھ —‘

صوفیہ نے ناگارجن کو دیکھا تو دوڑ کر ان سے لپٹ گئی—

ناگارجن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے—

’میں شرمندہ ہوں بیٹی اور اس کے سوا میرے پاس کوئی لفظ نہیں ہے......‘

’آپ کیوں شرمندگی کا اظہار کر رہے ہیں......‘ روتے روتے وہ زور سے چیخی۔ آپ نے جو کیا ہے......وہ کوئی نہیں کرسکتا......‘

صوفیہ تکیہ میں منہ دیے سسکیاں بھر رہی تھی۔

ناگارجن نے کمال کی طرف دیکھا......اشارہ کیا ’......تم آؤ......تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں......

کمال ناگارجن کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا— ناگارجن نے غور سے کمال کی طرف دیکھا— اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

’میں نے بیٹی کہا تھا۔ اور بیٹی مانتا تھا— میں نے سوچا تھا میرا بیٹا بھی یہی رشتہ نبھائے گا۔ مگر...... دو لوگ...... دو مقدس رشتوں کی زنجیر میں کیوں نہ جکڑے ہوں، دو الگ الگ خیال ہوتے ہیں— مجھے نہیں معلوم میرا بیٹا رات میں کس ارادے سے صوفیہ کے کمرے میں گیا......مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ارادہ ٹھیک نہیں تھا......وہ وہاں محفوظ نہیں ہے......‘

ناگارجن کی آنکھیں نم تھیں۔ لفظوں میں تھرتھراہٹ تھی...... ’صوفیہ بہت ڈر گئی ہے۔ اور اسے ڈرنا بھی چاہئے۔ شاید ایک لڑکی کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ اپنے باپ کے گھر میں بھی نہیں......‘

ناگارجن کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا......تمہیں پتہ ہے نا۔ صوفیہ نے مجھے قرآن شریف لا کر دیا تھا۔ خالی وقت میں وہ مجھے قرآن شریف پڑھ کر سنایا کرتی تھی اور اس کے معنی بھی سمجھایا کرتی تھی۔ میں سنتا رہتا تھا۔ کہتے ہیں خدا جب ایک راستہ بند کرتا ہے تو دوسرا کھول دیتا ہے— وہ لکھا ہے نا......اُس کی ذات سے اُس کی نعمتوں سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اور دیکھو بیٹا۔ کتنی دیر میں یہ بات سمجھ میں آئی......‘

ناگارجن غور سے کمال کی طرف دیکھ رہے تھے—

’صوفیہ کے لئے خدا نے ایک دروازہ بند کیا— اور دیکھو— پڑوس کا ہی ایک دوسرا دروازہ کھول دیا—‘

کمال چونک گیا......'میں نے مطلب نہیں سمجھا۔'
میں سمجھا تا ہوں—' ناگارجن نے کمال کے کندھے پر ہاتھ رکھا—
'سب خدا کی مصلحت......تمہاری بیوی چلی گئی۔ہم نے تفتیش میں کوئی کمی نہیں رکھی— لیکن حقیقت سے تم بھی واقف ہو— وہ اب نہیں آئے گی......لیکن اُس خلا کو بھرنا ضروری ہے— ایک زندگی یوں تنہا نہیں گزاری جا سکتی......اور ایسی حالت میں جب ایک ننھا شیر خوار بھی تمہارے ساتھ ہے......'
'میں اب بھی نہیں سمجھا......'
'تم سمجھ رہے ہو بیٹے۔میں جو کہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔وہ تم سمجھ رہے ہو......اور مصلحت دیکھو......خدا نے میرے گھر کا راستہ بند کیا،صوفیہ کے لئے تمہارے گھر کا راستہ کھول دیا۔اور کھولا ہی نہیں۔گھر سے بیڈ روم کا راستہ بھی دکھا دیا......اس مصلحت کو سمجھو......میں نے صوفیہ کی آنکھوں کو پڑھا ہے......اور جانتا ہوں......وہ تم سے پیار کرتی ہے......اور اس حقیقت سے بھی واقف ہوں کہ تم بھی......'
کمال نے سر کو جھکا لیا......
ناگارجن نے آگے بڑھ کر کمال کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا......اُسے بھگوان کہوں......خدا کہوں......کچھ بھی کہوں......وہ آزمائش دیتا ہے تو راستہ بھی دیتا ہے......'
'جی......'
'تم سمجھ رہے ہو نا......' ناگارجن کی آنکھوں میں چمک تھی۔باپ ہوں نا......اس صدمے سے اچانک گھبرا گیا تھا۔اور دیکھو تو سہی۔وہ خوفزدہ ہو کر پناہ تلاش کرنے آئی بھی تو کہاں آئی؟ تمہارے پاس......کیونکہ اُسے پتہ ہے......یہاں اُسے پناہ ملے گی......تم پناہ دو گے اُسے......'
'جی......'
'میرے خیال سے اب دیر کرنا مناسب نہیں ہے— صوفیہ تمہارے پاس ہی رہے گی— میں اب مطمئن ہوں— صوفیہ کو ایک مضبوط سہارا مل گیا ہے،ایک باپ کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے......'
ناگارجن کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔پھر وہ ٹھہرے نہیں،تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئے— کمال کچھ دیر تک ساکت و جامد اپنی جگہ کھڑا رہا— جیسے ایک لمحہ میں ایک پوری کائنات تبدیل ہو گئی تھی— دروازہ بند کیا— بیڈ روم کے دروازہ پر آ کر ٹھہرا— تکیہ کو سینے سے لپٹائے صوفیہ ایک معصوم سی گڑیا نظر آ رہی تھی......یہ وہ صوفیہ نہیں تھی،جو درختوں کی قطار کے درمیان دونوں ہاتھ پھیلائے پرندوں کو آواز دیا کرتی تھی......اس وقت وہ مزے سے لیٹی تھی......یا سو گئی تھی......
'صوفیہ......'
اُس نے آہستہ سے آواز دی تو وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی—
کمال آگے بڑھا۔بانہیں پھیلائیں— صوفیہ نے کوئی مدافعت نہیں کی۔اس وقت اسے ان بازوؤں کی شدت سے ضرورت تھی— ایک کانپتا ہوا گرم جسم کمال کے جسم میں پیوست ہو رہا تھا......
کمال نے آہستہ سے صوفیہ کے کان میں کہا—
'پریشان مت ہو۔اب تم میری ہو— اب یہی گھر تمہارا ہے اور تم اس گھر سے اب کہیں نہیں جاؤ گی......'
باشا رو رہا تھا۔صوفیہ اچانک پلٹی......اور روتے ہوئے باشا کو اپنی گود میں لے لیا......

☆☆

کمال خاموش ہوا تو میں کچھ دیر تک غور سے کمال کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا—
'پھر تم نے شادی کر لی۔'

'ہاں۔ یہاں پاس میں ہی ایک مسجد ہے۔ سارا انتظام ابو نے کیا تھا۔'

'ناگارجن سینی نے؟'

'ہاں—'

'نکاح ہوا— ایک چھوٹی سی تقریب۔ ملنا ملانا ہوا۔ میرے دو چار دوست ہی اس رسم میں شریک ہوئے۔ نکاح سے پہلے ہی صوفیہ نے سارے گھر کی ذمہ داری سنبھال لی تھی......'

'وہ خوش ہے؟'

'بہت زیادہ۔'

'اور تم؟'

کمال نے پلٹ کر دیکھا'......آپ کہہ سکتے ہیں۔ میں محبت کے اس انداز سے واقف نہیں تھا۔ صوفیہ تو میرے لئے پاگل رہتی ہے۔ دو پل بھی مجھے نہ دیکھے تو پتہ نہیں اسے کیا ہو جاتا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا— وہ بار بار بھاگ کر میرے پاس آجاتی ہے۔'

کمال کا چہرہ فرط جذبات سے روشن تھا'...... سچ پوچھیں تو اب تک میں اسی پیار کے لئے بھٹک رہا تھا۔ پیار ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں جانتا بھی نہیں تھا۔ پیار اس طرح جسم کے پور پور میں بسا ہوتا ہے...... میں نے کب سوچا تھا...... میں سب کچھ بھول گیا...... اب کچھ بھی یاد رکھنے کی خواہش نہیں......اور آپ نہیں جانتے جب وہ خوشبو کی طرح مجھ میں اترتی ہے...... ہوا کی طرح میرے جسم سے گزرتی ہے......سانسوں کی بہشت کے ہر دروازے پر ایک ان دیکھا پیار ہوتا ہے......

کمال اچانک ٹھہر گیا تھا۔ سامنے صوفیہ تھی۔ اس درمیان شاید اُس نے کپڑے تبدیل کیے تھے...... اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی......مگر میں اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپی وحشت دیکھ رہا تھا— آخر ایسا کیوں ہے؟ صوفیہ لہروں کی طرح اتنی بے قرار کیوں ہے...... مجھے اندیشہ تھا...... محبت کی یہ بیقراری اُسے بیمار بھی ڈال سکتی ہے...... آہستہ آہستہ وہ جنون کی جن منزلوں سے گزر رہی ہے...... وہ اس کے حق میں بہتر نہیں ہے— صوفیہ کچھ لمحے کے لئے ٹھہری— کمال کو دیکھ کر کچھ اشارہ کیا— کمال نے سر ہلایا— اور کچھ دیر بعد کمال مجھے لے کر نیچے ڈرائنگ روم میں آ گیا— جہاں نمکین بسکٹ اور چائے ہمارا انتظار کر رہی تھی— اس درمیان باشا کو لیے ہوئے وہ دو بار ہمارے پاس سے گزری— کمال کی آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ میں صوفیہ کی زندگی کے اس نئے باب میں الجھ کر رہ گیا تھا...... ڈراکیولا......خوف کی وادیاں، ہجرت...... نینی تال میں آنا...... پرندوں کے پیچھے بھاگنا اور کمال سے ملتے ہی بیقرار لہروں کا اُس کے اندر پیدا ہونا......

میں اچانک اُس وقت چونکا، جب کمال مجھ سے مخاطب تھا......

'آپ ناہید کے بارے میں جاننا چاہتے تھے......؟'

'ہاں— لیکن اس سے پہلے صوفیہ کی کہانی کو جاننا ضروری تھا—' میں مسکرایا......زندگی بھی کتنی عجیب ہے کمال...... پانچ چھ ماہ قبل ہم میں سے کون سوچ سکتا تھا کہ زندگی اپنی سمت تبدیل کر دے گی......ایک جھونکا آئے گا اور زندگی تبدیل ہو جائے گی......'

'آپ نے درست کہا......' کمال آہستہ سے بولا......زندگی نے آخر راستہ بدل دیا۔ سمت بدل گئی......' وہ رُکا...... پھر بولنا شروع کیا...... میں نے آپ کو بتایا تھا، ان دنوں ناہید میں باغیانہ انداز کچھ زیادہ ہی آ گیا تھا— مجھے کئی بار احساس ہوتا کہ اگر اُسے مصروف کر دیا جائے، تو ممکن ہے یہ باغیانہ احساس بہت حد تک اُس کے اندر سے نکل جائے۔'

'ہونہہ......'

'انہی دنوں میرے دوست نرمل اساس ڈکشنری پر کچھ بڑا کام کر رہے تھے۔ ان کا اپنا پبلشنگ ہاؤس ہے— ان کی کتابیں زیادہ تر باہر ایکسپورٹ ہوتی ہیں— وہ کئی زبانوں میں لغات کا کام کرا رہے تھے۔ انہیں اردو لغات بھی چاہئے تھی۔ جو جامع بھی ہو اور جس میں وقت کے ساتھ نئے الفاظ کو بھی جوڑا جا سکے۔ نئے الفاظ......آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا......

'جی—'

’میں نے اس کا اظہار جب ناہید سے کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔اُس نے کہا کہ یہ کام وہ کرسکتی ہے اور پوری ذمہ داری سے کرے گی۔ سمرولے اسکول سے آنے کے بعد وہ اس لغات کو وقت دے دیا کرے گی۔ میں نے جب نرمل اساس سے اس بارے میں گفتگو کی تو وہ خوش ہوگئے اور فوراًہی لغات کی پانچ سات کتابیں انہوں نے میری گاڑی میں رکھوادیں......اور کہا، مجھے اس کام کی جلدی ہے......انہی لغات کا سہارا لینا ہے......اور نئے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ شامل کرنا ہے......

’پھر......‘

کمال یوسف کے چہرے پر یادوں کے سائے گہرے ہوگئے تھے۔

(3)

’سنو‘ ناہید چلاتی ہوئی، سیڑھیاں طے کرتی ہوئی کمال کے سامنے آکر رُک گئی۔

صبح کے آٹھ بج گئے تھے۔کمال آفس کے لئے تیار ہو رہا تھا۔آئینہ میں ناہید کا عکس ابھرا تو اس نے پلٹ کر ناہید کی طرف دیکھا—

’کیا ہے......‘

’میں اتنی دیر سے آواز دے رہی تھی......‘

’سنا میں نے......‘

ناہید زور سے چیخی ’پھر کان کیوں بند کیے رہے—منہ سے جواب کیوں نہیں دیا—

’تم دیکھ رہی ہو—میں تیار ہو رہا تھا—‘

’تیار ہونے میں بھی جواب دیا جا سکتا تھا، ناہید غصے میں تھی— ’بس ہم لوگوں سے ہی امید کرتے ہو کہ ایک آواز پر حکم ماننے کو تیار ہو جائیں—‘

’یہ کوئی لڑنے کا وقت ہے۔‘

’لڑ کون رہا ہے......‘ ناہید کی آواز میں ناراضگی تھی—میں کچھ کہنے آئی تھی......؟

’ہاں بولو......‘

’میں کل دیر رات تک لغات کا کام کرتی رہی۔‘

’ہاں — میں نے دیکھا تھا۔‘

’کئی الفاظ سمجھ میں نہیں آئے اور تم نے کہا تھا، میں اپنی آزادی کا استعمال کر سکتی ہوں۔‘

’زیادہ آزادی نہیں۔ یہ لغات ہے۔ ذمہ داری کا کام ہے......‘

’میں جانتی ہوں — تم کو بتانے کی ضرورت نہیں۔‘ ناہید غصے میں تھی...... یہ لغات کون تیار کرتا ہے......؟‘

’مطلب؟‘ کمال چونک گیا تھا۔

’’میں پوچھ رہی ہوں کہ عام طور پر اس طرح کے لغات کون تیار کرتا ہے......؟‘

’یہ کیسا سوال ہے؟‘

’سوال ہے — کیوں کہ لغات کے اندر جو معنی دیے گئے ہیں، وہ مردوں کے حساب سے ہیں۔‘

پہلی بار کمال یوسف کو لگا تھا، کہ لغات کا کام کہیں اُس نے ناہید کو دے کر کوئی غلطی تو نہیں کی ہے۔ اسے امید نہیں تھی کہ ان سوالوں سے بھی دو چار ہونا پڑ سکتا ہے......

ناہید کہہ رہی تھی — میرے خیال سے اب تک لغات پر جتنے بھی کام ہوئے ہیں، مردوں نے کئے ہیں......‘

لیکن تمہیں کیا...... تم تو خود کو مرد کہتی ہو......‘

’مرد ہوں......‘ اس بار ناہید زور سے چیخی تھی — بار بار مجھے عورت کہہ کر یا میرے اندر کی عورت کو دکھا کر اپنی مردانگی کو مطمئن کرنا چاہتے ہو......؟‘

میں نے ایسا کب کہا......؟

’کہا نہیں — لیکن میں دیکھ رہی ہوں — تمہارا مطلب یہی ہوتا ہے —

’یہ تم پر ہے — تم کچھ بھی مطلب نکال سکتی ہو —‘

ناہید اس بار پھر زور سے چیخی — میں کوئی مطلب نہیں نکالتی — میں تو بس ایک عام سا سوال پوچھنے آئی تھی کہ میں تھوڑی سی آزادی لے سکتی ہوں —

’لغات کے کام میں کیسی آزادی؟‘ کمال کو بیساختہ ہنسی آ گئی —

ناہید کا پارہ چڑھ گیا...... تم ہنسے کیوں؟

’تمہاری باتوں پر اور کیا کروں......‘

ناہید آہستہ سے بولی — میں کچھ جگہ اٹک جاتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں...... اب ایک لفظ ہے آبرو — اور اس کے ساتھ محاورے دیے گئے ہیں۔ مثال کے لئے آبرو اتارنا...... آبرو تھامنا، آبرو پر حرف آنا...... آبرو ریزی...... آبرو رکھنا...... آبرو ٹکے کی ہو جانا...... آبرو کے درپے ہونا...... ناہید غور سے کمال کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی...... یہ آبرو کس سے منسوب ہے۔ سن رہے ہو تم...... میں اس لفظ کو بدلنا چاہتی ہوں......

’مطلب؟‘

’ابھی نہیں کہہ سکتی...... مگر یہ لفظ اور محاورے مجھے کچھ پسند نہیں آئے۔ خیر میں دیکھتی ہوں......‘

ناہید کمرے سے باہر نکل گئی تو کمال سوچ میں پڑ گیا — لغات کا کام دے کر اُس نے کوئی نئی آفت تو نہیں مول لے لی...... ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ تیز ہوا کی طرح ناہید دوبارہ کمرہ میں داخل ہوئی......

’وہ آتشک کا نام سنا ہے......؟‘

’ہاں...... کیوں؟‘

’بیماری ہے نا......؟

'ہاں......'

میں نے اُس کے آگے لکھ دیا— آتشک: ایک جنسی بیماری جو مردوں کو ہوتی ہے......'

اُسے اندھیرے میں چھوڑ کر ناہید پھر سے ہوا ہو گئی تھی......

☆☆

ناہید کی مشکل یہ تھی کہ جب سے اس نے یہ کام لیا تھا، اُس کی دنیا بدل گئی تھی......جیسے اب وہ الفاظ کے درمیان تیر رہی تھی......

الف ب سے ی تک حروف الگ الگ شکل بنا کر اُسے گھیر لیتے— کبھی کبھی الفاظ میں گھر کر وہ باشا کے رونے کی آواز بھی نہیں سن پاتی......

مشکل یہ تھا کہ کچھ دنوں سے یہ الفاظ حرکت میں آ گئے تھے......

وہ حروف کے درمیان تھی......

الف ڈنڈا بن کر عصائے موسوی کی طرح اس کے سر پر لہرانے لگتا......

ب......ہوا میں لہراتی ہوئی گیند ٹھہر جاتی......اور وہ چت اُس گیند پر لیٹ جاتی......

الگ الگ حرف جسم کی الگ الگ شکلیں اختیار کر لیتے......وہ خوف سے باہر نکلتی تو ان سارے حروف کو لغات سے باہر پھینکنے کی خواہش زور پکڑنے لگتی۔ جیسے اسے یہ احساس ہوتا کہ لغات ہی ہے جس نے بکھرے ہوئے بیشمار حروف کو الفاظ و معانی اور زبان کا خوفناک تحفہ دیا ہے— جیسے وہ یہ سوچتی کہ اگر اچھے لفظ ہیں تو برے لفظ کیوں ہیں—اچھائی ہے تو برائی نہیں ہونی چاہئے—عروج ہے تو زوال کا ہونا لازمی نہیں ہے— زندگی اور موت میں کسی ایک کو ہی ہونا چاہئے......آگے بڑھتے ہوئے وہ خوفناک لفظوں میں گھر جاتی......ناگن......بھوت......جنات...... آسیب......جیسے وہ اس نتیجہ پر پہنچ رہی تھی کہ ان خوفناک لفظوں کو لغات میں رکھا ہی نہ جائے۔ کبھی کبھی مترادف الفاظ کو لے کر اُس کے کانوں میں نگاڑے بجنے شروع ہو جاتے......

زندگی ہے......اس لیے موت بھی ہے......

اچھائی ہے......اس لیے برائی بھی ہے......

مرد ہے......اس لئے......

لغات میں جہاں انسانی اعضاء کے نام اور تفصیلات لکھی تھی...... وہاں پہنچتے ہوئے اچانک اس کی حالت خراب ہو جاتی...... وہ خود کو جونا گڑھ کی اُسی حویلی میں محسوس کرتی......دھوکہ......کانوں میں گونجتی ہوئی نوحہ کی آوازیں......عظیم بھائی کے ہاتھوں کی گرفت......دو ہاتھ آگے بڑھ کر اُس کے لباس کی دھجیاں بکھیر رہے ہوں...... یہ سب اس قدر اچانک ہوتا کہ اس کا چہرہ سپید پڑ جاتا......وہ لکھنا بند کر دیتی...... بالکونی میں آ کر تیز تیز لمبی لمبی سانسیں لینا شروع کر دیتی......اور اس کیفیت سے باہر نکلنے میں اسے گھنٹوں گزر جاتے......

دن ہے......اس لئے رات ہے......

پانی ہے......اس لئے آگ ہے......

سچ ہے......اس لئے جھوٹ ہے......

زمین ہے......اس لئے آسمان ہے......

کمال ہے......اس لئے ناہید......

نہیں......کاغذات کے ڈھیر کے درمیان صرف سلگتی ہوئی آگ ہوتی اور وہ ہوتی......غلامی ہے......اس لئے آزادی ہے......

اُس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی......مگر جلد ہی یہ مسکراہٹ ڈھل گئی......لغات آئینہ خانہ میں تبدیل ہو گئے تھے......الفاظ اس آئینہ خانہ کے چاروں طرف طواف کر رہے تھے......اچھے لفظ برے لفظ......صحت مند لفظ...... بیمار لفظ......اور اسی لیے اس رات ڈنر کرتے ہوئے وہ اپنے سہمے ہوئے لفظوں کے ساتھ ایک خاموش اور پراسرار دنیا میں تھی۔ کمال غور سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور جب اُس سے رہا نہیں گیا تو وہ

آہستہ سے بولا—

'تمہیں کیا ہو گیا ہے ناہید؟'

'کچھ نہیں۔'

کچھ تو ضرور ہوا ہے۔ میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں......تم کسی اور ہی دنیا میں ہوتی ہو۔'

ناہید اچانک زور سے چلائی— تو تم نے اُس دنیا کا پتہ لگانے کی کوشش کیوں نہیں کی......'

'تم ڈھنگ سے بات ہی کہاں کرتی ہو کہ میں کوشش کرتا۔'

'اس نے ناہید کے چہرے کی طرف دیکھا— چہرہ سرخ ہو رہا تھا— کشمکش اور الجھن چہرے سے عیاں تھی۔ وہ شاید لفظ جوڑ رہی تھی...... پھر اُس نے سر اٹھایا۔ کمال کی طرف دیکھا۔

'میں بتاؤں گی بھی تو تم نہیں سمجھو گے۔'

'کیا نہیں سمجھو گے......'

میں اگر کہوں تنہائی میں یہ لفظ زندہ ہو جاتے ہیں......میرے ارد گرد طواف کرنے لگتے ہیں......'

'یہ لغات تمہیں بیمار کر رہے ہیں۔ مت کرو۔ میں انہیں لے جا کر واپس کر دوں گا—'

'نہیں تم واپس نہیں کرو گے— میں دیکھنا چاہتی ہوں کیا زندگی میں آنکھیں کھولنے کے بعد انسان محض ایک پرزہ ہوتا ہے—؟ طاقتور لفظ ہوتے ہیں۔ لفظ جو کسی کو بیمار بنا سکتے ہیں۔ کسی کو مضبوط۔ کسی کو بچا سکتے ہیں۔ کسی کی جان لے سکتے ہیں۔ اُس نے ذرا توقف کے بعد آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا......حرف سے حرف ملتے ہیں تو ایک دنیا آباد ہونے لگتی ہے......لفظ بننے کے عمل کے ساتھ ہی معنی شور کرنے اور چنگھاڑنے لگتے ہیں۔ کیا کبھی تم نے ایسا محسوس کیا کمال؟ یا یہ صرف میں محسوس کر رہی ہوں......'

'میں تمہاری بات سمجھ ہی نہیں پا رہا تو جواب کیا دوں؟'

'کیوں نہیں سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔' وہ زور سے چلائی...... میں معصوم کہتی ہوں......تو ایک سراپا بنتا ہے......نور کی کرنیں پھیلتی ہیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی ہے۔ اور معصوم کی جگہ میں حرامی...... کتے کا پلا...... باسٹرڈ، قاتل، ہتیارا کہتی ہوں تو جبڑے پھیل جاتے ہیں...... آنکھوں میں چمک کی جگہ وحشت آ جاتی ہے۔ چہرے کے انداز بدل جاتے ہیں......'

'یہ ایک عام سی بات ہے......'

'ہاں جانتی ہوں۔ لیکن تب کیا کہو گے، جب قاتل کہتے ہی کمرے میں ایک قاتل موجود ہو— عضو تناسل کا نام لیتے ہی دیواروں پر ہاتھیوں کے سونڈ کی تصویریں ابھرنے لگیں......اور ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے ایک بدنما کھیل شروع ہو جائے۔ فنٹاسی نہیں۔ خیال نہیں مسٹر کمال...... یہ حقیقت ہے اور میں یہ سب مسلسل دیکھ رہی ہوں۔ عورتوں کے اعضا کا ذکر آتے ہی میں دور گیڈروں کے رونے کی آواز سنتی ہوں......اور مردانہ اعضاء کے ذکر کے ساتھ کمرے میں اتنی تیز آندھی چلتی ہے کہ مجھے خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔'

کمال سکتہ کی حالت میں تھا۔ وہ غور سے ناہید کا چہرہ پڑھنے اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

'اس طرح تو تم بیمار ہو جاؤ گی۔'

نہیں۔ میں بیمار نہیں ہوں۔ نہ بیمار ہو جاؤں گی......' ناہید زور سے بول رہی تھی— 'تم کیوں سمجھتے ہو ایسا کہ میں بیمار ہوں...... میں تمہاری اصلیت بتا رہی ہوں۔ انسان ہونے کی اصلیت صرف یہ جسم نہیں ہے۔ یہ جسم تو محض کھلونا ہے۔ الفاظ...... ہونٹوں سے نکلتے ہی فضا میں پھیلتے اور جمع ہوتے ہیں اور اپنے حساب سے انسانی جسم کو چلاتے ہیں۔ تم اپنے الفاظ کے سہارے چل رہے ہو اور میں اپنے الفاظ کے سہارے۔'

کمال آہستہ سے بولا...... بولیاں نہیں ہوتیں...... زبان نہیں ہوتی......حروف اور الفاظ نہیں ہوتے، تب بھی انسانی جسم میں ہلچل تو مچتی نا......؟ جسے تم کھلونا کہہ رہی ہو۔ اس میں زندگی ہے۔ بھرپور زندگی......اور زندگی اپنے حساب اور احتیاط سے جو پانا چاہتی ہے وہ پا لیتی ہے...... جو کرنا چاہتی ہے وہ کر لیتی ہے......'

’صرف ایک نقطہ خدا کو جدا کر دیتا ہے......‘ ناہید کی آنکھیں سہمی ہوئی کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھیں......

کمال کی آنکھیں دھند میں اتر گئی تھیں—— عرصہ پہلے پڑھی ہوئی جارج آرویل کی کتاب 1984 اس کی آنکھوں کے آگے گھوم رہی تھی۔ الفاظ پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ کتابوں کا گھروں میں رکھنا جرم ہے۔ قدم قدم پر Thaught پولس یہ دیکھنے میں لگی ہے کہ آپ کچھ سوچ تو نہیں رہے ہیں۔ انسان سوچنا بند کر دے تو زندگی آسان ہو جائے مگر کیا ایسی زندگی، زندگی کہلائے گی؟‘

کمال خود کو ایک اعصابی جنگ میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا اور اس وقت ناہید کے کسی سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

ناہید کو پتہ تھا کہ اس وقت اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوگا۔ خاص کر کمال کے لیے۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ لغات پر کام کرنے کے دوران اس کی زندگی میں کئی تبدیلیاں آئی تھیں—— جیسے وہ خود سے لڑ رہی تھی۔ جیسے کاغذ پر تنہائی لکھتے ہی وہ تنہا ہو جاتی تھی اور شور لکھتے ہی باہر سے بچوں کے شور کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔ اس درمیان دو لفظوں پر وہ ٹھہر گئی تھی......اسے نہیں معلوم کہ یہ دو لفظ بار بار اسے اپنے حصار میں کیوں لے رہے ہیں۔ ایک لفظ فرار تھا۔ اور دوسرا انتقام——اس دن اچانک وہ چونک گئی تھی۔ باشا کو رکمنی کے پاس سونپنے کے بعد جب وہ کام کرنے بیٹھی تو اچانک ایک حادثہ ہوا۔ لغات سے یہ دونوں لفظ نکلے اور اس کے ارد گرد طواف کرتے ہوئے کھڑکی سے دور چلے گئے۔ وہ گہرے سناٹے میں تھی۔ پہلے تو ناہید نے اسے محض اپنا واہمہ تصور کیا۔ پھر جب لغات کی طرف دیکھا تو اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ دونوں لفظ حقیقت میں لغات سے غائب تھے۔ پبلشر نے اس اہم کام کے لیے، اس طرح کے کئی لغات سے سہارا لینے کے لیے کہا تھا۔ مگر یہ عجیب حقیقت تھی کہ اس وقت کسی بھی لغت میں یہ دونوں لفظ موجود نہیں تھے۔

کہاں گئے؟

یہ کیسے ہو سکتا ہے——؟

وہ گہری سوچ میں ڈوبی تھی اور اس بات سے قطعی انجان تھی کہ آنے والے دنوں میں ان دونوں لفظوں سے اس کا واسطہ پڑنے والا ہے۔

(4)

باشا رکمنی کے پاس تھا۔ رکمنی باشا کو لیے گانا گنگناتی ہوئی اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمال آفس جا چکے تھے۔ وہ سب کچھ بھول کر اس وقت لغت کی تکمیل میں مصروف ہونا چاہتی تھی......کئی دنوں سے وہ اچھے اور برے الفاظ کو الگ الگ کرنے میں مصروف تھی۔ وہ محاوروں کو بھی نئے زمانے کے حساب سے ڈھال رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اسے قلبی سکون مل رہا تھا—— پھر اس نے ایسے لفظوں کی فہرست بنائی، جو عام طور

پرعورتوں سے منسوب تھے۔اوراب وقت کے ساتھ ان کے معنی تبدیل کرنے کی کوشش کررہی تھی......

جیسے آوارہ......اس نے آوارہ کے آگے لکھا...... بدچلن مرد۔مردوں کے چال چلن عام طور پرخراب ہوتے ہیں۔

فاحشہ...... بدکارمرد......

حرام کار...... بدکارمرد......

حرامی...... بدذات مرد......

مطعون...... بدنام زمانہ مرد......

طوائف......ناچنے گانے والامرد......

ہجڑا۔مردوں کی اعلیٰ قسم

رنڈی...... بازارومرد......

عیاش...... یہ بھی مردوں کی صفت ہے

کلنکنی...... بدذات مرد

حرافہ۔ بدکارمرد

لکھتے لکھتے وہ اچانک ٹھہرگئی۔کہیں دور پازیب بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی...... پھرگھنگھروؤں کی آواز ابھری......اوراس آواز میں مردانہ قہقہے شامل ہوگئے۔جوناگڑھ کی پرانی حویلی آنکھوں کے سامنے تھی......اس حویلی کی یاد سے اسے ہر بار گھبراہٹ ہوتی تھی۔مگر ماضی کے دریچے سے ہر بار یہ حویلی نکل کراس کے سامنے کھڑی ہوجاتی۔

خستہ محرابوں سے جھانکتی روشنی...... جوناگڑھ کی حویلی......محرابوں پرکوئی عبارت لکھی تھی......وقت کے ساتھ حروف مٹ گئے تھے......لیکن وہ دیکھ رہی تھی......لغات کے فراراورانتقام میں سے ایک لفظ انتقام اس وقت خستہ محرابوں سے ابھرکرصاف دکھائی دے رہا تھا۔وہ ایک بار پھر سے خوف کی وادیوں میں تھی۔گزری ہوئی کہانی کے باقی ماندہ صفحے کھل گئے تھے......اوران بوسیدہ صفحوں میں امی کی سسکیوں کے علاوہ تھا بھی کیا......کوئی بھی دن ایسا نہیں گزرا، جب اس نے امی کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھے ہوں۔اس موقع پرآنسو بہاتی ہوئی امی اسے گود میں کھینچ لیتیں......

وہ بڑی بڑی آنکھیں گھماتی ہوئی ایک ٹک امی کی طرف دیکھتی جاتی......

محرابیں روشن تھیں۔الفاظ چمک رہے تھے۔اوروہ آخری منظرناہید کی نظروں کے آگے تھا۔ان دنوں جب بجیا کی خبریں حویلی سے باہر تک پھیل رہی تھیں——ابوایک دن غصے میں امی کے پاس آئے۔دو بجے کا وقت تھا۔برآمدے میں مرغیوں کے دربے سے مرغیوں کی کڑکڑاہٹ کی آوازیں اندرتک آرہی تھیں۔ابازور سے چیخ رہے تھے......

’سب تمہاراقصور ہے......‘

باورچی خانے کی سیاہ پڑی دیواروں کے ایک طرف اماں خاموش کھڑی تھیں۔چولہے پر پڑی ہوئی ہانڈی سے بھاپ نکل رہی تھی اور ہانڈی کا ڈھکن بار بار کھل اور بند ہورہا تھا۔

’چاروں طرف نام نکل رہاہے۔عزت اورشرافت کی دھجیاں بکھررہی ہیں......‘

اماں نے پہلی بارابا کو سنتے ہوئے صرف ایک جملہ ادا کیا......’یہ تو آپ کو بھی سمجھنا چاہئے تھانا......‘

پھرتو قیامت آگئی——

’زبان لڑاتی ہے۔‘

ابا تیزی سے آگے بڑھے۔غصے میں اماں کا سر دیوار سے ٹکرادیا۔اس پر بھی بس نہیں چلاتو غصہ میں تھرتھر کانپتے ہوئے اماں کو کھینچتے ہوئے باہر دروازے تک لے آئے......

'دفع ہو......نکلو گھر سے — ابھی اس گھر سے نکلو'

وہ حیرانی سے یہ منظر دیکھنے پر مجبور تھی۔ اماں کا جسم پتھر کا ہو رہا تھا اور شاید یہ مردوں کا آخری حربہ ہوتا ہے......نکلو گھر سے۔ جس عورت نے زندگی بھر گھر کی سیڑھیوں سے آگے نکل کر بازار تک کا رخ نہ کیا ہو، وہ بھلا کہاں جائے گی۔ ابا کی نامردی بھری غیرت میں ایک مرد آ گیا تھا۔ یہ مرد ایسے موقعوں پر ہی آتا ہے، جب ایسے نامرد خود کو ناکارہ قبول کر لیتے ہیں — امی نے جسم پتھر کا بنا لیا تھا مگر آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ نہ تھا — ابا ان کو کھینچنے اور باہر نکالنے میں ہانپ گئے تھے......

باہر نکلو......

باہر نکلو......

چلو......باہر نکلو......

میں اس آواز کی زد میں تھی......باہر نکلو......باہر نکلو۔ ابا کی تیز آواز سنتے ہوئے ابو چا اور گھر کے دوسرے مرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ لوگ بڑی مشکل سے ابا کو قابو میں کرتے ہوئے کھینچ لے گئے تھے۔ اماں پتھر کے مجسمہ کی طرح بہت دیر تک باہر والے دروازے کے پاس کھڑی رہیں۔ جیسے اندر ایک کشمکش چل رہی ہو۔

لغات سے نکلا ہوا لفظ آنکھوں کے آگے روشن تھا......انتقام......اس نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ کاغذوں کو سمیٹا۔ ایک فائل میں رکھا۔ وہ مطمئن ابھی بھی نہیں تھی۔ سانس ابھی بھی تیز تیز چل رہی تھی......

دوسرے دن کمال نے آفس جاتے ہوئے ڈکشنری کا مسودہ نرمل اساس کے پاس جمع کرا دیا۔ نرمل اساس نے روکا۔ چائے پی کر جاؤ۔ مگر کمال کو دیر ہو رہی تھی۔ نرمل نے کہا، مسودہ دیکھنے میں کچھ وقت لگے گا۔

لیکن یہ اتفاق تھا کہ شام کے ۷ بجے ہی کمال کے پاس نرمل اساس کا فون آ گیا۔

'میں نے مسودہ دیکھ لیا۔ ممکن ہو تو اپنی اہلیہ کے ساتھ آ جانا'

کمال نے منظور کر لیا۔ لیکن نرمل کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا، جیسے کوئی خاص بات ہوئی ہو۔ لیکن وہ خاص بات کیا ہو سکتی ہے، وہ دیر تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

☆☆

دوسرے دن صبح گیارہ بجے وہ نرمل اساس کے کمرے میں تھا۔ ناہید بھی اس کے ساتھ تھی — یہ ایک خوبصورت کمرہ تھا۔ دیوار پر ایک حسین تجریدی پینٹنگ آویزاں تھی......نرمل اساس نے چائے کا آرڈر دیا۔ اس درمیان کمال نے محسوس کیا، نرمل بار بار ترچھی نظر سے ناہید کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناہید نے شلوار جمپر پہنا ہوا تھا۔ اور اس لباس میں وہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ چائے ختم ہوتے ہی نرمل نے ناہید کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں میں مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

آپ کو کافی محنت کرنی پڑی۔

'جی ہاں......'

'لیکن آپ نے بہت جلد اس کام کو مکمل کر دیا۔ مجھے اتنی جلدی امید نہیں تھی۔'

کمال خاموشی سے یہ گفتگو سن رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ناہید آہستہ سے بولی، اچھے کام میں وقت تو لگتا ہے۔'

'ہاں کیوں نہیں۔' کیوں نہیں۔ کو کافی کھینچ کے بولا گیا تھا۔

'اور میں دیکھ رہا تھا......' نرمل کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بہت گہری تھی۔ آپ نے کچھ زیادہ ہی آزادی لینے کی کوشش کی ہے۔

'کچھ زیادہ نہیں۔' ناہید کے چہرے پر معصومیت تھی۔ 'مگر جیسا آپ نے کہا تھا۔ وقت کے حساب سے......' وہ ٹھہری......مجھے لگا......وقت

کے حساب سے، بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔'

'ہونہہ۔' نرمل اساس کی آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی اور اس بار کمال یوسف کی طرف دیکھا۔

'پرفیکٹ میچ......' وہ کہتے کہتے ٹھہرا......

کمال یوسف کو احساس ہوا کہ اس پرفیکٹ میچ میں دراصل اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی ہو۔

نرمل اساس کچھ سوچتا ہوا بولا— 'میں پبلشر ہوں۔ کتابوں کا بزنس کرتا ہوں۔ ڈکشنری کے کام اس سے پہلے بھی کئی کرا چکا ہوں۔ مگر اس بار— اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ پہلی بار مجھے لگا، میں اس نظام کا حصہ نہیں ہوں۔ یا میں اس نظام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ دنیا اس حد تک تبدیل ہو چکی ہے مگر اس بارے میں مجھے کچھ نہیں پتہ۔ میں بالکل انجان کسی ننھے منے سے بچے کی طرح ہوں، جس کے سامنے سے نکل کر یہ دنیا پوری طرح بدل گئی اور مجھے احساس تک نہ ہو سکا......'

ناہید مسکرا رہی تھی۔

کمال نے چونک کر پوچھا۔ 'میں نے کچھ سمجھا نہیں۔'

اساس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے ناہید کی طرف اشارہ کیا— 'انہوں نے بتایا کہ یہ دنیا بدل چکی ہے۔ بہت سے لفظ اپنی پہچان کھو چکے ہیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ آ چکے ہیں۔ بہت سے لفظوں نے ندی کی لہروں کی طرح معنی کا رخ ہی بدل دیا ہے...... کاش ایسا ہوتا...... کاش......' نرمل اساس نے دوبار کاش کو دہرایا۔

'مگر کیا سچ مچ ایسا ہے میڈم...... نہیں مجھے معاف کیجئے گا۔ کیا یہ دنیا اس حد تک بدل چکی ہے۔؟'

'یہ اپنے اپنے نظریہ سے سوچنے اور دیکھنے کی بات ہے......'

'ہاں۔ یہ بھی ٹھیک......' نرمل اساس مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا— 'اور آپ نے صحیح کہا۔ ڈسکو چلے جائیے۔ نئی نسل کو دیکھئے۔ مرد عورت اور عورت مرد...... یعنی سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کیا ہے— میرے بیٹے کانوں میں چھلے پہنتے ہیں۔ بیٹی لڑکوں کی طرح رہتی ہے۔ شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ لیکن اس بدلی ہوئی صورتحال میں......

وہ شیشے کی کیبن کے باہر دیکھ رہا تھا— 'تبدیلی۔ بہرحال ہم ایک بڑی اور خوفناک تبدیلی کی زد میں ہیں۔ وہ ہنسا— 'میں کہتا ہوں جو لغات آپ نے تیار کیا ہے اسے ویسا مارکیٹ میں ڈال دوں تو زلزلہ آ جائے گا۔ مجھے لگتا ہے یہ ایک بڑی خبر بھی بن سکتی ہے۔ ہاٹ نیوز۔ اخباروں سے لے کر ٹی وی چینلس تک۔ اور کیا پتہ باہری میڈیا بھی اسے کور کریں...... باہر کے ملکوں میں الفاظ و معانی کی یہ تبدیلی نئے بحث کھڑا کر دے گی۔ کیا سچ مچ ایک پوری تہذیب بدل رہی ہے—؟ بدل رہی ہوگی' اساس نے آہستہ سے کہا— 'عورتیں زیادہ آزادانہ طور پر کنڈوم خریدتی ہیں۔ مرد رات میں بیڈروم میں نائیٹی پہن لیتے ہیں۔ سیکس کے تجربے بڑھ رہے ہیں۔ عورتیں فائٹ کر رہی ہیں۔ آپ صحیح ہیں۔ تبدیلی آئی ہے اور اسی دنیا میں آئی ہے تو پھر لغات، ڈکشنری، شبد کوش...... یہ لفظ کیوں نہ بدلے جاتے۔ بدلے جائیں گے......'

نرمل اساس دوبارہ شیشے کی کیبن کے باہر دیکھ رہا تھا۔ مگر......' اس نے فائل کے صفحے پلٹے۔ ایک صفحہ ناہید کے آگے کر دیا۔ یہ آپ نے لکھا ہے نا...... اسے پڑھیے......

'میں نے پڑھ لیا ہے۔'

'کیا......'

'جو آپ دکھا رہے ہیں۔'

میں کیا دکھا رہا ہوں......

ناہید مسکرائی— عورتوں کے حصے کے تمام نام میں نے مردوں کے خانے میں ڈال دیا ہے۔ مثلاً داسی، طوائف، کلنکنی، کلنچھی، بے حیا، فاحشہ...... رنڈی......'

'رنڈی......' نرمل اساس نے لمبی سانس کھینچی...... کمزور آواز میں پوچھا گیا...... 'معاف کیجئے گا...... اپنی تسلی کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ رنڈی کو

مرد کے حوالے سے رنڈا بھی تو لکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے لیے بھڑوا۔'

'نہیں۔' ناہید ناز مطمئن تھی — 'اب ان میں سے کوئی بھی لفظ بدلا نہیں جائے گا۔ آنے والے وقت میں مردوں کو انہی ناموں کے ساتھ جینا ہوگا۔'

'بالکل ٹھیک......'

نرمل اساس کا لہجہ اس بار خوفزدہ تھا۔ وہ کرسی پر اس طرح ہل رہے تھے جیسے اچانک ذہنی رو بگڑ گئی ہو...... آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں اور انہوں نے کئی بار اس جملے کو دہرایا...... بالکل ٹھیک۔ اچانک انہوں نے کرسی سیدھی کی۔ اور کمال کی طرف مڑے۔

'کمال ہے...... واہ کمال ہے......'

'جی......'

'آپ ابھی تک نہیں سمجھے —' نرمل اساس ہنسنے کی کوشش کر رہے تھے اور ہنسنے کی کوشش میں ان کا چہرہ اس وقت کسی مسخرے کے چہرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا رہے تھے مگر اندر ہی اندر جیسے کوئی تیز آندھی اٹھ رہی ہو...... وہ پھر کمال کی طرف مڑے...... 'آپ اور میں جتنا اس دنیا کو جانتے ہیں، وہ ناکافی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں۔ اس دنیا کو آپ کی بیوی میرا مطلب ہے...... میڈم زیادہ جانتی ہیں۔ دنیا اتنی تیزی سے بدلی ہے کہ بہت تیز دوڑنے والا بھی اس رفتار کو پکڑ نہیں سکتا۔ کیوں میڈم۔ اب لیوان ریلیشن شپ کو ہی لیجئے۔ باضابطہ قانون آ چکا ہے۔ ایک مرد دو عورتوں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ ایک دروازہ دوسری عورت کے کمرے میں کھلتا ہے۔' وہ ہنس رہے تھے — 'محبت کو ہی لیجئے۔ محبت کے لیے جنس مخالف کی کوئی شرط نہیں ہے۔ بلکہ لڑکے لڑکوں سے لڑکیاں لڑکیوں سے پیار بھی کر رہی ہیں اور شادی بھی۔ پھر ڈکشنری کے الفاظ تو بدلے جائیں گے۔ کیونکہ کل تک کہاں یہ سب بیماریاں...... معاف کیجئے گا میڈم...... مجھے اس وقت اور کوئی اصطلاح نہیں سوجھ رہی ہے۔ میرا مطلب ہے...... یہ دنیا کچھ برس پہلے تک اتنی تیزی سے کہاں پھیلی تھی۔ ہم زندگی کے نئے ہائی وے پر ہیں اور نیا شہر بسانے کی تیاری کر رہے ہیں...... چیلنج بڑھیں گے تو مسائل بڑھیں گے۔ بلکہ بدلیں گے اور بدلیں گے تو معنی کی ایک نئی دنیا ہوگی۔'

نرمل اساس کا چہرہ کئی طرح کے جذبات سے دوچار تھا — 'ایک طرف ہم مارس پر جا رہے ہیں۔ چاند پر پانی اور زندگی کی تلاش ہو رہی ہے، بلکہ زمین کی بکنگ بھی شروع ہو چکی ہے۔ اور دوسری طرف وہی زندگی، وہی تہذیب، وہی دقیانوسی باتیں، وہی لفظ اور وہی معنی...... نہیں چلے گا...... کیوں میڈم......؟'

'بالکل صحیح......' ناہید کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ مگر اس وقت یہ آنکھیں ایسی تھیں جیسے نرمل اساس کی ذہنی روش کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

کمال خاموشی سے دونوں کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لیے سمجھنا آسان نہیں تھا کہ اس وقت نرمل اساس اور ناہید میں کون صحیح اور کون غلط ہے — اور یہ بھی کہ کون کس کا مذاق بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا نرمل اساس واقعی ناہید کے کام سے خوش ہوئے ہیں؟ ایسا اسے نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت جو نرمل اساس کرسی پر مسلسل ہل رہے تھے، وہ چہرہ اور کردار اس کے لیے نیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پچھلے پانچ برسوں میں اس نے نرمل اساس کا یہ چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ایک بات واضح تھی۔ وہ یہ کہ ناہید کے کام سے نرمل اساس بری طرح ہل کر رہ گئے ہیں۔ مگر ایسا کیوں ہوا، اس کی نفسیاتی وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے اپنی بیٹی اور بیٹے کا تذکرہ کیا۔ لیکن اصلیت کیا ہے، یہ ابھی سمجھ پانا مشکل تھا۔ اس درمیان نرمل اساس نے ایک زور کا ٹھہا کا لگایا۔ باری باری سے دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ پھر خصوصی طور پر ناہید کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔

'میڈم معاف کیجئے گا۔ اپنی معلومات بھر باتیں آپ سے شیئر کر رہا ہوں۔ کیونکہ اس کا ذکر بھی آپ کے لغات سے ہے۔ معلومات بھر، آپ سمجھ رہی ہیں نا۔ اور اگر میں یا میرے الفاظ غلط ہوں تو میں پہلے ہی اس کے لیے معافی مانگ لیتا ہوں۔'

'نہیں آپ کہیے۔' ناہید نے جلدی سے کہا۔

'شکریہ۔ میں تبدیلی کی بات کر رہا تھا۔ جیسا کہ آپ نے لغات میں تبدیلی کے دوران محسوس کیا ہوگا۔ اگر تبدیلی آئی ہے تو دو چند لوگ ہی کیوں محسوس کریں؟ میں پچھلے دنوں جان گرے کی ایک کتاب 'مین آر فرام مارس اینڈ ویمن آر فرام وینس' پڑھ رہا تھا۔ سیکسوئیلیٹی کو ہی لیجئے۔ عورت

زیادہ سخت ہوگئی ہے۔ بیڈروم کا مرد ہار رہا ہے۔ باب ڈلن کا ایک گیت یاد آ رہا ہے...... کیا تم کھانا پکا سکتے ہو، بیج بو سکتے ہو؟ پھول کھلا سکتے ہو...... کیا تم میرے درد کو محسوس کر سکتے ہو—؟ اور نیا مرد کہتا ہے—ہاں...... یہ نیا مرد آج شیف ہے۔ سب سے اچھا کھانا بناتا ہے۔ مساج پارلر میں آج اس کی ڈیمانڈ عورتوں سے زیادہ ہے۔ وہ جم جا کر باڈی بھی بنا رہا ہے اور جسم میں لچک بھی پیدا کر رہا ہے۔ وہ کانوں میں چھلے پہنتا ہے—وہ مونچھ اور داڑھی کٹا رہا ہے۔ اسے چکنا نظر آنا زیادہ پسند ہے۔ وہ نیا ماچومین ہے...... وہ کچن بھی سنبھال رہا ہے اور گھر بھی—نرمل اساس کا لہجہ بدلا ہوا تھا...... یہ نیا مرد وجود میں آ چکا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ ایک لچر سماج میں، ایک ختم ہوتی تہذیب میں، ایک کمزور ہوتی جمہوریت میں اور اس آئی ٹی انڈسٹری میں ہم نے نئی عورت اور نئے مرد کو تلاش کر لیا ہے۔ یہ ہماری ٹنڈ منڈ اور مغرب سے برآمد تہذیب، ملی جلی اکانومی اور پزا برگر کے ذائقہ سے برآمد ہوا ہے اور حقیقت ہے کہ اس وقت سب بدل چکا ہے...... آئینہ کے سامنے لپسٹک لگاتا ہوا مرد اور فائیلوں میں گھری عورت—نرمل اساس آہستہ سے بولے—خوفناک......

کیا...... ناہید چونک کر بولی......

'اور اب میری سمجھ میں آیا کہ ان سب کے پیچھے کون ہے—؟ مائی گاڈ...... سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے تھا اور ہم کتنے بے خبر تھے۔

'ان سب کے پیچھے کون ہے؟' ناہید کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔

'عورت۔'

نرمل اساس کا لہجہ اس وقت برف کی طرح سرد تھا—'عورت، جس نے آئی ٹی انڈسٹری سے سائبر اسپیس تک قبضہ کر لیا۔ اور انتہائی ہوشیاری سے مردوں کو ایک نیا مرد بنا دیا۔ یعنی عورت......'

ناہید ہنس رہی تھی لیکن اس وقت اس کی یہ ہنسی مجھے ناقابل برداشت لگ رہی تھی۔ یہ ہنسی ایسی تھی کہ مجھے طلسم ہوشربا کی کہانیوں میں اس مکار حسین عورت کی یاد آ گئی، جو دراصل عورت نہیں تھی بلکہ ایک راکشش تھی۔ اور راز کے کھلتے ہی وہ زور زور سے قہقہہ لگا کر اپنے اصل روپ میں واپس آ گئی تھی۔

'مائی گاڈ...... عورت—یہ سارے جال عورت نے بنے—اور کمال ہوشیاری سے کہ مردوں کو پتہ بھی نہیں چلا......' نرمل اساس اس بار زور سے چیخے تھے۔

'اب آپ کیا چاہتی ہیں......؟'

'میں کچھ نہیں چاہتی۔'

'پھر یہ کیا ہے......' نرمل نے اس بار فائل کو زور سے دیوار پر دے مارا اور فائل میں جمع کاغذات ہوا میں اڑتے ہوئے بکھرتے چلے گئے۔

'آپ پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں'، اس بار کمال نے غصہ سے کہا تھا۔

'مسٹر کمال...... بہتر ہوگا کہ ابھی آپ انہیں لے کر چلے جائیں اور معاف کیجئے گا۔ میرا دماغ اس وقت بالکل قابو میں نہیں ہے۔'

کمال نے ناہید کی طرف دیکھا۔ ناہید کا چہرہ سپاٹ تھا۔

اور اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

کمال نے ناہید کا ہاتھ تھاما اور نرمل اساس کے کمرے سے باہر آ گیا—

اور اس وقت اس کے دماغ میں تیز تیز آندھیاں اٹھ رہی تھیں۔

☆☆

بطور مصنف، میرے لیے ان واقعات سے سرسری گزرنا آسان نہیں تھا— کیونکہ نئی صدی کی شروعات سے ہی ان تبدیلیوں کا بہت کچھ، اشارہ ملنے لگا تھا—اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نئی، تیز رفتار بدلتی ہوئی دنیا اگر نئی عورت کو ڈسکور کر رہی تھی تو یہاں نیا مرد بھی پیدا ہو رہا تھا—اور یہ حقیقت ہے کہ یہ نیا مرد اور یہ نئی عورت سائبر سے آئی ٹی انڈسٹری اور تمام گلیمر ورلڈ تک پھیل گئی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس انڈسٹری کی اپنی سوشل نیٹ ورکنگ تھی— فیس بک سے ٹوئٹر تک پرانے الفاظ غائب ہوتے چلے گئے تھے اور ان کی جگہ نئے الفاظ لے رہے تھے۔ ٹوئٹ کرنے

والوں اورفیس بک کا استعمال کرنے والوں کے لیے لفظ ومعنی کی اپنی دنیا آباد تھی اوران میں بے شمار الفاظ ایسے تھے، جولغات یا ڈکشنری میں نہیں تھے— اور یہ نسل اس نئی سوشل نیٹ ورکنگ کے سہارے رشتے، معیار اور زندگی کا اپنا راستہ تلاش کر رہی تھی یا ان کی نئی تعریفیں ڈھونڈ ھنے میں لگی تھی— کرن جوہر، راہل ملہوترہ جیسے ہزاروں نام جس نے ماچومین کی تعریف بدل کر رکھ دی ہے۔ آپ کمال یوسف کو بھی اس صف میں رکھ سکتے ہیں— باشا کے کپڑے بدلتا ہوا، ضرورت پڑتی تو کچن میں چائے بناتا ہوا— مجھے بار بار نرمل اساس کے جملے یاد آرہے تھے۔ کیا مرد کو اس نئی تہذیب میں لانے والی عورت ہے— ؟ مرد سیلون جاتے ہیں— فیشل اور پیڈیکیور کراتے ہیں— وہ اچھا نظر آنا چاہتے ہیں اور جیسا کہ ایک سائیکوتھرپسٹنے کہا تھا— 'ہندوستانی مردوں میں عورتوں کی صفات دیگر ملکوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں— ' لیکن ہوتی ہر جگہ ہے— ہر ملک میں — اوراس لیے مرد کے تصور میں ایک نئی عورت سامنے آگئی تھی—

میں فکری سطح پر الجھ کر رہ گیا تھا— ایک طرف ناہید تھی تو دوسری طرف صوفیہ مشتاق احمد— اور کمال بھی تھا جس نے ناہید کے کہنے پر عورتوں کے لباس بھی پہنے اور مردانگی کی حد تک یا عورتوں کی صفات کی حد تک خود کو ناہید کے کہنے پر ڈھال لیا تھا، یا اس نے ڈھالنے کی کوشش کی تھی— در اصل یہاں ہر شخص ایک نئے سوشل اسپیس کے لئے جگہ بنا رہا ہے—

مجھے واشنگٹن ارونگ کی وہ کہانی یاد آرہی تھی، جہاں ایک کردار بیس سال تک سوتا رہا اور اچانک جب وہ جاگا تو ایک پوری دنیا تبدیل ہو چکی تھی— ایک ایسی دنیا جہاں آڈیو، ویڈیو اور ڈکشنری یا الفاظ کی سطح پر بھی مسلسل انسانی زندگی کا گراف تبدیل ہو رہا ہے— گوگل، فیس بک سے ٹوئٹر تک— سوشل نیٹ ورکنگ نیا اسپیس، اور نئے لفظ ڈسکور کرنے کی کوشش کر رہا ہے— شاید اسی لیے ٹیکنالوجی سے نظریہ، محاورے سے بازار تک ہم رشتوں اور نیٹ ورکنگ کی نئی دنیا میں ہیں— اور جس کے بارے میں مارک زبرگر کہتا ہے کہ آپ چھپ نہیں سکتے— آپ دنیا کے کسی کونے میں ہوں— آپ کو پہچان لیا گیا ہے—

میں اپنا ہوم ورک کر چکا تھا اور اس ہوم ورک میں، میں ناہید کو لے کر اب تک الجھن کا شکار تھا اور دل کسی طور پر یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہ یہ قدم اٹھا سکتی ہے ہوسکتا ہے سوشل نیٹ ورکنگ کی اس نئی اصطلاح مائی اسپیس میں اس نے اپنے لیے ایک ایسا خلا پڑھ لیا ہو، جس کے بعد اس نے زندگی کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی ہو— میرے سامنے مہذب دنیا میں اس وقت ایسی کئی مثالیں تھیں اور ایسے زیادہ تر لوگ نوجوان تھے، جنہو ں نے آسانی سے اپنی زندگی محض اس لیے ختم کر لی تھی کہ وہ جینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کر رہے تھے— ایک نسل خوف اور صدمے میں انجانی موت کی طرف بڑھتی ہوئی— مجھے اس ازبیک شاعر کی یاد آرہی تھی جس نے کہا تھا— ہم مرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں......

اوراس پوری کہانی کا موہوم سا سچ یہ تھا کہ ناہید نے اپنے لیے ایک ایسی ہی موت کا انتخاب کیا تھا— وہ موت جو علم الحساب، ضرب، تقسیم، لغات کے بوسیدہ الفاظ اور ''مائی اسپیس' کے خلاء کو نہ بھر سکنے کی صورت میں سامنے آئی تھی— یا جسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُس کے اندر کے دھاکے اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ خاموشی کے جسم میں تحلیل ہوگئی— کبھی کبھی اندازے اور قیاس غلط بھی ثابت ہوتے ہیں— اس لئے ان تفصیلات کو کمال یوسف سے جاننا ضروری تھا۔ جیسے کمال نے بتایا کہ ہم نرمل اساس کے کمرے سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو میری اوراس کی کیفیت میں زمین آسمان کا فرق تھا—

''مثال کے لئے، اگر میں جاننا چاہوں تو؟'

'ظاہر ہے۔ مجھے نرمل پر غصہ تھا— میں اسے پانچ برسوں سے جانتا تھا اور میں نے اس کا یہ رویہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔'

'اس وقت ناہید کی کیفیت کیا تھی؟'

'ہم باہر آئے تو وہ بے مطلب کچھ گنگنا رہی تھی— جیسے اندر جو کچھ ہوا' اُس کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا—'

کیا اُس نے واقعی کوئی اثر نہیں لیا تھا؟

''نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُس کے بعد جو کچھ گھر میں ہوا......'

میں نے کمال کو روک کر کہا— 'مگر جیسا کہ آپ بتا رہے ہیں— نرمل اساس کے کمرے سے باہر نکلنے تک وہ نارمل تھی؟'

’جی ہاں—‘

یہ میرے لئے حیرت کی بات تھی، کیوں کہ ایسے موقع پر جب سامنے والا شخص ناہید جیسی باغی عورت کو کمرے سے باہر جانے کے لئے کہہ رہا ہو، ناہید کا نارمل حالت میں ہونا مجھے پریشان کررہا تھا— کیا یہ ناہید کے لئے فتح کا احساس تھا؟ اگر ہاں تو کیوں—؟

کمال نے میری طرف دیکھا—

’میں آپ کو پورا واقعہ بتا تا ہوں بلکہ دکھانے کی کوشش کرتا ہوں—‘

(5)

کمال کو اپنی غلطی کا اعتراف تھا۔ اس نے اگر یہ پروجیکٹ ناہید کو نہ دیا ہوتا تو شاید نرمل اساس نے اس طرح بیعزت کر کے اُن دونوں کو کمرے سے باہر نہیں نکالا ہوتا— وہ باہر آیا تو ناہید کوئی گیت گنگنانے میں لگی تھی— اس کا چہرہ سپاٹ تھا— اور اُس کی آنکھوں کو دیکھنے کے بعد کہیں سے بھی یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ نرمل اساس کی باتوں سے اسے چوٹ لگی ہو—

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کمال نے زور سے کہا—

’آج تمہاری وجہ سے ہماری بےعزتی ہوئی ہے—‘

’میری وجہ سے کیوں؟‘

’تم نے دیکھا اُس کا لہجہ کیسا تھا؟‘

’وہ تمہارا دوست ہے۔‘

’لیکن اس نے ایک پروجیکٹ دیا تھا— اور اس پروجیکٹ کے لئے وحشی بننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی—‘

’میں وحشی ہوں—‘ ناہید زور سے چلائی—

’چیخو مت—‘

’مجھے وحشی کہنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟‘

ناہید مسلسل چیخ رہی تھی— کمال نے گاڑی کے شیشے چڑھا لیے— اسے یقین تھا، اس وقت ناہید کو کوئی بھی جواب دینا مناسب نہیں— وہ باہر کے مناظر میں جذب ہو کر ناہید کے غصے کو بھولنا چاہتا تھا— گاڑی آہستہ آہستہ پہاڑی راستوں پر آگے بڑھ رہی تھی— سرسبز و شاداب، گھنے درخت اور جنگلات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ......خوبصورتی ایسی کہ کوئی متبادل نہیں— کمال نے تصور کیا کہ یہ سبزہ اور درخت وادیوں سے گم ہو جائیں تو کیا یہ دنیا زندہ رہے گی......

’تمہارے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہے— تم نے مجھے وحشی کیوں کہا؟‘

اس بار ناہید غصے سے چلائی اور اچانک کچھ لمحے کے لئے اس کا توازن کھو گیا— گاڑی تیزی سے چرمرائی اور ایک جھٹکے سے رک گئی— سامنے ہزاروں فٹ نیچے کی گہرائی تھی— اور اگر اُس نے جھٹکے سے بریک نہ لیا ہوتا تو شاید اس کی گاڑی ان گہرائیوں کی نذر ہو چکی ہوتی—

’یہ کیا کیا تم نے— گاڑی روک کیوں دی—؟‘

’خدا کا نام لینا چاہتا تھا—‘

’کیوں؟‘ ناہید غصے سے چیخی—

’مرنے سے پہلے خدا کو یاد کیا جاتا ہے—‘

’تو تم مجھے مارنے چلے تھے—‘

’گاڑی میں اکیلے تم نہیں ہو— میں بھی ہوں— اور میں تمہارے اس روز روز کے پاگل پن سے تھک چکا ہوں—‘

’اور اسی لیے مجھے مارنے کا ارادہ کرلیا—؟‘ ناہید غصے سے چیخ رہی تھی— گاڑی روکو— تمہارا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے—‘

کمال کو ہنسی آگئی— لیکن ناہید کا غصہ ساتویں آسمان پر تھا—

’تو تم اسی لیے آئے تھے— میری رسوائی کا تماشہ دیکھنے اور اس کے بعد مجھے ان گہرائیوں میں پھینکنے کے لئے—‘ ناہید کی آنکھیں سلگ رہی تھیں—

’پاگل ہوگئی ہو تم—‘

’تو تم مجھ سے اب گھبرا چکے ہو۔ اور اب مجھے مارنا چاہتے ہو— دراصل میں تمہاری ان نفسیات کو سمجھ رہی تھی— میں لگاتار تمہیں سمجھنے کی کوشش کررہی تھی— اور میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ تم ایسا کر سکتے ہو......‘

کمال نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا— اُس نے کوشش کی کہ لہجہ میں توازن کو برقرار رکھا جاسکے مگر ناہید نے صبر کے پیمانے کو چھلکا دیا— وہ دیر تک چیختا رہا— جب احساس ہوا کہ سانسیں گھٹن کا شکار ہیں تو وہ آہستہ سے بولا......

’تم اپنے ہوش کھو بیٹھی ہو— تم بھول گئی ہو کہ یہ کام میں کہیں بھی کرسکتا تھا— مگر سوال ہے، میں تمہیں کیوں ماروں گا—؟

’کیونکہ تم مجھ سے گھبرا چکے ہو؟‘

’کیوں— چلو مان لیں میں گھبرا چکا ہوں تو تم اس رشتہ کو اس مقام تک کیوں لے آئی—؟‘

’میں نہیں لائی—‘ ناہید کی آواز میں غصہ برقرار تھا— ’تم بدل گئے ہو— اور تم میں ایک مرد آگیا ہے—‘

’میں مرد ہوں— میں مرد تھا......‘ کمال نے مسکرانے کی کوشش کی— ’اور مرد رہوں گا۔ اور میں مرد نہ ہوتا تو تمہارے لئے مجھ میں کشش بھی نہ ہوتی اور نہ تم مجھ سے شادی کرتیں—‘

’واہیات‘— ناہید ناخن چبانے کی کوشش کررہی تھی......اور اس وقفہ میں شاید وہ کچھ سوچ بھی رہی تھی۔ ناہید نے پلٹ کر کمال کو دیکھا......

’اور تم نے دیکھا— میں نے لغات کو ہی تبدیل کردیا— مرد میں ہوں......‘

مسکرانے کی کوشش میں اُس کے جبڑے پھیل گئے— اور پہلی بار کمال کو، ناہید کو دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہوا— ناہید میں، وہ مکمل طور پر ایک مرد کو داخل ہوتے ہوئے محسوس کررہا تھا—

’کیا ہم یہیں لڑتے رہیں گے یا گھر بھی چلیں گے؟‘

کمال نے گاڑی بیک کی۔ اور پھر گاڑی کو گھر کی طرف موڑ لیا۔ دو ایک بار پلٹ کر اُس نے ناہید کی طرف دیکھا۔ ناہید کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ جیسے ابھی بھی ایک جنگ اُس کے اندر چل رہی ہو—

گھر آنے کے بعد کمال کی خواہش تھی کہ وہ اُس سے جتنا دور رہے وہی اس کے لئے بہتر ہے۔ کیونکہ کمال کو اس بات کا احساس تھا کہ اس وقت اس کی حالت اُس زخمی شیرنی جیسی ہورہی ہے— جو کسی بھی بات پر کاٹنے کو دوڑ سکتی ہے—

کمال نے شاور لیا۔ اس وقت وہ سب کچھ بھول کر خود کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ مگر شاید ناہید ایسا نہیں چاہتی تھی— باہر سے تیز تیز بولنے کی آواز آرہی تھی—

کپڑے پہن کر وہ باہر آیا تو ناہید اُسے دیکھتے ہی زور سے چلائی—

’اب میری سمجھ میں آ رہا ہے، تم مجھے اپنے دوست کے پاس کیوں لے گئے تھے؟‘

’میں نہیں لے گیا تھا — اس نے تمہارا یہ ذلیل کام دیکھنے کے بعد مجھے فون کیا تھا — اور فون پر درخواست کی تھی کہ تمہیں لے کر آؤں۔‘

’’مجھے بے عزت کرنے کے لئے؟ اور تم تماشہ دیکھ رہے تھے —‘ ناہید زور سے چلائی — ’تم اس لیے خوش رہے کہ تمہیں مزہ آ رہا تھا۔ وہ کمبخت میری محنت کی دھجیاں اڑا رہا تھا اور تم دیکھ رہے تھے۔ جس وقت اُس نے فائل ہوا میں اڑائی۔ میں اسے تھپڑ بھی مار سکتی تھی۔ مگر میں صرف تمہارے لیے خاموش رہی۔‘

’میرے لیے کیوں؟ مجھ پر یہ احسان کیوں کیا؟‘

’کیونکہ شاید تمہارے اندر کی مردانگی......، وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر تیزی سے بولی...... کہ شاید تم شرم محسوس کرو — اور اس سے کہو کہ اُسے اس انداز میں بات نہیں کرنا چاہئے۔‘

’تم پاگل ہو گئی ہو — یاد کرو، میں نے یہ بات اُس سے کہی تھی۔‘

’تمہاری آواز میں جوش نہیں تھا — اور میں اب تمہارے اس ڈرامے کو سمجھ رہی ہوں — دراصل یہ تم دونوں کا پلان تھا۔ وہ غصے میں چیخی۔ میں بتاؤں گی نہیں۔ سن لیا تم نے...... میں بتاؤں گی نہیں —‘

ناہید پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ کمال کچھ دیر تک سناٹے میں ڈوبا رہا۔ ناہید کا آخری جملہ ابھی بھی کانوں میں گونج رہا تھا — اُس کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ کیا ناہید اب اپنا ذہنی توازن کھونے لگی ہے۔ یا وہ بغاوت کی اس منزل پر ہے، جہاں کچھ بھی کر سکتی ہے — اُس کے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس رشتہ میں بغاوت کہاں سے آ گئی —؟ اور ناہید نے اچانک یہ نیا ڈرامہ کیوں شروع کر دیا — کمال یہ بھی سوچتا تھا کہ آخر اُس سے غلطی کہاں ہوئی۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ ناہید کا یہ مزاج اب اُسے دن بہ دن ناہید سے دور کرتا جا رہا تھا۔

رات ہو گئی تھی۔

نینی تال میں موسم سرما کی ہوائیں ایک قطار سے کھڑے درختوں کو چومتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ پتوں کے ملنے سے پہاڑیوں میں ایک پر اسرار موسیقی کی گونج ہوتی ہے۔ اس موسیقی میں خوف کے ساتھ جنون کا بھی احساس ہوتا ہے۔ رات میں کہتے ہیں اِن پہاڑیوں کی چٹانیں جاگ جاتی ہیں اور جب کبھی کوئی گاڑی ان پہاڑی راستوں سے گزرتی ہے تو چٹانیں خوفناک موسیقی کے ذریعہ اُسے آنے والے خطرات کا احساس بھی دلاتی ہیں...... ایک گہری خاموشی — اور اس وقت ساری دنیا سو چکی ہے۔ لیکن کیا کوئی طوفان آنے والا ہے......؟

کیا حقیقت یہ ہے کہ ان الجھی ہوئی سانسوں اور بیقراری کا کوئی انت نہیں ہے —؟ ایک گہرا کنواں ہے اور جیسے ایک بے بس جسم اس کنویں میں اترتا چلا جا رہا ہے...... دور کہیں آگ جل رہی ہے اور چند قبائلی رقص کرتے ہوئے منہ سے عجیب عجیب آواز نکال رہے ہیں اور فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی بو پھیلی ہوئی ہے...... کمال کو احساس ہوا، چاروں طرف چیلیں جمع ہیں...... اور وہ دیکھ سکتا ہے...... انسان آہستہ آہستہ خاتمہ کی طرف بڑھ رہا ہے — ڈھول بج رہے ہیں۔ قبائیلی زور زور سے تانڈو کرتے ہوئے منہ سے عجیب سی آوازیں نکال رہے ہیں — اور اچانک......

کمال کو احساس ہوتا ہے۔ پاؤں کی انگلیوں کے پاس حرکت ہوئی ہے...... وہ جسم میں سہرن' سی محسوس کرتا ہے...... پاؤں کی انگلیوں سے ہو کر جانگھوں تک...... سرسراتے ہوئے ہاتھ......

باہر تیزی سے بجتے ہوئے ڈھول مجرے...... وہ ان خوفناک وادیوں میں تھا جہاں قبائلی نرتیہ کرتے ہوئے دنیا کے فنا ہونے کی کہانیاں سنا رہے تھے...... چیخ رہے تھے...... شور کر رہے تھے۔

چٹانوں سے گزرتی ہوئی سرد ہوا خاموشی کو توڑ رہی تھی — رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی — اور اب وہ ہر طرح کے احساس سے باہر نکل آیا تھا۔ اور یہ محض خیال نہیں تھا...... دو ہاتھ اُس کے پاؤں کے پاس سرسرا رہے تھے...... اور اچانک اُسے احساس ہوا...... وہ بے لباس ہے — پائجامہ اتر چکا ہے...... اور کوئی انسانی جسم اُس کے ننگے پاؤں کے پاس جھکا ہوا اُسے غور سے دیکھ رہا ہے —

وہ زور سے چلایا......اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ناہید کو دیکھنے لگا— وہ بے لباس تھا اور ناہید اُس کے پاؤں کے پاس جھکی ہوئی اس کے نازک اعضا کو غور سے دیکھ رہی تھی......اس وقت اس کے سارے بدن میں خوف کے ساتھ کپکپی بھی داخل تھی......ناہید کا چہرہ سپاٹ تھا— جذبات سے عاری۔

کمال زور سے چیخا— کیا کر رہی تھی تم......؟'

'دیکھ رہی تھی۔'

دیکھ رہی تھی...... یا—' کمال کو اچانک صبح میں بولے گئے ناہید کے لفظوں کی یاد آ گئی— 'مردانگی' کہتے ہوئے وہ ٹھہر گئی تھی— تو کیا بغاوت کی ہر منزل سے گزر کر وہ اُس کی مردانگی کو ختم کرنے آئی تھی— وہ غور سے ناہید کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا— کہیں اُس کے پاس کوئی چاقو، کوئی ہتھیار تو نہیں اور ان دنوں ناہید جس غصے اور بغاوت کے ساتھ نظر آ رہی تھی، وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

کمال کا خوف ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔ وہ پھر زور سے چلایا۔

'تم کیا کر رہی تھی—؟ تم نے میرے کپڑے کیوں اتارے—؟'

ناہید کا چہرہ سپاٹ تھا— 'میری خواہش ہوئی۔'

'کیوں، سیکس کی آگ جاگ گئی تھی۔ بھوک'

ناہید کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اب یہ چہرہ ایک خوفناک چہرے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

'نہیں۔'

پھر کیا کر رہی تھی—؟' کمال کی آنکھوں میں خوف تھا— 'مجھے یقین ہے تم کچھ برا سوچ کر آئی تھی۔ اور اگر میری آنکھ نہیں کھلتی تو شاید تم کچھ کر گزرتی۔ مگر کیا کر گزرتی—؟ مائی گاڈ۔ میں سوچنے سے قاصر ہوں کہ آدھی رات، جب کہ ساری دنیا سو چکی ہے، ایک بے رحم عورت، جو بدقسمتی سے میری بیوی بھی ہے، میری جانگھوں پر جھکی ہوئی ہے۔ اُس نے میرا پائجامہ اتار دیا ہے۔ تو یہ سب بے مقصد تو نہیں ہو سکتا......؟'

'میں نے کب کہا کہ بے مقصد تھا؟'

'پھر......' کمال غصہ سے چلایا...... یہ تم نے اپنے ہاتھوں میں کیا چھپا رکھا ہے...... مائی گاڈ......دکھاؤ مجھے......

'کچھ نہیں ہے۔' ناہید کا لہجہ اس بار بھی سپاٹ تھا۔

'کچھ نہیں ہے تو تم نے ہاتھ پیچھے کی طرف کیوں باندھ رکھے ہیں۔ دکھاؤ مجھے کیا ہے......

کمال اچھل کر پشت پر آ گیا۔ اور اس نے ناہید کے ہاتھوں میں چھپے ہوئے چاقو کے پھل کو دیکھ لیا۔ اُس نے تیز چیخ ماری۔ لباس کا جائزہ لیا— کچھ دیر پہلے چاقو کا پھل لیے ناہید اُس کے جانگھوں کے درمیان جھکی ہوئی تھی۔ صبح گفتگو کے درمیان وہ مردانگی کے الفاظ پر آ کر ٹھہر گئی تھی— اور پھر کمرے سے باہر جاتے ہوئے اس نے کہا تھا— دیکھ لوں گی؟ تو کیا آدھی رات، ہاتھ میں چاقو لیے وہ اس کی مردانگی کا خاتمہ کرنے آئی تھی—؟ یہ تو اچھا ہوا کہ اُس کی چھٹی حس نے اسے جگا دیا—

'چاقو دو مجھے......'

'چاقو کہاں ہے؟' ناہید نے دونوں ہاتھوں کو کھول دیا۔

'چاقو تمہارے ہاتھ میں تھا۔'

'تمہارا وہم ہے'

'میں کہتا ہوں، تھا۔'

'تم پاگل ہو گئے ہو۔'

'میں کہتا ہوں، تمہارے ہاتھ میں چاقو میں نے خود دیکھا ہے۔'

'یہ تمہاری سوچ کا فتور ہے۔'

’فتور نہیں۔‘ کمال زور سے چیخا— ’تمہارے ہاتھ میں چاقو تھا اور میں نے خود دیکھا ہے...... بولو تم نے کہاں چھپایا—؟‘
’میں نے کہیں نہیں چھپایا—؟‘
’تم نے چھپایا ہے—‘ کمال زور سے چیخا اور اس بار اچھل کر دوبارہ ناہید کے آس پاس تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ شک کی نگاہوں سے ناہید کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ناہید کا چہرہ سپاٹ تھا۔ لیکن ابھی اس چہرے میں اسے عیاری اور مکاری دونوں کی جھلک نظر آرہی تھی۔ جب کمال کو چاقو نہیں ملا تو وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سانس تیز چل رہا تھا۔ وہ الجھن اور کشمکش بھرے لمحوں سے گزر رہا تھا— یہ کیسے ہوسکتا ہے...... میں نے صاف دیکھا تھا۔ چمکتا ہوا چاقو کا پھل۔ یہ وہ چاقو ہرگز نہیں تھا، جو کچن میں ہوتا ہے، جس سے سبزیاں کاٹی جاتی ہیں— ذہن میں آندھیاں الجھ رہی تھیں۔ اور اس وقت کمال ایک ایسے کرب سے گزر رہا تھا۔ جسے لفظوں کا لباس نہیں پہنایا جاسکتا۔ ذہن میں انگارے برس رہے تھے۔ اور بس ہر دھما کہ یہی کہہ رہا تھا۔ یہ عورت تمہاری مردانگی کو ہمیشہ کے لئے سلانے اور ختم کرنے آئی تھی۔ یہ دنیا کی پہلی عورت ہے۔ جو اپنے ہی شوہر کی مردانگی ختم کرنے آئی تھی۔ یہ گونج کچھ ایسی تھی کہ تھر تھر کانپتے ہوئے کمال نے ایک بار پھر ناہید کی طرف دیکھا اور غصے میں چیخا۔
’میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ سن رہی ہو تم۔ اب اس رشتے میں کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ سنا تم نے......اور مجھے حیرانی ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیوں رہ رہا ہوں— کیا مجھے تمہارے ساتھ رہنا چاہئے۔ رہنا چاہیے تو کیوں؟ اس خوف کے ساتھ کہ تم کبھی بھی مجھ پر حملہ کرسکتی ہو۔ کبھی بھی غصہ میں آکر میرے مرد ہونے کے احساس کو کاٹ سکتی ہو......اور میں ابھی بھی تمہارے ساتھ رہ رہا ہوں۔‘
’تو کیوں رہ رہے ہو...... چلے کیوں نہیں جاتے—‘ ناہید نے اطمینان سے جواب دیا۔ اتنے اطمینان سے کہ کمال یوسف کے غصے کا پارہ آسمان چھو گیا— اس نے ایک گندی سی گالی دی اور غصہ میں اس سے پہلے کہ ناہید پر تھپڑ اٹھاتا، ناہید نے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اسے احساس ہوا، اس وقت ناہید کے ہاتھ پتھر کی طرح سخت ہیں اور اُس نے شاید چاقو بھی چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں تھرتھراہٹ تھی۔ ناہید نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ کمال یوسف نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کے جسم میں تھرتھراہٹ ہے۔ اور اس کا ہاتھ سرد ہو رہا ہے۔ بلکہ لنج...... اس نے دروازے کے ہلنے کی آواز سنی۔ پھر جیسے سناٹا چھا گیا......

☆☆

’رکو—‘

بطور مصنف میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ میرے لیے ضروری ہو گیا تھا اور میں کمال کو آگے کی کہانی سنانے سے روک دوں۔ میں نے محسوس کیا، اس وقت بھی کمال کے جسم میں تھرتھراہٹ تھی اور ممکن ہے، وہ دوبارہ اسی منظر کی زد میں ہو اور اس سے باہر نکلنا اس کے لئے آسان نہ ہو۔
’میرے پاس اس وقت دو سوال ہیں۔ اور مجھے کہنا چاہئے کمال؟ میں تم سے کہیں زیادہ الجھ کر رہ گیا ہوں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ جب ناہید تم پر جھکی ہوئی تھی تو کیا تم نے اُس کے ہاتھ میں واقعی چاقو دیکھا تھا—
’ہاں— مجھے یقین ہے۔ اُس کے ہاتھ میں چاقو تھا بلکہ چاقو کے پھل کی چمک ابھی بھی میری آنکھوں میں خوف پیدا کر رہی ہے۔‘
’ممکن ہے یہ تمہارا وہم ہو۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو ہم سوچ لیتے ہیں، وہی ہمیں نظر بھی آتا ہے۔ ممکن ہے اُس موقع پر ناہید سچ بول رہی ہو۔ تو سوال یہ ہے کہ وہ تم پر جھکی ہوئی کیوں تھی؟
’میں نے کہا نا، اس کے ہاتھ میں چاقو تھا— اور اُس دن اچانک ہی اُس نے غصہ میں بولتے ہوئے ایک لفظ ادا کیا تھا۔ مردانگی— اور اس کے بعد وہ خاموش ہوگئی تھی......‘
’تو تم محسوس کرتے ہو کہ......‘ میں نے کمال کی آنکھوں میں جھانکا۔
’محسوس نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔‘
’اچھا یہ بتاؤ—‘ میرے ذہن میں وہ منظر کوند گیا تھا، جب کمال، ناہید پر چلا رہا تھا اور ناہید کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ کمال نے ناہید پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تھی اور ظاہر ہے ناہید جیسی عورت خاموشی سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ میں نے کمال کی طرف دیکھا۔ ایک ساتھ بہت ساری الجھنیں میرے چہرے پر جمع ہوگئی تھیں۔

’سنو کمال۔ سوچ کر جواب دینا۔ جب ناہید پر تم نے ہاتھ اٹھایا اور وہ تمہارے کمرے سے باہر نکلی، کیا اُس وقت اُس نے کچھ کہا تھا یا خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی......؟

’چوہا— ‘ کمال کو جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا— ہاں یہی کہا تھا اُس نے— میں نے پلٹ کر دیکھا بھی کہ کہیں آس پاس کوئی چوہا تو نہیں۔ کیونکہ ان دنوں گھر میں عام طور پر چوہے گھومتے رہتے تھے اور ناہید چوہوں کی یورش سے پریشان رہتی تھی۔‘

’چوہا......‘ میری ذہنی رو گھوم رہی تھی......اس موقع پر ناہید کا چوہا کہنا اور کمرے سے باہر نکل جانا......میں نے اس پورے منظر کو اپنی آنکھوں میں بسا لیا تھا۔ رات کی تاریکی میں ناہید کا کمال کے پاس ہونا......اُس کے پاجامے کو اتارنا......کمال کا اُس کے ہاتھوں میں چاقو دیکھنا۔ دونوں میں جنگ ہونا اور ناہید کا چوہا کہہ کر کمرے سے باہر نکل جانا......وہ بھی خاموشی سے— اُف خدا......مجھے چکر آ رہا تھا۔ انسانی اخلاقیات کی کتاب میں شاید اظہار کے ان نئے اور انوکھے طریقے پر ابھی بندش ہے اور سنگسار ہونے کا خطرہ— مگر اس مہذب ترین دنیا اور اب تک کی دنیا کے مرد اور ان کی مردانگی پر ناہید ایک خوفناک تبصرہ کر کے گذر گئی تھی......’چوہا......‘ صدیوں کی یہ مردانگی کندن کی طرح تپے ہوئے احساس کے پیکر کا حصہ نہیں تھی، یہ مردانگی کوئی سایہ دار درخت، کوئی سائبان، سہارا دینے کا عمل یا برگد کی چھاؤں سے عبارت نہیں تھی......یہ مردانگی ایک چوہے میں تبدیل تھی......اور مرد ذات کی اب تک کی حماقتوں یا مردانگی پر یہ ایک ایسا یک لفظی بھرپور تبصرہ تھا، کہ اس وقت مرد اس اس معاشرے میں چوٹ کرنے والا اس سے بھیانک تبصرہ شاید کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔

’مائی گاڈ— ہم اکیسویں صدی میں ہیں اور مرد ایک چوہا بن رہا ہے۔ اس کاسموپولیٹن کلچر، چیٹ لائن، انٹرنیٹ مکالمہ، اور کنزیومر تہذیب میں وہ جس تیزی سے کپڑے اتار رہا ہے، اُس تیزی سے تو عورتیں بھی نہیں اتار رہی ہیں— اس کی سیکسول اور مردانگی کی امیج کہیں دور ہو گئی ہے۔ اور ایک زیادہ بڑے سماج سے وابستہ مردوں کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان میں ایک بڑی اکثریت نے خود کو چوہے کی حد تک قبول کر لیا ہے......

’مطلب؟‘ کمال حونقوں کی طرح میرا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ یہ چوہا حملہ بھی کرتا ہے......دلی کے گینگ ریپ یا اس طرح کی کوئی بھی مثال، ممکن ہے مردانگی کی سطح پر خود کو آزمانے کا چیلنج ہو— لیکن کتنا بیہودہ اور کتنا خوفناک......اس کوسمو کلچر میں مرد اپنے مرد ہونے کی صفات کے وسیع تر دائرے کو چھوڑ کر صرف ایک معمولی چوہے کی حد تک سمٹ آیا ہے— غیر معمولی طاقت، غیر معمولی فکر، سیاست، حکمرانی، نگہبانی اور اس طرح کی تمام صفات اُس سے چھین لی گئی ہیں۔ وہ اس وسیع کائنات کا ایک معمولی پرزہ ہے بلکہ ایک معمولی چوہا......

میں نے کمال کی طرف دیکھا— وہ اب بھی ناسمجھوں کے انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور محض ناہید کے بولے گئے ایک لفظ میں مجھے صدیوں کے ظلم و ستم کے اشارے مل رہے تھے۔ صدیوں کی غلامی، Chestity Belt سے ہو کر گزرنے والے خوفناک قصے— یہاں مرد حاکم تھا۔ عورت صرف ایک ربر کی گڑیا۔ صدیوں کے جبر و ظلم کے بعد ذرا سا آزاد ہونے کی کوشش میں اگر عورت نے مرد کا جائزہ لیا تو اسے کہاں دیکھا تھا— ؟ کافکا کے کردار گریگور سمسا کی آنکھیں ایک صبح کھلتی ہیں تو وہ خود کو ایک عظیم کیڑے میں تبدیل ہوا دیکھتا ہے۔ لیکن اس مہذب صدی میں دو عظیم جنگوں سے نکلنے کے بعد جدید ٹیکنالوجی اور کمرشیلزم کے اس دور میں مرد کی حقیقت کیا رہ گئی تھی— ؟ اور حقیقت یہ تھی کہ ناہید اس ’محض چوہا‘ کے احساس کے ساتھ زندگی گزارنے کو تیار نہیں تھی......

’تو کیا اس دن وہ چلی گئی؟‘

’آہ— نہیں۔‘

’ہونہہ— ‘ میرے اندر کشمکش ابھی بھی جاری تھی۔

’تو کیا اس نے اس ذلیل چوہے کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا تھا؟‘

’ذلیل چوہا— ؟‘ اس بار خوف سے کمال نے میری طرف دیکھا—

’آہ......‘ مجھے ہنسی بھی آ رہی تھی۔ اور دنیا کے تمام مردوں کے لیے ترحم کا جذبہ بھی پیدا ہو رہا تھا......آہ......تمہیں کیسے سمجھاؤں میرے دوست۔ تم اُس کے لئے کچھ بھی نہیں رہ گئے تھے۔ شونیہ۔ صفر......یا پھر مجھے معاف کرنا۔ ایک معمولی چوہا......اس سے زیادہ تم نہیں تھے۔ تم کوئی

سایہ دار برگد نہیں تھے۔ تم اُسے تحفظ نہیں دے سکتے تھے۔ اس نے تمہاری تمام بڑی بڑی حقیقتوں کو جھٹلا دیا تھا— اور اسی لئے اسے جانا تھا اور اُس نے جانے کا فیصلہ کرلیا۔'

پھر اس نے خودکشی کیوں کی؟'

'تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس نے خودکشی کی ہوگی؟'

کمال سوچ میں گم تھا— 'پولیس بھی تفتیش کر کے ہار گئی۔ وہ اپنی حویلی میں بھی نہیں ملی۔ پھر اور کیا ہوسکتا ہے؟'

'یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ناہید اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کرسکتی تھی— ممکن ہے، جیسا تم نے بتایا، وہ رات کے وقت گھر سے نکلی تھی۔ ممکن ہے اندھیرے میں اگر وہ کسی گہری کھائی میں گرگئی ہو تو الگ بات ہے مگر دانستہ طور پر وہ یہ قدم نہیں اٹھا سکتی تھی......'

کمال سوچ میں ڈوب گیا......وہ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

'اچھا۔ اس حادثہ کے بعد کیا ہوا— ؟ یعنی جب تمہیں وہ چوہا کہہ کر کمرے سے باہر نکلی، کیا وہ معمول پر آ چکی تھی؟'

'شاید ہاں......شاید نہیں۔ میں ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ کمال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا'......دراصل اس حادثے کے بعد میں اتنا ڈر گیا تھا کہ میں اُس سے خود ہی جان چھڑانا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا، وہ اس طور پر نہیں جائے گی۔ ممکن ہے میرے اشتعال دلانے سے وہ چلی جائے۔ دوسرے دن صبح میں اُس کی تلاش میں گیا تو وہ باہر برامدے میں کرسی پر جھکی ہوئی تھی— اور اُس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا— وہ پورے انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ میں غور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کررہی ہے......وہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کررہی تھی۔ اور اس کے بعد جو میں نے دیکھا، میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

'کیوں؟'

'اس کے پاس ایک چوہے دانی پڑی تھی......چوہے دانی کے اندر وہ روٹی کا ٹکڑا ڈال رہی تھی......

پہلے میں نے نرم لہجہ اختیار کیا— 'کیا کررہی ہو؟'

'دیکھتے نہیں۔ کیا کررہی ہوں۔'

'ہاں دیکھ رہا ہوں۔ تبھی پوچھ رہا ہوں۔'

'جب دیکھ رہے ہو تو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔'

'لیکن اتنی صبح یہ چوہے دانی کہاں سے ملی— ؟'

'مل گئی کہیں سے۔ دیکھتے نہیں۔ گھر میں چوہے کافی آگئے ہیں۔'

میں نے اقرار میں سر ہلایا— 'آ تو گئے ہیں۔ لیکن تم نے اس سے قبل کبھی چوہے دانی لانے کے بارے میں نہیں سوچا— ؟'

ناہید اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس نے اُسی لہجے میں جواب دیا— 'جو کام پہلے نہیں ہوا۔ وہ بعد میں بھی تو ہوسکتا ہے۔' وہ مسکرائی تھی۔ اب دیکھنا۔ چوہا مرے گا......'

اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ میں ڈر گیا......

کمال یوسف خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ 'اس میں ڈرنے والی بات کون سی تھی— ؟'

'اس کا لہجہ— مجھے اس لہجے سے خوف کی بو آرہی تھی۔ اور میں کمرے میں واپس آکر سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے ناہید کو خود سے دور کرنا ہے تو اسے اشتعال دلانا ہوگا۔ دوسری صورت میں، میں نے ان تمام پہلوؤں پر غور کرلیا تھا کہ میں اُس کے ساتھ رہ سکتا ہوں یا نہیں— اگر پچھلی رات والا حادثہ نہ ہوا ہوتا تو شاید میں اس احمقانہ خیال کے بارے میں سوچتا بھی نہیں کہ اس سے پیچھا کیسے چھڑایا جائے۔ لیکن پچھلی رات جس طرح وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی، میں کہہ سکتا ہوں، میں اس قدر ڈر گیا تھا کہ اب اس کے ساتھ رہنا کم وبیش میرے لیے آسان نہیں رہ گیا تھا۔

'پھر کیا ہوا......؟'

'وہی اشتعال دلانے والی بات......' کمال نے میری طرف دیکھا— 'بہتر ہے میں وہ پورا منظر آپ کو دکھادوں......'

(6)

دھوپ سر پر آ گئی تھی مگر کمال کی آنکھوں کے سامنے جو کھیل چل رہا تھا، اُس نے خوشگوار صبح کے تاثر کو زائل کر دیا تھا—— ناہید ابھی بھی چوہے دانی میں الجھی ہوئی تھی—— روٹی کے چھوٹے ٹکڑے چوہے دانی کے اندر تار میں احتیاط سے لٹکائے جا رہے تھے...... درختوں کے سبز پتّوں کے درمیان سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی کرنوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے ہر کرن سے چمکتے ہوئے سفید سفید چوہے زمین پر گرتے جا رہے ہوں......اس وقت وہ چوہوں کی زد میں تھا۔ ہر طرف سے جیسے چوہوں نے اس پر حملے کر دیے ہوں۔کمال کو اُس جادوگر کی یاد آ رہی تھی جو بانسری بجاتا ہوا پہلے گاؤں سے چوہوں کی فوج کو لے کر پہاڑوں کی ترائی میں اُتر گیا—— پھر اس کے پیچھے پیچھے گاؤں کے تمام بچے پہاڑی کی ترائی میں اتر کر غائب ہو گئے۔ یہ چوہے کچھ بھی کر سکتے ہیں......کمال کے سامنے البیر کامو کے ناول دی پلیگ کا کردار ڈاکٹر ریو بھی تھا، جس نے اپنے گھر کی سیڑھیوں پر ایک چوہے کو مردہ دیکھا تھا——اور اس کے بعد ہی سارے شہر میں ہیضہ پھیل گیا تھا—— ڈاکٹر ریو غائب تھا——اور جادوگر بھی پہاڑ کی ترائی میں اتر چکا تھا—— دھوپ کی اجلی کرنوں کے درمیان انہماک سے اپنے کام میں مصروف ناہید تھی——اور ایک کمال، جس نے کبھی ناہید کو اس طرح بیکار کے کاموں میں الجھا ہوا کبھی نہیں پایا تھا—— رات کی آندھی ابھی مکمل طور پر رخصت نہیں ہوئی تھی——اور اس وقت اس آندھی نے کمال کو دوبارہ اپنے نرغے میں لینا شروع کر دیا تھا......اس کے باوجود وہ اس لمحے کو ایک سکون آمیز لمحے میں تبدیل کرنے کا خواہشمند تھا......اُس نے مسکرانے کی کوشش کی—— ناہید کی طرف دیکھا......

’تو چوہا مارنے کا خیال ہے......؟‘

’ہاں......‘

’’سفید یا سرخ......؟‘

’چوہے——چوہے ہوتے ہیں——‘ ناہید کا چہرہ سپاٹ تھا......’چوہے بزدل ہوتے ہیں—— کوئی سفید بزدل چوہا بھی آ سکتا ہے اور کوئی سرخ بھی——‘

کمال نے پھر مسکرانے کی کوشش کی—— ’کہتے ہیں انسان کی طرح چوہے بھی صدیوں سے ہیں—— انسان کے سب سے پرانے دوست......‘

ناہید نے نظر اٹھائی—— اُس کے چہرے پر سختی تھی——اس بار وہ خاموش رہی——‘

کمال کو مزہ مل رہا تھا——اس نے دوبارہ کہا—— ایک چوہا ہمارے لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر میں بھی ہے...... ماؤس......‘ وہ زور سے ہنسا—— چوہے شکل بدل کر زندہ رہتے ہیں اور کہیں بھی آ جاتے ہیں—— ہمارے نیٹ سسٹم کو وہی چلاتے ہیں......‘

ناہید کی آنکھوں میں انگارہ چھپا تھا—— اب ماؤس کی ضرورت نہیں ہے——‘ وہ زور سے ہنسی تھی—— اسی لیے اس چوہے دان میں......تم سمجھ رہے ہونا......‘ اُس کا لہجہ اُکھڑا ہوا تھا——

’لیکن تم ایسا کر نہیں پاؤ گی—— اور مجھے اس کا افسوس رہے گا ناہید——‘ کمال غور سے ناہید کے چہرے کو پڑھتا ہوا بولا—— چوہے ہر جگہ ہیں......اب تو دھماکہ خیز مواد اور منشیات کو سونگھنے کے لیے بھی چوہوں کو کتوں کے طرز پر تربیت دی جا رہی ہے—— کتوں کی طرح چوہے بھی

کھوجی بن گئے ہیں— کہا جاتا ہے کہ کتوں کے مقابلے چوہوں میں سونگھنے کی حس، کہیں زیادہ ہوتی ہے— کتوں کو زیادہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ چوہے بہت کم وقت میں اچھے کھوجی چوہے ثابت ہوتے ہیں—' کمال مسکرایا..... 'جب تک تم اسے پکڑنے کی کوشش کروگی۔ وہ کسی چوہیا کی تلاش میں نکل چکا ہوگا۔'

ناہید نے جیسے سنا نہیں— وہ اپنے کام میں الجھی ہوئی تھی— کمال کو یاد آیا، یہ وحشت ناہید پر رات سے سوار ہوئی تھی جب اُس کے کمرے سے جاتے ہوئے ناہید نے آہستہ سے اس لفظ کی ادائیگی کی تھی...... چوہا— لیکن تب کمال یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ صبح ہوتے ہی، رات کی 'جبلت' سے پہرہ ہٹتے ہی، وہ اس چوہے کے تعاقب میں اتنی دور نکل جائے گی کہ صبح ہی صبح ان چوہوں کو پکڑنے یا مارنے کے لئے ایک چوہے دانی لے کر آجائے گی— کمال ابھی تک ناہید کے اس مزاج کو سمجھ نہیں پایا تھا— وہ اب بھی اُس کی طرف دیکھ رہا تھا— وہ ایک بار پھر آہستہ سے بولا—

'چوہا بہت جلد انسان سے مانوس ہو جاتا ہے.....'

ناہید چپ رہی—'

'جنگلی چوہے گھر بنانے کے فن میں ماہر ہوتے ہیں—'

ناہید اس بار بھی چپ رہی— ناہید کی خاموشی کمال کو اُکسانے پر مجبور کر رہی تھی— اُس نے آہستہ سے کہا— ایک شخص چوہوں سے پریشان تھا— اُس نے ایک چوہے دانی لگائی.....'

ناہید نے نگاہیں اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا—

کمال نے اپنی بات جاری رکھی..... 'لیکن وہ شخص کنجوس تھا— روٹی کے ٹکڑے کی جگہ اُس نے اخبار سے تراشی ہوئی روٹی کے ٹکڑے کی تصویر چوہے دانی میں رکھ دی.....'

ناہید کا چہرہ آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہا تھا—

'دوسرے دن جب وہ شخص چوہے دانی کے پاس گیا تو معلوم ہے اُس کو کیا ملا— روٹی کی تصویر کے پاس ہی اخبار سے کتری ہوئی چوہے کی ایک تصویر رکھی ہوئی تھی.....'

اس سے پہلے کہ کمال قہقہہ لگا پاتا، اُس نے دیکھا، ناہید اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی— اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور گلے سے غراتی ہوئی آواز نکل رہی تھی— کمال کے لیے یہ چونکنے والا لمحہ تھا، کیونکہ اس سے قبل کبھی اس نے ناہید کا یہ روپ نہیں دیکھا تھا— ناہید کی آنکھیں خوفناک لگ رہی تھیں— وہ چیخ رہی تھی—

'تم پاگل ہو گئے ہو..... تم جانتے بھی نہیں کہ چوہا کیا ہوتا ہے..... گوشت کی ایک جھلّی ..... ایک منحوس ٹکڑا— میں چاہتی تو چوہے مارنے والی دوا بھی لا سکتی تھی— آج کل تو چوہے مارنے کے پاؤڈر بھی ملتے ہیں— بسکٹ بھی— مگر نہیں— میں اُسے پکڑنا چاہتی ہوں— اسے روندنا چاہتی ہوں— مسلنا چاہتی ہوں..... ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتی ہوں..... سمجھ رہے ہو تم......

'ناہید.....' کمال زور سے چیخا— اس وقت یہ چہرہ اُس کے لیے اجنبی تھا— وہ زور سے چیخا— 'تم جانتی بھی ہو تم کیا کہہ رہی ہو— میں مذاق کر رہا تھا— اور تم.....'

'تم مذاق نہیں کر رہے تھے.....' ناہید پھر زور سے چلائی..... کمال کو ذہن ڈوبتا ہوا محسوس ہوا— اس کا لہجہ سرد تھا— میں تو یونہی چوہے کے بارے میں.....'

'جانتے بھی ہو چوہا کیا ہے—؟' ناہید کی آواز میں سانپ کی پھنکار شامل تھی..... 'چوہا ایک بھوک ہے— روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کترنے کے بعد بھی اُس کی بھوک شانت نہیں ہوتی— اُس کی بھوک بڑھ جاتی ہے...... اور وہ ہر بار اپنی بھوک مٹانے کے لئے آجاتا ہے...... پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور بن کر..... لیکن میں چھوڑوں گی نہیں— ماردوں گی— وہ جہاں کہیں بھی ہوگا— چھت پر، برامدے میں...... بلوں میں، کونے کتروں میں— میں اسے تلاش کروں گی اور ماردوں گی.....' ناہید کے چہرے پر ایک سفاک مسکراہٹ تھی— اور ادھر کمال کو اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اچانک اُس کی مسکراہٹ چھین لی گئی ہے— جیسے اُس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو..... کوئی آسیب..... بھوت......

ڈرا کیولا...... اچانک اُس کے سامنے آ گیا ہو— درختوں کی اوٹ سے آتی ہوئی سورج کی کرنوں کی جگہ چھن چھن کر چوہے زمین پر گر رہے تھے...... وہ حیران نظروں سے چوہوں کو دیکھ رہا تھا...... ایک...... دو...... تین...... ہزار...... چاروں طرف چوہے تھے...... کیا یہ ناہید کی گفتگو کا رد عمل تھا؟ اُس کو چکر آ رہے تھے— رات کا واقعہ یاد آ رہا تھا اور ناہید کے ابھی کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے...... میں ماردوں گی...... میں اُسے تلاش کروں گی اور ماردوں گی......'

کمال نے نفرت سے ناہید کی طرف دیکھا— 'اور اسی لئے کل آدھی رات تم مجھے مارنے کے لئے آئی تھی......؟'

'نہیں—؟

'جھوٹ— تم مجھے مارنے آئی تھی...... تمہارے لئے مارنا کھیل ہے— اور مجھے لگتا ہے، تمہارے پاس سے زندگی، زندگی کو قائم رکھنے والا جذبہ، محبت سب کچھ غائب ہو چکا ہے......'

'اسے تم نے غائب کیا ہے—'

'میں نے......'

'دھچکا لگا—؟' ناہید کے ہونٹوں پر پھر وہی سفاک مسکراہٹ تھی— تمہاری بھوک کچھ بھی زندہ رہنے کہاں دیتی ہے— تمہاری بھوک سب کچھ مردہ کر دیتی ہے—'

یہ بھوک کہاں سے آئی—'

ناہید نے قہقہہ لگایا— چوہے دانی کو ہلا کر بولی— 'روٹی کے ٹکڑے رکھے ہیں— بھوک جمع کر رہی ہوں— وہ آئے گا اور یہ لکڑی کا پٹرہ گر جائے گا— اور ادھر دیکھو...... یہاں جالی بنی ہے...... میں اُسے دیکھ سکوں گی...... قید میں تڑپتے ہوئے...... اور پھر میں اُسے ماردوں گی—'

ناہید اُسے دیکھ کر مسکرائی تھی— لیکن اس وقت اس پراسرار مسکراہٹ کو سمجھنا کمال کے لئے مشکل تھا— وہ کچھ دیر دم بخود اپنی جگہ کھڑا رہا۔ گھنے سائے تھے جو تیز دھوپ کے باوجود اُس کی آنکھوں کے آگے لہرا رہے تھے...... اور شاید وہ تادیر اسی کیفیت میں رہتا...... اگر وہ میٹھی سریلی آواز اُس کے کانوں میں نہ گئی ہوتی—

''منگری— میں جانتی ہوں تم یہیں ہو......'

''منگری...... کہاں ہو تم......'

اچانک دوڑتے ہوئے پاؤں ٹھہر گئے تھے— کمال نے پلٹ کر دیکھا— یہ وحیدہ تھی...... گھنے سائے اچانک دور ہو گئے— کمال کے چہرے پر مسکراہٹ تھی......

آپ......

'وہ...... آپ نے منگری کو دیکھا......'

'منگری......'

'میری دوست ہے— ہر سال اسی موسم میں سائبیریا سے آتی ہے......' وحیدہ کے ہونٹوں پر شکایت تھی— ابھی اڑتی ہوئی اس طرف آئی تھی— اچھا چلتی ہوں...... منگری...... منگری......'

وحیدہ آواز دیتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی— کمال کی خواہش ہوئی کہ یہ دریافت کرے، وہ ان پرندوں کی ہی تلاش کیوں کرتی ہے؟ جو دور رہتے ہیں اور مسافر پرندے ہوتے ہیں— مگر اس وقت کمال کی باتیں سننے کے لئے وحیدہ موجود نہیں تھی—

دو بجے چوہوں نے پھر شور مچایا—

اس درمیان کمال کی کوشش تھی کہ ڈراونے خواب جیسے واقعات سے الگ اپنی سوچ وحیدہ پر مرکوز کرے اور اس کا فائدہ بھی ہوا تھا— پچھلے کئی مہینوں سے چلنے والے خوفناک واقعات کی جگہ ہرنی کی طرح سہمی ہوئی وحیدہ آ گئی تھی— اور یہ ایک حقیقت تھی کہ اب وحیدہ اُسے اچھی لگنے لگی

تھی— لیکن کیا ناہید کواس کی خبرتھی؟ کیا ناہید نے اسی لیے اب وحیدہ سے دور رہنا شروع کر دیا تھا—؟ جب کہ ایک وقت تھا، وہ وحیدہ کا نام لیتے ہوئے تھکتی نہیں تھی—

’کیا ناہید میں ایک دوسری عورت آ گئی ہے؟ اور یہ عورت وحیدہ کی وجہ سے ہے؟‘

کمال یہ ماننے کو قطعی تیار نہ تھا— ایک وجہ تو یہ تھی کہ اگر ایسا کچھ تھا تو بیحد خاموشی سے تھا— اگر وحیدہ بھی اُسے پسند کرتی تھی تو اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا— اور کمال نے کبھی بھی ناہید کے سامنے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ وحیدہ کے لئے کمزور ہو رہا ہے— اس کے باوجود، اگر ناہید کے اندر یہ باغی اور خطرناک عورت آ گئی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟

اور حقیقت میں، کمال کوئی بھی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا— گھر کی فضا کچھ ایسی تھی کہ بار بار اسے خوف کا احساس ہو رہا تھا— پہلے اُسے اس بات کا یقین تھا کہ ناہید کسی نفسیاتی بیماری کی شکار نہیں ہے— مگر اب وہ جو واقعات پیش آ رہے تھے، اُس سے کہنا مشکل تھا کہ ناہید بیمار نہیں ہے— بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ ناہید نے خود کو بیمار کر لیا ہے— ممکن ہے یہ واقعات اُس کے ساتھ پیش نہ آئے ہوتے، تو اُس کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہوتا کہ کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے—

دو بجے کا وقت ہوگا۔ اچانک کمال ناہید کی چیخ سن کر چونک گیا...... آواز کچن سے آئی تھی— ادھر لگاتار ہی نئی نئی باتیں ہو رہی تھیں مگر اب محتاط رہنا ضروری ہو گیا تھا— وہ بھاگ کر کچن میں آیا تو اچانک چونک پڑا—

کچن جنگ کا میدان بنا ہوا تھا— برتن اور سامان ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے— کچن کے فرش پر خالی بوتلوں کے ڈھیر تھے— ان میں تیل، گھی، بورن ویٹا، ہارلکس کے خالی ڈبّے بھی تھے— یہ وہ ڈبے تھے جن کے خالی ہو جانے کے بعد وہ کچن کے نیچے کی طرف کھلنے والی المیرا میں ڈالتی چلی جاتی تھی...... ناہید کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا— آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں—

’کیا ہوا......؟‘

’چوہا......‘ ناہید زور سے چلا کر...... ’میں یہ خالی ڈبے نکال رہی تھی...... اُس نے اشارہ کیا...... دو موٹے چوہے...... اچانک کود کر باہر آئے اور مجھ پر حملہ کر دیا...... پھر کئی کئی چوہے......‘ وہ خوفزدہ نظروں سے کمال کو دیکھ رہی تھی...... ’یہ چوہے خوفناک ہو گئے ہیں— ہر جگہ ہیں، سمجھ رہے ہو تم......‘ وہ دوبارہ چیخی— ناقابل برداشت...... اُس نے ٹھہر کر اس لفظ کو دہرایا— اب بھی وہ خوف اور غصے سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی—

’اس میں چیخنے کی بات کیا ہے— چوہے ہر گھر میں ہیں—‘

’ہر گھر میں ہیں— کیا یہ خوفناک بات نہیں—؟‘ اُس نے غصہ سے اشارہ کیا— ’وہ دیکھو...... یہ تم نے کیا ہے......‘

’کیا......؟‘

کمال نے پلٹ کر دیکھا— اور اس لمحہ اُسے اپنی ہنسی کو روکنا مشکل ہو گیا— صبح جس چوہے دان کے ساتھ وہ روٹیاں ڈالنے اور چوہے کو پکڑنے کی تدبیر کر رہی تھی، وہ چوہے دان ٹوٹا پڑا تھا— لکڑی کے پٹرے الگ تھے— روٹی کے ٹکڑے بھی باہر بکھرے ہوئے تھے......

’چوہے، چوہے دان بھی...... چبا گئے؟‘

’نہیں— یہ تم نے کیا ہے—‘

’تم پاگل ہو گئی ہو—‘

’یہ تم نے کیا ہے— جھوٹ مت بولو— میں صبح ہی تمہارا منشا جان گئی تھی...... ناقابل برداشت— ناہید نے دوبارہ یہ لفظ دہرایا...... چوہوں کے ساتھ رہنا مشکل ہے...... تم سمجھ رہے ہو نا...... مشکل ہے رہنا۔‘ کچن سے باہر نکلتے ہوئے ناہید ایک لمحہ کے لئے رُکی— پلٹ کر کمال کی طرف دیکھا—

’میں اس گھر کو چوہوں سے پاک کر دوں گی— سمجھ رہے ہو تم......‘

☆☆

کمال اپنی دنیا میں واپس آچکا تھا— میں بغور اُس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا— خوف کا عکس اُس کے چہرے پر اب بھی موجود تھا، جیسے ابھی بھی وہ خوفناک چوہوں کے درمیان ہو— چوہے جو کچھ بھی کتر سکتے ہیں— چوہے جو چوہے دانی کترنا بھی جان گئے ہیں...... چوہے جو کھوجی، جاسوس اور خوفناک بیماریوں کی وجہ بھی ہیں— لیکن یہ چوہے ناہید کی نظر میں کیا تھے—؟ میں نے کمال کو دیکھا— وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر واش بیسن تک گیا— چہرے پر پانی کے دو چار چھینٹے مارے— پھر واپس آ گیا— جیسے وہ ان خوفناک واقعات کو دہراتے ہوئے ایک بار پھر سے ان حادثوں کا حصہ بن گیا تھا— اس درمیان صوفیہ دوبارآئی اور گئی— وہ خاموش تھی— میں نے اُس کی آنکھوں کو غور سے پڑھنا چاہا تو وہ مجھے اتنی ویران نظر آئیں کہ مجھے اس معصوم سی لڑکی سے ہمدردی پیدا ہوگئی— وہ ہر کچھ دیر بعد کمال کو اس طرح دیکھنے یا کھوجنے چلی آتی جیسے اُس کا قیمتی کھلونا کہیں گم نہ ہوجائے— میں نے دوبارہ کمال کی طرف دیکھا— میرا ذہن بھی الجھ چکا تھا— پچھلی رات سے لے کر دن کے دو بجے تک کا جو واقعہ کمال نے سنایا تھا، میں اُسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا—

'چلو، کہیں باہر چلتے ہیں— ممکن ہو تو صوفیہ کو بھی لے لو......'

اس وقت ذہن اتنا پریشان تھا کہ نینی تال کے حسین مناظر ہی مجھے ان حادثوں اور الجھنوں سے باہر نکال سکتے تھے— کہنے کی دیر تھی کہ صوفیہ تیار ہوگئی— کمال نے گاڑی نکال لی— گاڑی ہائی وے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ میں نے رُکنے کے لئے کہا— یہاں دونوں طرف تنگ راستے تھے— تھوڑا اوپر جانے کے بعد ہزاروں فٹ نیچے کی خوفناک گہرائی تھی— اگر یہ قبول کیا جائے کہ ناہید کو مرنا ہی تھا تو اس کو بہت دور جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی— مجھے ڈاکٹر سانیال یاد آ رہے تھے، جو کہا کرتے تھے کہ خودکشی کرنے کے لئے ارادہ کرنے سے زیادہ ضروری ہے، زندگی سے ہار مان لینا یا آخری امید بھی اٹھا لینا— جب ایسا انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ آگے کوئی راستہ نہیں ہے اور موت ہی الجھنوں سے چھٹکارے کا واحد علاج ہے تو ایسا سوچتے ہی دماغ کی متحرک نسیں کام کرنا بند کر دیتی ہیں— پھر وہ ایک لمحہ......ایک بھیانک لمحہ......اس لمحے کے لئے خودکشی کرنے والے کو بہت زیادہ سوچنا نہیں پڑتا— لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس پوری کہانی میں مجھے کہیں ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ ناہید زندگی سے ہار گئی ہو— وہ عشق سے ہار سکتی تھی— مگر نہیں— وہ عشق سے بھی کہاں ہاری تھی— ہارتی تو انتقام نہیں لیتی— اور اُس کے اندر جو غصہ یا آگ بھری تھی، وہ کسی کمزور، خودکشی کرنے والی لڑکی کی دلیل کو غلط ثابت کر رہی تھی— لیکن سوال تھا، ناہید کہاں گئی—؟ لیکن ابھی اس کہانی کے کچھ اور پڑاؤ باقی تھے— اور مجھے ان کے بارے میں جاننے کا تجسس برقرار تھا—

لورز پوائنٹ، آئس ہل کی سیر، کشتی بانی اور نڈلس، آئس کریم کھانے کے بعد ہم دوبارہ گھر کی طرف چل پڑے— اس اثنا میں، میں برابر صوفیہ کے چہرے کے تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا— وہ کم بول رہی تھی— لیکن اُس کی نظریں کمال کے چہرے سے ہٹتی نہیں تھیں— اور کمال کی طرف دیکھتے ہوئے محبت سے زیادہ میں نے اُس کے چہرے پر خوف کے آثار پائے تھے—

☆☆

رات ڈنر کرنے کے بعد ہم ٹیرس پر آ گئے— یہاں سے اندھیرے میں پہاڑیوں پر بنے ہوئے مکانات اور دور سے جلتی بجھتی روشنیوں کے درمیان شہر کو دیکھنا میرے لیے کسی فنتاسی سے کم نہیں تھا— ہوا تیز تھی— صوفیہ چائے بنانے کے لئے گئی تھی— اور یہ موقع میرے لئے مناسب تھا کہ میں کمال سے آگے کی کہانی جان سکوں...... میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا—

'تو ناہید نے جاتے ہوئے کہا، وہ گھر کو چوہوں سے پاک کر دے گی—'

'ہاں......'

'اور اس وقت ظاہر ہے وہ غصہ میں رہی ہوگی—'

'ہاں—'

'پھر تم نے کیا کیا......'

'مجھ سے ایک غلطی ہوگئی—' کمال آہستہ سے بولا— 'مجھے باشا کی یاد آ رہی تھی— میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے رات جو کچھ ہوا، وہ محض

ایک پاگل پن ہو— ممکن ہے وہ مجھے مارنے نہیں آئی ہو—اور کوئی بھی عورت اپنے شوہر کا قتل کیوں کرنا چاہے گی......؟ میں ناہید کے غصے کو کم کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ میں خود کے جذبات پر بھی قابو پانے کی کوشش کروں— لیکن اس درمیان کئی روز سے مجھے ایک چیز پریشان کر رہی تھی—اور آپ دیکھ رہے ہیں، میری کوئی زیادہ عمر نہیں ہے—یعنی اس عمر میں......اگر ایک شوہر کو کئی کئی راتیں یونہی گزارنے کی نوبت آئے تو—میرے خیال میں آپ سمجھ گئے ہوں گے—'

'ہونہہ—' میں نے آہستہ سے کہا—

'میں اندر کی سلگتی ہوئی آگ کو لے کر پریشان تھا—اس لیے جب ناہید غصہ میں یہ بولی کہ میں چوہوں سے اس گھر کو پاک کردوں گی تو اچانک میرے منہ سے نکلا......'

کمال کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا—

'کیا نکلا—؟'

'میں نے کہا......لیکن اس سے پہلے میں تمہیں ناپاک کرنا چاہتا ہوں— آپ سمجھ سکتے ہیں، ایسے مذاق شوہر بیوی کے درمیان ہوتے رہتے ہیں—یہ کوئی ایسی ویسی بات بھی نہ تھی— مگر باہر جاتے جاتے میرے اس مذاق پر ناہید کے جسم میں آگ لگ چکی تھی—وہ اتنی زور سے چیخی کہ اگر یہ گھر کمزور ہوتا تو شاید اُس کی چیخ کی تاب نہ لاکر گر پڑا ہوتا......وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی......کیا کہا تم نے......ناپاک کرنا چاہتے ہو مجھے......بھوک......بھوک سے آگے بھی کچھ جانتے ہو......؟ ہمیشہ بھوکے میں رہتے ہو— کتے کے پلے...... میں زور سے چیخا— بس کرو ناہید......مگر وہ جیسے پاگل پن کے انداز میں کچھ بھی سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھی—وہ زور زور سے چلا رہی تھی......اور شاید غصے میں، میں بھی چلایا تھا—ہاں مرد ہوں میں...... مجھے بھوک لگتی ہے......میں مرد ہوں...... مجھے بھوک لگتی ہے......'

'......میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا—میرا دماغ گھوم گیا تھا— میں نے سوچ لیا تھا اب اس عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا— میں مطمئن تھا کہ ناہید بھی یہی سوچ رہی ہے—اسی ادھیڑبن میں رات کے ۱۰ بج گئے تھے—ہم دونوں میں کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا— میں نے سوچ رکھا تھا کہ ناہید نارمل ہوگی تو اطمینان سے اُس سے بات کروں گا کہ اگر دو لوگ ایک چھت کے نیچے چین سے نہیں رہ سکتے تو انہیں الگ ہو جانا چاہئے— مگر دشمنوں کی طرح نہیں— کیونکہ اس طرح رہنے میں تین زندگیاں داؤں پر لگ جاتی ہیں—اور ہمارے معاملے میں سب سے زیادہ متاثر باشا ہوگا—'

'......مجھے احساس تھا کہ جب میں یہ موضوع چھیڑوں گا تو ناہید اس پر غور ضرور کرے گی اور ممکن ہے آپسی رضامندی سے یہ مسئلہ حل ہو جائے— کیونکہ ناہید کو بھی ایک زندگی چاہئے— مجھے یقین تھا کہ وہ خود بھی اس زندگی سے پریشان ہوگئی ہوگی— میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ باشا کا معاملہ بھی آپسی رضامندی سے طے کرلیں گے—اگر ناہید باشا کو رکھنا چاہے گی تو میں اعتراض نہیں کروں گا— مگر رات دس بجے اچانک جو واقعہ پیش آیا، میں نے کبھی خواب میں بھی اس کا تصور نہیں کیا تھا—

'مطلب؟' میں نے کمال کی طرف دیکھا—وہ کسی بچے کی طرح کانپ رہا تھا—صوفیہ چائے رکھ کر جا چکی تھی— کمال نے چائے کی کپ خالی کی—میری طرف دیکھا—

'مرد کسی عورت سے پریشان ہو جائے تو اُس کا آخری حربہ کیا ہوتا ہے؟'

'مطلب؟' اب چونکنے کی باری میری تھی—

'مثلاً ایک شوہر ہے—وہ بیوی سے ناراض رہتا ہے—اس کی زندگی میں کوئی بھی دن خوشی کا نہیں ہے تو وہ کیا کرے گا......؟'

'کچھ بھی......'

'مثلاً......؟'

'وہ چلائے گا......'

'اس کے بعد بھی عورت نے اس کو پریشان کیا۔'

’وہ سمجھائے گا۔‘

’عورت ماننے والی نہ ہوئی۔ یا مرد کا دل اس عورت سے بھر گیا ہوتو ایسا مرد کیا کرے گا؟‘

’وہ دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دے گا۔‘

’بالکل صحیح—‘ کمال نے میری طرف دیکھا— ’اُس نے یہی کیا— کیونکہ وہ ایک شوہر تھی— رات دس بجے بیڈروم کا دروازہ زور سے کھلا— جیسے زلزلے کا جھٹکا آیا ہو— میں نے دیکھا— دروازے پر ناہید تھی— اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک بڑا سا ڈنڈا تھا— منہ سے خوفناک آواز نکالتی ہوئی وہ حملہ آور موڈ میں میری طرف دیکھ رہی تھی......نکلو......نکلو...... یہاں سے۔ میں نے کہا تھا نا......تمہارے ساتھ رہنا مشکل ہے۔ اب حد ہو چکی ہے۔ اب تم اس گھر میں نہیں رہ سکتے۔‘

’ناہید......‘

میرا نام مت لو......نکلو یہاں سے—‘

’کہاں—؟ پاگل ہوگئی ہو تم......‘

’جو بھی سمجھ لو— لیکن نکلو......اس نے اشارہ کیا...... یہ لوہا ہے— میں ماردوں گی......یہیں مرجاؤ گے— نکلو یہاں سے—‘

میں کانپ رہا تھا— ’تم جانتی بھی ہو تم کیا کر رہی ہو— پاگل ہوگئی ہو تم—‘

’بس نکلو— ورنہ دھکے مار کر......‘ لوہے کا ڈنڈا پاگل پن کے انداز میں گھماتی ہوئی وہ مجھے باہر والے دروازے تک لے آئی— اُس کے چہرے کا رنگ اچانک بدلا تھا— اب اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی— وہ غصہ سے میری طرف دیکھتی ہوئی چیخی— تم لوگ ایسے ہی اپنی بیویوں کو گھر سے باہر نکالتے ہو نا—؟ دھکے مار کر......؟ سوچتے بھی نہیں کہ وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی— تمہارے الفاظ اُس پر کیا اثر کریں گے—؟ سب کچھ بھول جاتے ہو تم لوگ نا......؟ اب میں یہی کرنے والی ہوں...... دیکھ کیا رہے ہو— نکلو باہر...... باہر نکلو—‘

’تم پاگل ہوگئی ہو— سنو— میری بات سنو— ہم دونوں ایک ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو مشکل کیا ہے— آرام سے بھی تو الگ ہوا جا سکتا ہے—‘

اُس کی آواز میں سانپ کی پھنکار شامل تھی— ’نکلو باہر— مجھے کچھ نہیں سننا—‘

’لیکن اتنی رات گئے۔ میں کہاں جاؤں گا۔ پہاڑی علاقہ ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں سو گئے ہوں گے......‘

’میں کچھ نہیں جانتی—‘ وہ ہنس رہی تھی...... ’وہ عورتیں بھی اسی طرح روتے ہوئے مکالمہ ادا کرتی ہوں گی نا—‘ تم ذرا رو کر دکھاؤ۔ شاباش— ممکن ہے میرا ارادہ بدل جائے—‘ اس کے چہرے پر پھر سے سختی آ گئی تھی— ’نہیں میرا ارادہ نہیں بدلے گا— باہر نکلو......ابھی بھی باتیں کرتے رہے تو میں ڈنڈا چلا دوں گی— نکلو باہر— دھکے مار مار کر دروازے سے باہر نکال دوں گی—‘

’...... مجھے احساس تھا کہ اس وقت اس کی ذہنی حالت اچھی نہیں ہے— اور جو کچھ وہ کہہ رہی ہے...... وہ کر سکتی ہے......گھبرایا ہوا میں پیچھے ہٹتا ہوا دروازے سے باہر تھا— پھر میں نے آواز سنی— وہ دروازہ بند کر رہی تھی......‘

کمال بولتے بولتے ٹھہر گیا تھا— کچھ دیر تک سر جھکائے وہ زمین کی طرف دیکھتا رہا— ممکن ہے، ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو— میں نے دیکھا— ’اُس کی آنکھیں نم تھیں— شاید ان موقعوں پر خود کو سنبھالنا آسان نہیں ہوتا— ماحول میں خاموشی پسری ہوئی تھی—

حقیقت فنتاسی سے زیادہ تلخ ہوتی ہے— ان واقعات کا تصور کرتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے— اور یہ کہنا مشکل نہیں کہ اس وقت کمال پر کیا گزر رہی ہوگی— میں نے دیکھا— کمال نے اپنی ایک ہتھیلی سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا— وقت ٹھہر گیا تھا— یہ ایک ایسا لمحہ تھا، جب خاموشی دھماکے کر رہی تھی اور اس وقت اس کی گونج یہاں صرف ہم دونوں سن رہے تھے—

ہر بار ایک دنیا ہمارے لئے نئی ہو جاتی ہے— ہر بار ایک تہذیب پرانی ہو کر گم ہو جاتی ہے— ہر بار ہم ایک نئی تہذیب کے ساتھ حیران ہو

رہے ہوتے ہیں— لیکن کیا ناہید کی بغاوت سے کہیں کچھ فرق پڑا تھا—؟ کیا اربوں، کروڑوں میں ایسی کوئی ایک بغاوت اس سماج اور معاشرے پر کوئی اثر ڈال سکتی ہے—؟ لیکن اس کا جواب بھی میرے پاس موجود تھا— ناہیدیں پیدا ہو رہی ہیں—اور اس مرد اساس معاشرے کو آہستہ آہستہ اس کا جواب ملنے لگا ہے— ایک بدلتی ہوئی، جاگتی ہوئی عورت جو بچوں کی تربیت سے لے کر سیکس تک ہر مورچے پر اپنی شناخت ،اور مضبوطی بھی قائم رکھتی ہے— جیسے ایک عورت سہاگ رات میں اپنے شوہر سے پوچھتی ہے...... مجھے اپنی میڈیکل رپورٹ دکھاؤ—اس کے بعد ہی میں اس حسین رات کے لئے کچھ سوچ سکتی ہوں......اور یہاں اس نئے ماحولیات میں جنم لیتا ہوا مرد ہے، جواب ایسے سوالوں میں اپنی مردانگی تلاش نہیں کرتا— ڈائنا سور جیسے عظیم الشان ،قوی الجثہ جانوروں کی نسلیں ختم ہو گئیں کیونکہ اس کے پس پشت ماحولیات کو دخل تھا کہ جس قدر زمین، پانی اور ہوا ان کے نشو ونما اور زندگی کے لئے چاہئے تھا۔ وہ انہیں میسر نہیں تھے......مرد سے مردانگی کے عنصر چھینے جا رہے تھے......'

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی— مرد سکڑ رہا ہے...... میں نے کمال کی طرف دیکھا—

'تو تم گھر سے باہر تھے—'

'ہاں......'

'تم اپنے ہی گھر سے نکال دیے گئے تھے—'

'ہاں۔ یہ انوکھی بات تھی۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ میرے ہی گھر کے دروازے میرے لیے بند کر دیے گئے ہیں۔ اور مجھے میرے ہی گھر سے نکال دیا گیا ہے—اور مجھے نکالنے والی اور کوئی نہیں میری بیوی ہے۔'

'وقت کیا ہوا تھا؟'

'اس پورے ہنگامے میں رات کے بارہ بج چکے تھے۔ تنہائی مجھے خوفزدہ کرتی ہے...... پہاڑیوں کی ویرانی اور سناٹے کا احساس اس وقت آپ کو پاگل کر دے گا جب اچانک آپ کو احساس ہو کہ نیم شب میں آپ اکیلے اس بھیانک پتھریلے راستے اور ہزاروں فٹ نیچے کی گہرائیوں کا حصہ ہیں۔ میں نے دیکھا۔ دور تک درخت ہی درخت۔ آس پاس سے، کہیں سے بھی کتوں کے بھونکنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ہوا رک گئی تھی۔ پیڑ پودے ساکن و جامد کھڑے تھے۔ سامنے وحیدہ کا گھر تھا۔ پہاڑیوں پر یوں بھی گھر دور دور بنے ہوتے ہیں۔ میری خواہش ہوئی کہ وحیدہ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔ پھر خیال آیا کہ انہیں کہوں گا کیا— یہ کہ میری بیوی نے مجھے نکال دیا ہے۔ اس خوفناک سناٹے میں تاریکی کے آسیب جاگ رہے تھے اور میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو رہی تھی۔ میں دیر تک اپنے ہی گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ میں چیخ رہا تھا۔ پاگل ہو گئی ہو۔ میں رات کہاں گزاروں گا......دروازہ کھولو ناہید۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھولو...... میں نے ہزاروں بار بیل بجائی ہوگی۔ مجھے تیز نیند کا احساس ہو رہا تھا۔ اور قدم شل تھے...... میں یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ کیا ساری رات مجھے اسی مقام پر گزارنا ہوگا—؟ وہ بھی تنہا۔ کیا اس طرح میں زندہ رہوں گا؟ ایک طرف خوف اور دوسری طرف بھیانک سناٹا۔ میں سڑک کی طرف گزرتی ہوئی گاڑیوں کی تلاش میں آ گیا کہ شاید کوئی گاڑی نظر آئے تو فریاد کر سکوں۔ کار کی کنجی اور موبائیل دونوں گھر کے اندر رہ گئے تھے۔ میں ایک ایسا لاچار شخص تھا، جس کے پاس ان بھیانک لمحوں میں زندگی کا ہر دروازہ بند تھا— کوئی گاڑی مل جاتی تو میں کسی ہوٹل میں چلا جاتا یا کسی دوست کے پاس— کوئی بہانہ بنا دیتا۔ اس درمیان سڑک پر گشت کرتے ہوئے بھی دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ مجھے خیال آیا، گھر چلنا چاہئے۔ ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ ممکن ہے، ناہید کو مجھ پر رحم آ جائے۔'

'پھر—؟'

'میں جیسے ہی گھر کے دروازے پر آیا، میں حیران رہ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کی روشنی باہر تک آ رہی تھی۔ ناہید کا نام لیتے ہوئے میں تیزی سے گھر میں داخل ہوا...... میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ڈرائنگ روم، بیڈ روم۔ بیڈ روم میں پاشا ابھی بھی سویا ہوا تھا۔ ممکن ہے درمیان میں اٹھا ہو، پھر روتے روتے سو گیا ہو...... کچن، ٹوئلیٹ، باتھ روم۔ لیکن ناہید کہیں نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا۔ یقیناً وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہوگی اور ابھی مجھ سے چھپنے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ لیکن سوال یہ بھی تھا کہ ناہید اگر گئی تو کہاں گئی؟'

'تم نے تلاش کیا۔'

'ہر جگہ۔ گوشہ گوشہ۔ جہاں کہیں بھی میں تلاش کر سکتا تھا...... میں یہ بھی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر مان لیا کہ وہ کہیں چلی گئی ہے تو کیا اس

نے کوئی خط چھوڑا ہے—؟ مگر ایسا کوئی خط موجود نہیں تھا۔شاید یہ وہی وقفہ رہا ہوگا، جب میں باہر سڑک پر مدد کے لیے گاڑیوں کو تلاش کر رہا تھا۔ اور اسی درمیان ناہید نے یہ گھر چھوڑ دیا ہوگا۔ممکن ہے اس نے مجھے دیکھا ہو...... یوں بھی اس طرف راستوں کی کوئی کمی نہیں۔لیکن سوال ہے کیا وہ پیدل گئی۔کہاں گئی—؟ اب میں خطرہ محسوس کر رہا تھا۔میں نے اپنے دو چار دوستوں کو فون کر کے بتایا کہ ناہید گھر چھوڑ کر چلی گئی۔مجھے اس بات کا احساس تھا کہ آنے والا وقت میرے لیے سنگین ہوسکتا ہے—میں نے دوستوں کو یہی بتایا کہ ہمارا آپس میں کچھ جھگڑا ہوا۔جیسے جھگڑے عام طور پر میاں بیوی میں ہوتے رہتے ہیں۔مگر یہ جھگڑا اتنا شدید نہیں تھا کہ ناہید نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہو......'

'پھر؟'

رکمنی چھٹی پر تھی۔باشا کو گھر میں اکیلے چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔اس درمیان ایک گھنٹہ بعد میرے ایک دوست اپنی اہلیہ کے ساتھ آ گئے۔ باشا کو ان کی اہلیہ کے حوالے کر کے ہم ناہید کی تلاش میں نکل گئے۔گاڑی میں ہی چلا رہا تھا— مجھے خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں غصے اور جذبات میں ناہید نے کوئی غلط قدم تو نہیں اٹھالیا—؟ سات بجے تک ہم گھر واپس آ گئے۔میرا دوست خاموش تھا۔ہم دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچے کہ ناہید کے غصے نے اس کو خوفناک انجام تک پہنچا دیا۔'

'خوفناک انجام یعنی خودکشی......؟' میں کمال کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

'جی۔'

'یعنی تمہیں یقین ہے کہ رات جب تمہیں ناہید نے گھر سے باہر نکالا......یعنی میرا مطلب ہے تمہارے جاتے ہی اس نے خودکشی کا ارادہ کرلیا......؟'

'میں اس بارے میں نہیں جانتا۔'

'لیکن یہ کام تمہیں گھر سے باہر نکالنے سے پہلے بھی وہ کرسکتی تھی۔؟'

'جی......'

'پھر اس نے اتنا انتظار کیوں کیا—؟'

'مطلب......؟'

'مطلب تمہیں پہلے گھر سے نکالا اور پھر مرنے کے لیے گھر چھوڑ دیا—'

'یہ میں بھی نہیں سمجھ سکا۔' کمال کے چہرے پر حیرانی تھی۔

میں کمال کے چہرے کو دیکھ رہا تھا— 'تمہیں یاد ہے کمال۔تمہارے دوست نرمل اس اس نے کیا کہا تھا......تبدیلی آ رہی ہے۔اور بہت تیزی کے ساتھ—ہم ہر لمحہ تاریخ کی موت کے ساتھ جی رہے ہیں— ممکن ہے، اس فلسفے پر اعتبار نہ کیا جائے— مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ نوجوان نسل آگے بڑھتی ہوئی پیچھے دیکھنے کی قائل نہیں ہے اور اسی لیے اس نے تاریخ سے اپنی توجہ ہٹا کر مستقبل پر نظریں مرکوز کر رکھی ہیں۔اور اسی لیے......' میں نے کمال کی طرف دیکھا...... مجھے یقین نہیں کہ ناہید نے ایسا کیا ہوگا—اس کے لیے تاریخ سے زیادہ اس کا ہونا اہم تھا—مردہ تاریخ سے الگ وہ ایک مضبوط مستقبل سے نبردآزما تھی—اور اسی لیے اس نے نئے عہد میں جیتے ہوئے لغات تک کو بدلنے کا فیصلہ کیا—' ایک لمحہ کو رکا—یہ بات مجھے قائل نہیں کر پا رہی ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا—؟ یا وہ گئی تو کہاں گئی—'

'یہی تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔'

'اس کے بعد کیا ہوا؟'

'اس کے بعد کی کہانی تو آپ جانتے ہیں۔پولیس تفتیش۔مجھ پر شک کیا جانا......ناگارجن جی کا مدد کرنا......اور صوفیہ کا میرے گھر آنا......'

'صوفیہ......' میں نے کمال کی طرف دیکھا۔ابھی بھی ذہن میں چلنے والی آندھیوں کو سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔میں نے کمال سے پوچھا— کیا پولیس تفتیش میں کوئی ایسی بات سامنے آئی، جس سے کوئی سراغ مل سکے......؟'

'نہیں' کمال کچھ سوچتے ہوئے رکا— 'کتابوں کی الماری سے ایک بچکانہ سی تصویر ملی تھی— ٹھہریے۔ میں دکھاتا ہوں آپ کو۔ پولس دیر تک اس تصویر میں الجھی رہی۔ مگر وہ آخر تک سمجھنے سے قاصر رہی کہ یہ کیا ہے۔ پھر یہ تصویر پولس نے زمین پر پھینک دی۔'

'تصویر۔—'

'ہاں۔ وہ اکثر بیٹھی بیٹھی کاغذ پر کچھ آڑی ترچھی لکیروں سے تصویریں بنایا کرتی تھی۔ میں نے اکثر دیکھا تھا۔'

'کیا وہ تصویر ہے تمہارے پاس۔؟'

'ہاں کیوں نہیں—' کمال اٹھتے ہوئے بولا— 'میں نے جان بوجھ کر تصویر ضائع نہیں کی۔ کیا پتہ پولس کو کب اس تصویر کا خیال آ جائے۔ مگر......اس نے میری طرف دیکھا— 'آپ کو اس تصویر میں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ یہ معمولی چوہے بلی کی تصویر ہے......'

'چوہے بلی کی......' بطور مصنف اس پورے مکالمے میں، میں پہلی بار اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔ اور اس وقت میری جگہ ایڈگر ایلن پو آ گیا تھا...... جس کو اس تصویر میں ایک بڑا خزانہ ملنے کی امید پیدا ہو گئی ہو۔

کچھ ہی دیر میں کمال واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک میلا سا کاغذ تھا۔ میں نے کاغذ پر دیکھا......دو تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پہلی تصویر چوہے کی تھی۔ دوسری تصویر ایک بلی کی تھی۔ اور اس چوہے کو بلی کے پیٹ کے اندر دکھایا گیا تھا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ یہ ایک بچکانہ سی تصویر تھی جیسی تصویریں ہم بچپن میں بنایا کرتے تھے۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

'کیا میں یہ تصویر رکھ سکتا ہوں—؟'

'کیوں نہیں۔ کمال مسکرایا۔ بس اسی طرح کی تصویریں وہ اکثر بنایا کرتی تھی۔'

'کیا اس سے پہلے کبھی ناہید نے چوہے اور بلی کی تصویر بنائی تھی—؟'

کمال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا— 'نہیں۔'

میں نے تصویر جیب میں رکھ لی۔ لیکن یہی وہ لمحہ تھا جب ایک بلی غراتی ہوئی میرے قریب آ گئی تھی۔ مائی گاڈ...... میں نئی صدی کے ان ۱۵۔۱۴ برسوں کا محاکمہ کر سکتا تھا— ہر قدم پر ایک خوفناک انقلاب کا سامنا— یہ نئی صدی دنیا کو بدلنے والی صدی تھی— اور دنیا کو بدلنے کا خطرہ آئی ٹی انقلاب نے اٹھایا تھا......اچانک ہمارے بازار بدل گئے۔ آئی ٹی نے کارپوریٹ انڈیا کا چہرہ تبدیل کر دیا۔ پہلی بار کارپوریٹ انڈیا کے عالمی بازار نے لبریشن یا آزادی کے معنی کو سمجھا۔ ایک بڑی دنیا سامنے تھی۔ اور ایک نئی تہذیب— جہاں عالمی بازار کے سامنے مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہیں تھی— جہاں صرف انسانی ضرورتوں کے حصول کے لیے اس بازار کو سجایا جا رہا تھا اور اس طرح لندن، نیویارک اور بنگلور سب ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے— ایک دنیا تبدیل ہو رہی تھی۔ ساری دنیا کے لائف اسٹائل کم و بیش ایک ہی رہے تھے اور ایک نئی تہذیب اس آئی ٹی انقلاب میں پرورش پا رہی تھی......آزادی......اور اچانک آزادی کے اس خول سے ایک بلی غراتی ہوئی باہر آ گئی تھی......'

مجھے یاد آیا— ناہید نے غائب ہونے سے ایک دن قبل کمال کے کمرے سے جاتے ہوئے ایک بے رحم لفظ کی ادائیگی کی تھی......چوہا......تو کیا کمال کے لفظوں میں، میلے کاغذ پر بنی ہوئی یہ تصویر سچ مچ بچوں جیسی حرکت تھی—؟ یا ایک غراتی ہوئی بلی نے اس اسپیس ایج، آئی ٹی کلچر اور نئی تہذیب کے دہانے پر دستک دیتے ہوئے اپنی آزادی کے احساس کو زندہ کیا تھا—؟ اور ایک گوشت کی جھلی جیسے بدنما چوہے کو کھا کر اپنے پیٹ میں اتار لیا تھا......

کمال میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ مگر اس وقت میں کمال کو کچھ بھی بتانے یا سمجھانے سے قاصر تھا۔ ناہید کی پوری کہانی میرے سامنے تھی۔ مگر ابھی بھی ایک سوال رہ گیا تھا۔ آخری سوال ......خوفناک بلی کمزور چوہے کو نگل چکی تھی۔ باہر جنگل لرز رہا تھا......

میں نے کمال کی طرف دیکھا......میرا لہجہ کمزور تھا......آواز ٹوٹ رہی تھی......'پتہ نہیں مجھے یہ سوال کرنا چاہئے یا نہیں۔ مگر......تم سمجھ رہے ہو نا کمال......شاید ناہید کو جاننے کے لیے یہ سوال بھی ضروری ہے......'

'جی......'

'میں پہلے ہی اس سوال کے لیے معافی مانگ لیتا ہوں۔ مگر......جیسا تم سمجھ رہے ہو...... یہ بھی ایک سوال ہے۔ اور شاید میری نظر میں ضروری......'

'آپ پوچھ سکتے ہیں۔'

'بے حد شکریہ۔' میں نے کمال یوسف کی طرف دیکھا......'پرائیویٹ سوال ہے، لیکن پوچھنا ضروری ہے......'

لفظ کام نہیں کر رہے تھے...... میں نے غور سے کمال کی طرف دیکھا...... ناہید ناز کے ساتھ تمہارے تعلقات...... میرا مطلب سیکس کے وقت......' جنگل میں چیخ گونج گئی تھی......زیادہ تر ناہید ناز کیا پوز پسند کرتی تھی......؟'

کمال یوسف کی آواز سرد تھی......'زیادہ تر میں نیچے ہوتا تھا۔ اور وہ کسی بھیانک آندھی کی طرح مجھ پر سواری کرتی تھی......'

'ایلس ان ونڈر لینڈ' سے وہ غراتی ہوئی بلی اچانک میرے سامنے آگئی تھی۔ اور میں دیکھ رہا تھا......وہ خوش نظر آرہی تھی اور بار بار دیوار پر پنجے مارتی ہوئی اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

میں سکتے کی کیفیت میں باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سناٹا چھا گیا تھا۔

باہر تیز اٹھنے والی آندھی کے بعد، ایک کے بعد ایک منظر تبدیل ہو رہے تھے......جونا گڑھ کی حویلی......نیم شب حویلی کے خستہ وجود سے بلند ہوتی چیخیں......اور ان سب کے درمیان میرے کانوں میں ناہید کی آواز گونج رہی تھی......مرد سمجھتے ہیں کہ وہ مرد ہیں۔ دراصل جو طاقتور ہوتا ہے، وہی مرد ہوتا ہے۔ اس نئی دنیا میں دیکھیے۔ یہاں مرد اکثر ہار جاتا ہے......عورت جیت جاتی ہے......'

کمال کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ میں ابھی بھی ایک منظر کی زد میں تھا اور اس منظر نے جیسے مجھے منجمد کر دیا تھا۔ کمال کو دھکا دے کر باہر نکالنے کے بعد نیم شب کے سناٹے میں ہزیان کی کیفیت میں دروازہ کھول کر چپکے سے ایک عورت کا باہر نکلنا اور شب کے طلسم میں کھو جانا......خوفناک سیاہ پہاڑیوں کی آغوش میں ایک جسم کا تحلیل ہو جانا......

کیا کہانی ختم ہو گئی تھی۔

ہم ہر بار ایک بوجھ جیسی رات سے طلوع ہوں گے/
اور ہر بار/
ایک بوجھ جیسی رات میں سما جائیں گے/

●●

سفر آخر شب

ایک دن حیران کر دینے والی تبدیلیوں کے ساتھ/
یہ دنیا بدل چکی ہوگی/
کتّے گھروں اور سڑکوں پر سہمے ہوئے ہوں گے/
اور بلّیاں اپنے تیز نوکیلے پنجوں کے ساتھ غرّا رہی ہوں گی/

(1)

میں دلی آ گیا تھا۔ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دلی آنے کے بعد، کئی مہینوں تک میرے لئے ان خوفناک واقعات کے جنگل سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا تھا— چھ مہینے گزر گئے تھے اور یہ مدت بڑے سے بڑے حادثے کو بھولنے یا اس کے اثرات کو کم کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے— حقیقت کے پس پردہ بھی ایک حقیقت ہوتی ہے جسے ہم دیکھ نہیں پاتے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے— حقیقت ......اور جیسا کہ کہانی کے آغاز میں، میں نے بتایا تھا— میں کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا— دراصل یہ واقعات و حادثات کی کڑیوں کو جوڑنے اور سمجھنے کا عمل تھا، جیسا کہ ہم مصنف عام طور پر کرتے رہتے ہیں۔ اور مشکل یہ تھی کہ میں مسلسل اپنی تحریر کو کراس کر رہا تھا—

xxxxxxxxxxxxxx

xxxxxxxxxxxxx

xxxxxxxxxxxx

xxxxxxxxxxx

اور اچانک میں چونک گیا تھا۔ ایک دوسرے کو کراس کرتی ہوئی دونوں لکیریں اب نمایاں تھیں۔ کیا ان میں سے ایک صوفیہ اور دوسری ناہید تھی—؟ میں نے پھر کراس کو دیکھا اور اس بار پھر مجھے حیرت ہوئی۔ ان دونوں لکیروں میں کمال یوسف کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ کمال یوسف، یعنی ایک مرد چہرہ۔ اور تجزیہ کا دلچسپ موڑ یہی تھا کہ ناہید خاموشی سے نیم شب کے سناٹے میں اس کے گھر سے باہر چلی گئی اور ایک نیم شب خاموشی سے سہمی ہوئی صوفیہ اس کے پاس آ گئی— دونوں ہی صورتوں میں مرد مغلوب رہا کہ ایک خلاء میں گم ہو گئی اور دوسرے نے مرد میں سہارا ڈھونڈ لیا—y2k کے ان چودہ برسوں کی دریافت بھی مرد تھا؟ عورت لڑتے لڑتے بھی مرد کے وجود کے آگے جھک گئی تھی اور خود سپردگی کو ہی اپنی فتح سمجھ بیٹھی تھی۔ ناہید نے کسی حد تک اس روایت کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اب؟

کہاں تھی ناہید......؟

تو کیا ناہید کی کہانی سچ مچ ختم ہو چکی تھی......میرا دل قطعی طور پر یہ ماننے کو تیار نہ تھا— مگر دل کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہہ

سکتا کہ — وہ آئی، اس نے دیکھا اور اس نے فتح کرلیا۔ کیونکہ نیم شب کے سناٹے میں گم ہو جانے والی ناہید باغی تو ہو سکتی ہے مگر فاتح نہیں ہو سکتی۔

اور یہ چھ مہینے بعد کی کہانی ہے جب میں ایک بلی کو لے کر الجھ گیا تھا۔ وہ ایک پالتو بلی تھی جو اکثر دودھ پینے کے بہانے گھر میں آجاتی تھی۔ اور اس دن میں نے دیکھا...... میرے دروازے کے باہر ایک کتا کھڑا تھا۔ اور بلی میرے دروازے پر کھڑی ہوئی غرا رہی تھی۔ میرے لیے ایک دلچسپ منظر تھا۔ اور میں نے دیکھا کچھ دیر بعد ہی بھونکتا ہوا کتا آگے بڑھ گیا تھا۔ بلی کو انسانی وجود کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ آرام سے دم ہلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اور کمرے کے راستے کچن میں داخل ہوگئی۔ اور یہ وہی لمحہ تھا جب میں ایک جھٹکے سے کچن میں داخل ہوا۔ دروازہ بند کرلیا۔ بلی کچھ دور پر کھڑی دودھ کے برتن اور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں آسیب زدہ لگ رہی تھیں۔ وہ غرا رہی تھی...... سامنے کی کھڑکی کھلی تھی...... اور اس سے پہلے کہ میں کچن کی کھڑکی کو بند کرتا۔ میرے منہ سے تیز چیخ نکل گئی تھی۔ بلی نے غراتے ہوئے مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور پھر تیزی سے کھڑکی کے راستہ باہر چلی گئی تھی۔ میرے ہاتھوں پر پنجے سے نشانات واضح تھے اور ہلکی سی خون کی پرت بھی نظر آرہی تھی...... بیسن کے پاس خود کو شیشے میں دیکھتے ہوئے اور ڈیٹول سے کھرونچ والی جگہ کو صاف کرتے ہوئے مجھے اس بلی کی تصویر کا خیال آیا جسے ناہید اپنی غیر موجودگی میں چھوڑ گئی تھی — میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی...... وقت کے ساتھ بلیوں کے تیور بدل گئے ہیں۔ وہ حملہ کر سکتی ہیں۔

تیزی سے بجتی ہوئی ڈور بیل کی آواز کو سن کر میں چونک گیا تھا۔ آگے بڑھ کر میں نے دروازہ کھولا تو اچانک چونک گیا۔

'تم۔؟'

سامنے کمال یوسف کھڑا تھا۔ چہرہ پریشان۔ کندھے پر سفری تھیلہ۔ جینس پینٹ اور ٹی شرٹ پہنے ہوا مگر چہرے سے خوفزدہ۔

'کیا آپ مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے؟'

'اوہ۔ ارے ہاں...... اندر تو آجاؤ'

'شکریہ......'

میں اسے لے کر تیزی سے ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہ میرے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

'یہ کیا ہوا......؟'

'کچھ نہیں...... وہ بلی......' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

'بلی......' کمال یوسف چونک گیا تھا۔

'ہاں، بلیاں بہت تنگ کرتی ہیں......' میں پھر مسکرا دیا۔ 'اور یہ بھی سچ ہے کہ آپ بلیوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔' میں نے کمال کی طرف دیکھا۔ 'پہلے میں تمہارے لیے چائے تیار کرلوں۔ پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے......'

•••

چائے ختم ہوگئی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے۔ اس درمیان کمال یوسف غسل سے فارغ ہو کر کرتا پائجامہ تبدیل کر کے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے چائے ختم کر لی تھی...... اس نے بتایا کہ راستہ میں ہی اس نے ناشتہ کرلیا۔ اس لیے فی الحال ناشتہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے...... کھڑکی سے سورج کی شعائیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ مجھے احساس ہوا، سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اور کمال یوسف کی اچانک کی اس آمد میں کوئی راز ضرور پوشیدہ ہے۔ میں غور سے کمال کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا...... کمال نے نظریں جھکا لیں۔

'چھ مہینے پہلے جو کچھ ہوا۔ آپ تو اس کے گواہ بھی رہے ہیں۔'

'ہاں۔ بہت کچھ جو تم نے بتایا اور بہت کچھ جو میں نے محسوس کیا......'

'بالکل صحیح...... آپ کے ساتھ رہ کر میں کچھ کچھ آپ کی طرح واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ بالکل آپ کی طرح نہیں......' اس نے مسکرانے کی کوشش کی...... 'مگر...... کسی حد تک...... ہاں کسی حد تک میں ان تمام واقعات پر غور کر رہا تھا......'

’صوفیہ کیسی ہے؟‘ میں نے اچانک پوچھا تو کمال کا چہرہ اتر گیا..... ’پتہ نہیں۔ ممکن ہے اچھی ہو...... میں اس کے بارے میں بعد میں باتیں کروں گا۔ مگر.....‘ اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ’دراصل میں اپنی زندگی کے شب و روز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اپنی نئی زندگی سے اس قدر پریشان ہو گیا کہ راستہ صرف آپ تھے۔ اور میں نے بیگ اٹھایا۔ صوفیہ کو سمجھایا۔ رکمنی کو ضروری ہدایت دے کر آپ سے ملنے چلا آیا.....‘

’اوہ.....‘ مجھے اس کی اس نئی کہانی میں دلچسپی پیدا ہوئی......

’آپ کو یاد ہو گا ہم کب ملے تھے.....؟‘

’ہاں.....سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ جیوتی گینگ ریپ اور انڈیا گیٹ پر لوگوں کا جم غفیر۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انقلاب آ کر رہے گا......

’انقلاب.....‘ کمال مسکرایا...... انقلاب کبھی نہیں آتا۔ گونج ہوتی ہے۔ پھر گونج کرنے والے ہی سو جاتے ہیں۔‘ اس نے غور سے میرے چہرے کا معائنہ کیا......مگر...... اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہوں تو احساس ہوتا ہے۔ انڈیا گیٹ اور ناہید کی بغاوت میری زندگی کا نیا پڑاؤ ثابت ہوئی۔ اور جیسا آپ نے کہا تھا، واقعات کے تجزیے سے پہلے کسی بڑی لکیر کو گواہ بنا لو تو تجزیہ آسان ہو جاتا ہے۔ مگر آپ بھول گئے کہ انہی دنوں، ایک اور حادثے کی دستک سنائی دی تھی۔ بلکہ ایک سال پہلے سے اس حادثے کی دستک سنی جا رہی تھی۔‘

’اوہ‘ میں ایک دم سے چونکا اور مسکراتی آنکھوں سے کمال کی طرف دیکھا— ’تم صحیح جا رہے ہو دوست۔ اور کسی بھی نتیجہ تک پہنچنے کا یہ بہتر راستہ ہے کہ ہم ایک بڑے حادثے کو گواہ بنا لیں۔‘

’ہاں۔ میں نے یہی کیا۔ کیونکہ تبدیلیاں اچانک نہیں آتیں۔ تبدیلیوں کے پیچھے کئی موڑ ہوتے ہیں۔ آہ انہی دنوں دنیا بھر میں ایک قیامت کا ذکر ہو رہا تھا۔ اسپیس سماج، پرنٹ، الکٹرانک میڈیا ہر جگہ...... ایک ہی ہنگامہ تھا کہ کیا ۱۲ دسمبر ۲۰۱۲ کو دنیا ختم ہو جائے گی...... یوروپی ممالک میں تو کچھ لوگوں نے خود کو محفوظ کرنے کے لیے لائف جیکٹس تک خرید لیے تھے۔ ناہید کا ردعمل تھا کہ یقیناً یہ ہو گا اور صرف عورتیں رہ جائیں گی۔ کیونکہ دنیا اور اس کے نظام کو مردوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کمال نے میری طرف دیکھا— ’وہ کہتی تھی...... دنیا ختم ہو جائے گی اور ہم عورتیں اس دنیا میں طاقت ور ہو جائیں گی...... کچھ سہمی عورتیں ہوں گی، جن میں مردوں کے کچھ عنصر باقی رہ جائیں گے— مگر زیادہ تر فاتح، اور نئی اڑان کے پروں پر سوار ہوں گی مگر یہ دنیا ضرور ختم ہو گی.....‘

’ہونہہ۔‘ میں نے کمال کی طرف دیکھا۔ ’یہ سب مایا کلینڈر کا فساد تھا۔ مایا، یعنی ہزاروں برس قبل دنیا کی قدیم تہذیب...... قدیم امریکی تہذیب مایا کا کلینڈر اسی دن ختم ہوتا ہے...... اور اسی لیے یہ پیشین گوئی کی گئی کہ اس تاریخ کو دنیا ختم ہو جائے گی...... اور آپ غور کریں تو ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ نئی صدی کے آغاز پر بھی یہی کہا گیا کہ دنیا کے تمام کمپیوٹر اپنا کام کرنا بند کر دیں گے۔ اور یہ نظام خود ناکام ہو کر برباد ہو جائے گا۔

’اور اس کے لیے‘— کمال نے غور سے میری طرف دیکھا— y2k کے بارہ برس بعد...... یعنی ہندوستانی تاریخ میں وہ سال جب عصمت دری کے واقعہ کو لے کر ایک انقلاب برپا ہوا تھا اور دوسری طرف میڈیا یہ دیکھنے میں مصروف تھا کہ کیا سچ مچ قیامت آئے گی اور دنیا ختم ہو جائے گی...... اور ناہید کے لفظوں میں صرف عورتیں زندہ رہیں گی۔ مرد مارے جائیں گے.....‘ کمال نے مسکرانے کی کوشش کی...... قیامت نہیں آئی مگر آپ دیکھیں تو y2k کے بارہ برسوں، یعنی دلی، انڈیا گیٹ میں انقلاب کی نئی دستک تک، اگر کوئی بڑی تبدیلی آئی تھی تو وہ صرف عورتوں میں آئی تھی...... اور مجھے اپنے دوست نرمل کی بات یاد آ رہی تھی...... یعنی اگر بدلی تھی تو عورت۔ باغی ہوئی تھی تو عورت...... دوسری طرف اس کے ردعمل بھی تھے۔ یعنی سہمی ہوئی تھی تو عورت۔‘

’سہمی ہوئی.....‘ اس بار میں نے چونک کر کمال کی طرف دیکھا...... چلو...... کچھ دیر اس موضوع پر ٹھہرتے ہیں...... ’قدیم مایا تہذیب کے لوگوں کو علم و فنون پر بھروسہ تھا۔ وہ ستاروں پر نظر رکھتے تھے اور مستقبل کا حال کہہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی تہذیب کے خاتمہ کے بارے میں بھی پیشین گوئی کی تھی کہ سمندر کی طرف سے حملہ ہو گا اور ان کی تہذیب سمندر کی نذر ہو جائے گی...... اور جیسا جیسا انہوں نے کہا، غور کریں تو ہر دور میں وہی ہوتا گیا...... ڈائنا سورس آئے اور پہلے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ طوفانی ہوائیں چلیں، طوفان اٹھے اور دوسرا دور بھی ختم ہو گیا۔ تیسرا دور شعلوں کی نذر رہا...... چوتھا سیلاب اور پانچواں دور.....‘

کمال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی...... y2k کے ان چودہ برسوں میں یہ دنیا آہستہ آہستہ ہلاکت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور اس بار ان کے

پیچھے نہ گرم ہوائیں ہیں، نہ طوفان، نہ شعلے، نہ آندھی......اس باران کے پیچھے بلّی ہے۔اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی...... چوہوں کو کھانے کے بعد وہ آرام سے اپنی راہ چل دی۔ یا غائب ہو گئی۔' وہ آہستہ سے بولا...... میں اب اس تصویر کا مفہوم سمجھ چکا ہوں۔

'تو تم مانتے ہو کہ......'

'ہاں۔y2k کے بعد کی یہ دنیا عورتوں سے منسوب ہے۔اور ہم صرف مہرے۔اور اسی لیے اپنی نئی زندگی کا تعاقب کرتا ہوں تو ایک بڑی لکیر......' وہ مسکرا رہا تھا— یہ آپ ہی نے کہا تھا کہ اس سے چیزوں کے سمجھنے کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔مگر اسی واقعہ کی کڑی ناہید کا وہ بیان بھی تھا۔یعنی جو بیان اس نے مایا کلینڈر کو لے کر دیا تھا...... کچھ عورتیں فاتح ہوں گی اور کچھ......جن میں مردوں کی کچھ خصوصیات باقی رہ جائیں گی......وہ سہمی ہوئی ہوں گی۔

'تمہاری مراد صوفیہ سے ہے۔'

کمال نے گلا خشک کیا— 'ہاں۔اور اب اس نئی کہانی کی طرف آتا ہوں۔لیکن کیا مجھے ایک گلاس پانی ملے گا......؟'

'کیوں نہیں۔ابھی لایا۔'

حقیقت یہ ہے کہ میں کمال کو کچھ دیر کے لیے اکیلے چھوڑنا چاہتا تھا...... مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ وہ زندگی کی پہیلیوں کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

••

دوپہر، لنچ کے بعد ہم دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے۔کمال دیر تک سگریٹ کے کش لیتا رہا۔سگریٹ ختم کرنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا۔

'نئی صدی یا y2k کے ان چودہ برسوں میں ہم نے کیا پایا تو کہہ سکتے ہیں، ہم جیسے انسانوں کے لیے اس صدی کی سب سے بڑی سوغات ہے خوف...... قیامت کا خوف......دنیا کے ختم ہونے کا خوف...... یہ خوف عورتوں اور مردوں میں مختلف ہوتا ہے...... مجھے یاد ہے بچپن میں ہم دیوار پر چڑھتی ہوئی چھپکلی کو مارنے کے لیے چپل اٹھا لیتے تھے......اس کے برخلاف چھپکلی کو دیکھ کر عورتیں ڈر جایا کرتی تھیں۔ باتھ روم میں کاکروچ ہو تو عورتوں کی چیخ نکل جاتی ہے۔سانپ، چوہے، نامعلوم خوفناک مخلوق، آسیب، تاریکی، سناٹا، ویرانی......بچپن سے ہی ہم اپنے وجود میں خوف کی ایک سلطنت آباد کر لیتے ہیں مگر غور کریں تو کئی مواقع آتے ہیں، جب ہم خود کو خوف کی سرحدوں سے نکالنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔اور بڑی حد تک ہم اس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں مگر......' اس نے میری طرف دیکھا۔کچھ معاملے مختلف ہوتے ہیں۔اور اتنے مختلف کہ کبھی کبھی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔اور اسی لیے میں نے ضروری سمجھا کہ آپ سے ملاقات کی جائے......' وہ ایک لمحہ کے لیے رکا۔پھر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔صوفیہ کو تو آپ نے دیکھا ہے۔اور مجھے کہنا چاہئے......آپ کی موجودگی میں......'

'ہاں۔وہ ڈری سہمی رہتی تھی......'

'بالکل صحیح۔' کمال نے پلٹ کر میری طرف دیکھا— 'اور یقین مانیے میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ محبت اور خوف میں کیا یکسانیت ہو سکتی ہے—؟ مثال کے لیے میں آپ کو بتاتا ہوں۔آپ کے جانے کے دوسرے ہی دن میں آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک وہ آ گئی۔ ذرا ٹھہریے۔میں آپ کو وہ منظر دکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

کمال گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

(2)

یہ صبح کمال یوسف کے لیے عام صبح جیسی بالکل نہیں تھی۔صبح رکمنی نے اتنی زور سے ڈور بیل بجائی کہ اسے غیر متوقع طور پر پہلی بار اس پر ناراض ہونا پڑا۔

'آئندہ آپ اتنی زور سے بیل نہیں بجائیں گی۔سمجھ گئیں آپ۔'

'جی۔'

دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے،اور بے خیالی میں چلتے ہوئے وہ دروازے کے پاس رکھے گملے سے ٹکرا گیا۔یہاں بونسائی کانٹوں کی دنیا آباد تھی۔ایک دوست نے یہ کہہ کر اسے تحفہ دیا تھا کہ بری روحیں ان کانٹوں سے ہوکر باہر چلی جاتی ہیں اور گھر کا ماحول اچھا رہتا ہے۔بونسائی کانٹوں کے بارے میں یہ نئی معلومات تھی۔مگر اب جو کچھ اس گھر کے ساتھ ہو رہا تھا،اس نے دوست کے دعوؤں کو جھوٹا ثابت کر دکھایا تھا۔مثال کے لیے صوفیہ کے چہرے پر لکھی ہوئی خوف کی عبارت اسے بالکل بھی پسند نہیں تھی — تیسری واردات پینٹ کے جلنے کو لے کر ہوئی۔آفس جانے سے قبل اس نے ایک پینٹ صوفیہ کو آئرن کرنے کے لیے دیا۔جب جلنے کی مہک ہوئی اور وہ بھاگ کر کمرے میں گیا تو جلتا ہوا آئرن پینٹ کے اوپر رکھا ہوا تھا اور پینٹ سے دھواں نکل رہا تھا۔اور پاس میں ہی صوفیہ بیٹھی ہوئی تھی۔لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔وہ زور سے چیخا۔

'صوفیہ۔'

آگے بڑھ کر اس نے آئرن کو ہٹایا۔سوئچ آف کیا......صوفیہ کی طرف دیکھا،جس کی معصوم روتی صورت دیکھ کر وہ اپنا سارا غصہ بھول گیا۔

'صوفیہ۔آگ بھی لگ سکتی تھی۔'

'جی۔'

'تم آئرن کرنے آئی تھی......'

'ہاں۔'

'پھر......'

'پتہ نہیں۔'

'نیند آ گئی تھی۔؟'

'نہیں۔'

'نہیں۔' کمال چونکا...... پینٹ جل رہا تھا۔۔دھواں اٹھ رہا تھا اور تمہیں خبر نہیں۔؟'

'نہیں۔'صوفیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے — تمہارا نقصان ہو گیا۔پینٹ جل گئی۔میں بہت بری ہوں۔'

'ارے نہیں صوفیہ۔' کمال نے پینٹ کو کنارے کیا۔صوفیہ کو بانہوں میں لیا۔'پینٹ کا کیا ہے۔نئی آ جائے گی۔ویسے بھی پینٹ کی میرے پاس کمی نہیں ہے۔'

'لیکن میری وجہ سے......میں سچ کہتی ہوں۔مجھے نہیں معلوم۔مجھے کچھ نہیں معلوم......'

’لیکن تم یہیں تھی صوفیہ اور پینٹ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کمال نے مسکرانے کی کوشش کی— ’اور تم نے کہا تم نیند میں بھی نہیں تھی۔ بے خیالی میں ایسا ہو جاتا ہے۔‘

’میں تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔‘

’میرے بارے میں۔‘ کمال ہنسا۔ میرے بارے میں کیا سوچ رہی تھی......

’تم کیوں جاتے ہو باہر۔ مجھے چھوڑ کر۔ مت جایا کرو۔‘

’باہر؟‘ کمال نے آگے بڑھ کر اس کے رخسار کا بوسہ لیا۔ ہونٹوں کو چوما۔ اپنی آغوش میں بھر لیا......’میری ننھی سی جان۔ میری پیاری گڑیا۔ میں دفتر جاتا ہوں۔ کام کرتا ہوں۔ دو پیسوں کے لیے۔ نہ جاؤں تو زندگی کیسے چلے گی۔‘

’جو بھی ہو۔ مگر مت جاؤ تم...... مجھے ڈر لگتا ہے...... مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔‘

’کیوں؟ کمال نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

’پتہ نہیں۔‘

’ڈر کی کوئی وجہ تو ہوگی۔؟‘

’پتہ نہیں۔‘

’کوئی آسیبی خیال......؟‘

’نہیں۔‘

’کوئی آہٹ......کوئی دستک؟ تنہائی، خاموشی......؟‘

’نہیں......‘

’پھر۔؟‘

’تم......‘

’میں......؟ کمال اس بار چونک گیا تھا۔ مجھ سے ڈر لگتا ہے......؟‘

’نہیں۔‘

’ابھی تم نے کہا کہ مجھ سے ڈر لگتا ہے۔؟‘

’تم سے کیوں ڈروں گی۔‘ بچوں کی طرح ناراض ہو کر صوفیہ بولی— ’مجھے تمہارے جانے سے ڈر لگتا ہے......تم کہیں مت جایا کرو۔ بس میرے پاس رہا کرو۔‘

’ایسا کیسے ممکن ہے صوفیہ۔؟‘

’یہ میں نہیں جانتی......مگر ڈر جاتی ہوں۔ تم باہر جاتے ہو تو لگتا ہے......کوئی ٹیکسی تمہیں کچل دے گی۔ فلائٹ سے جاتے ہو تو لگتا ہے۔ ایئر کریش ہو جائے گا۔ ٹرین سے جاتے ہو تو لگتا ہے۔ ٹرین کا ایکسڈینٹ ہو جائے گا۔‘

صوفیہ بچوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کمال نے کبھی اس والہانہ محبت کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ناہید کے ساتھ رہ کر تو بالکل بھی نہیں۔ اس ننھی سی پری پر اسے بے پناہ پیار آرہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے صوفیہ کو چوم لیا۔ ہونٹوں پر گرم جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کی سہمی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا۔

’میری جان۔ میری پیاری صوفیہ۔ ایسا ہوتا ہے۔ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ انسانی نفسیات ہے صوفیہ کہ جن سے ہم پیار کرتے ہیں، ان کے لیے کہیں نہ کہیں ایک خوف بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، اس لیے تم خوفزدہ بھی رہتی ہو کہ مجھے کچھ ہو نہ جائے۔ مگر یقین رکھو۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔‘

’مجھے یقین نہیں ہوتا۔ میں سارا دن ڈرتی رہتی ہوں۔ تم باہر جاتے ہو تو میں سارا دن دروازے پر کھڑی رہتی ہوں...... جب تک تم آ نہیں

جاتے۔'
کمال نے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی ہلتی ڈولتی پتلیوں سے ابھی بھی خوف جھانک رہا تھا۔ کمال نے محسوس کیا کہ محبت اور خوف کے ملے جلے۔ رنگوں کی اس شروعات کو کئی مہینے ہو چکے ہیں۔ مگر وقت کے ساتھ صوفیہ اب پوری طرح سے خوف کا شکار ہو چکی ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ مگر اس وقت محبت کا مجسمہ بنی صوفیہ پر اسے بہت پیار آ رہا تھا۔

صوفیہ نے ایک بار پھر اس کی آغوش میں سمٹتے ہوئے کہا۔

'تم آفس نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں کسی بھی حال میں جانے نہیں دوں گی۔'

•••

کمال نے میری طرف دیکھا— 'حقیقت یہ ہے کہ میں اس وقت تک پیچیدہ ہوتی ہوئی صورت حال کا صحیح جائزہ نہیں لے پایا تھا۔ جیسے اب، وہ مسکرایا— میں سوچتا ہوں تو کئی اسرار سے پردے اٹھتے ہیں۔ مثلاً خوشی اپنے ساتھ دکھ بھی لاتی ہے اور محبت اپنے ساتھ توقعات اور فکر بھی۔ افسردگی اور بیزاری بھی۔ میں غور کر سکتا ہوں کہ یہ ایک طرح کی Anexiety تھی، جس نے صوفیہ کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ خوف، اندیشے اور تشویش میں گھرتی جا رہی تھی......

کمال خاموش ہوا تو صوفیہ کی زندگی کے تمام پچھلے صفحے میرے سامنے کھلتے چلے گئے۔ جب وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں گہرے سایوں کو جمع کر لیتی تھی۔ لیکن یہ اس کی ہمت تھی کہ اس نے وہ گھر چھوڑ دیا اور نینی تال کی ان وادیوں میں اسے پہلے زندگی گزارنے کو چھت اور پھر کمال یوسف کی محبت مل گئی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ صوفیہ ایک Disorder یعنی خوف سے گھر گئی ہے۔ میں اپنے طور پر اس کا تجزیہ کر سکتا تھا۔ بھائی اور بھیجو کے گھر میں بھی وہ محبت کو ترستی رہی۔ نینی تال کی وادیوں میں محبت کے لیے اس نے پرندوں کو اپنا دوست بنایا اور اب......؟ تو کیا خوف کے احساس سے صوفیہ کی شخصیت میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو چکا ہے—؟'

'لیکن ہوا کیا صوفیہ کے ساتھ؟'

'میں اسی کہانی پر آ رہا ہوں۔' کمال نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ہلکے سے مسکرایا— 'اور دیکھیے یہ سب میں نے آپ سے سیکھا ہے۔ اور یقین جانیے، اس سے واقعات اور اس کے Roots تک جانے میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں الجھن میں ہوں کہ ایسا کیوں ہوا......؟ میں نے اتنا تو جان ہی لیا ہے کہ یہ دنیا بے حد حساس لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ بے حد حساس لوگ ہمارے معاشرے کے طور طریقے کا حصہ نہیں ہو پاتے۔ کیونکہ وہ ہر وقت اپنی فکر میں الجھے ہوتے ہیں۔ اور اس لیے خوف چور دروازے سے چپکے چپکے ان پر حملہ کرتا رہتا ہے۔ شرم کا خوف......ہجوم کا خوف...... بند کمرے کا خوف......روشنی کا خوف......اور اس سے آگے......بجلی کی گرج......طوفان، پانی کا خوف...... میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ لاشعور میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ محفوظ ہوتا ہے جو واہمہ کا سبب بنتا ہے یا خوف پیدا کرتا ہے۔ اندھیرے کا خوف...... محبت کا خوف......'

کمال نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا— 'صوفیہ اپنی گزری زندگی کے بارے میں باتیں کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس لیے میں نے بھی کبھی اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ تاہم میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ محبت کی بھوکی رہی ہے اور یہ محبت اسے نہیں مل سکی۔ جیسے اس کے والدین جلد ہی گزر گئے۔ اور ایسے ماحول میں صوفیہ جیسی حساس لڑکی کے لیے محبت کیا معنی رکھتی ہے، اسے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے......'

'آگے کیا ہوا—' میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ اور میری خواہش تھی کہ کمال جلد سے جلد اس تجزیے کا کام مکمل کرے اور اصل کہانی کی طرف لوٹ آئے۔'

'بتاتا ہوں۔' کمال نے مسکرانے کی کوشش کی۔ کبھی کبھی زندگی سمجھ میں نہیں آتی۔ جیسے میں خوف اور اس خطرناک قسم کے Disorder کو نہیں سمجھ سکا اور یہاں تک کہ...... مجھے احساس ہوا میں نے اب تک جو کچھ بھی سوچا ہے، وہ فضول ہے۔ انسانی نفسیات کا تجزیہ کرنے میں، میں مکمل طور پر ناکام ہوں۔'

'میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں کمال......' میں آہستہ سے بولا...... 'مگر آخر ایسا کیا ہوا کہ تم اتنے الجھ کر رہ گئے۔'

'ان دنوں میں آفس کے ایک ضروری کام سے ملیشیا گیا ہوا تھا۔ یہ ٹور پندرہ دنوں کا تھا۔ پہلے تو صوفیہ نے خوب رونا دھونا مچایا۔ اسے بالکل منظور نہیں تھا کہ میں اسے چھوڑ کر باہر جاؤں۔ جبکہ رکمنی کو میں نے راضی کر لیا تھا کہ اس درمیان وہ اس کے ساتھ رہے گی اور باشا کی دیکھ بھال بھی کرے گی۔'

'پھر۔؟'

'ظاہر ہے مجھے جانا تھا اور اس کے لیے میں نے صوفیہ کو اپنے طور پر سمجھانے کی حد درجہ کوشش بھی کی تھی۔ میں ملیشیا سے واپس آیا تو اس گھر میں جیسے ایک نئی کہانی میرا انتظار کر رہی تھی۔'

'خوب۔' میں آہستہ سے بولا۔' کمال۔ تم پر پوری طرح میرا رنگ چڑھ چکا ہے۔'

میں نے کمال کو دیکھا۔ اس نے جیسے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئی تھیں۔

'بہتر ہے، میں وہ منظر آپ کو دکھا دوں۔ اس سے آپ کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملے گی۔'

•••

صوفیہ......صوفیہ......

صوفیہ......

بریف کیس لے کر کمال گھر میں داخل ہوا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بریف کیس اس نے ڈرائنگ روم میں رکھا۔ پھر صوفیہ کو آواز دیتا ہوا بیڈ روم میں آ گیا۔ صوفیہ یہاں بھی نہیں تھی۔ اوپر جانے والی سیڑھی کے پاس ایک چھوٹا سا اسٹور تھا، جس میں بیکار کے سامان رکھ دیئے جاتے تھے۔ کمال نے دیکھا......اسٹور کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ اور صوفیہ باہر کی طرف دیکھ رہی ہے۔ کمال نے چند فاصلے پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ اس کے باوجود اس نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

'صوفیہ......'

اس بار کمال ذرا زور سے بولا۔ اور اس کے قریب پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اچانک وہ چونکی۔

اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔' آپ آ گئے۔'

'ہاں۔'

'تمھیں کوئی خوشی نہیں ہوئی صوفیہ۔'

'خوشی کیوں نہیں ہوگی۔'

کمال نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں بے جان پتلیاں تھیں۔ جہاں کوئی حرکت نہیں تھی......اور یہ وہ صوفیہ قطعی نہیں تھی جسے وہ پندرہ روز پہلے چھوڑ کر ملیشیا گیا تھا۔ رکمنی سے عام طور پر اس نے صوفیہ کے بارے میں کبھی بھی کچھ بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اور اسی لیے گھر پہنچنے کے بعد کمال نے اسے دو دن کی چھٹی دے دی۔ لیکن ایسا لگا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے...... جانے سے پہلے وہ کمال کو دروازے پر مل گئی۔ اس کی آواز بوجھل تھی۔

'صاحب۔ میم صاب کی طبیعت اچھی نہیں۔'

'کیوں؟ کیا ہوا ہے۔'

'مجھے لگتا ہے ان پر پرانی ہوا سوار ہے۔'

'پرانی ہوا۔'

'ہاں صاب۔ میم صاب دن بھر اسٹور میں رہتی ہیں۔ وہاں باتیں بھی کرتی ہیں۔'

'اچھا۔ تم جاؤ۔ میں دیکھ لوں گا۔'

رکمنی کو چھٹی دینے کے بعد کمال کی پریشانیاں بہت حد تک بڑھ چکی تھیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر صوفیہ کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

•••

'کیا آپ بھوت پریت کو مانتے ہیں۔'

'نہیں۔'

'میں بھی نہیں مانتا۔' کمال نے اس بار غور سے میری آنکھوں میں جھانکا 'میں نے اس درمیان صوفیہ پر گہری نظر رکھی۔ خاص کر اسٹور پر۔ کہ وہ وہاں کیا کرتی ہے......

'پھر......'

'یہ سمجھنا میرے لیے بھی مشکل تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ یا اسے کیا ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی وہ اسٹور کو بند کر لیتی تھی۔ یا کبھی کبھی وہ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی بند کر لیتی تھی......اور دیر تک دیوار کا سہارا لے کر فکر میں ڈوبی رہتی تھی......'

'اوہ...... مجھے یاد آیا......صوفیہ کی زندگی کے پرانے صفحے آنکھوں کے آگے تھے......' میں نے ٹھہر کر پوچھا......

'کبھی اسٹور میں صوفیہ سے باتیں ہوئیں۔؟'

'ہاں۔'

'کیا وہ......ڈراکیولا......تابوت......ویمپائر......اس طرح کی باتیں تو نہیں کرتی تھی۔'

'بالکل بھی نہیں۔ کیوں؟' کمال نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے کمال کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا 'کیا صوفیہ کی محبت میں آپ نے کوئی کمی محسوس کی......؟'

'وہ اپنے آپ میں ہوتی ہی کب تھی۔ جو اس کمی کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔'

'ہونہہ۔' میں نے پھر کمال کی طرف دیکھا......اسٹور میں آپ کی صوفیہ سے کس طرح کی باتیں ہوئی تھیں؟'

'وہ......کمال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا......اس دن وہ اچھے موڈ میں تھی......اس نے میرا ہاتھ تھاما اور دیوار کی طرف اشارہ کیا......وہ دیکھو......وہاں خوب پانی ہے......وہاں بھی تم ہو......اور وہ دیکھو......مکڑی نے جالے بنا دیئے ہیں۔ لیکن تم وہاں بھی ہو......اور وہ دیکھو......دور......اونچی...... پہاڑی ہے......تمہیں کس نے کہا تھا اتنا اوپر چڑھنے کے لیے۔ تم وہاں بھی ہو......اور وہ دیکھو......وہ ٹوٹا پھوٹا ہوائی جہاز......ارے......تم وہاں بھی ہو...... میں نے محسوس کیا، اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ نہیں تھی......اس نے اپنے وجود کو اسٹور کے بند کیبن تک قید کر لیا تھا۔ اور اس کے باہر کی زندگی میں اس کے لیے کہیں کسی رنگ کا تصور نہیں تھا۔ وہ شدت بھی غائب تھی، جوان مہینوں میں، میں نے اس میں محسوس کی تھی......میں لوٹ آیا تھا مگر اس کی جذباتیت کہیں گم ہو گئی تھی......

'اف...... مائی گاڈ......' میں نے سر کو تھام لیا۔ ایسا واقعہ اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے اور اب میں بتا سکتا ہوں کہ صوفیہ کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ یہ محض قیاس نہیں ہے۔' میں ہنس رہا تھا......کمال پاگلوں کی طرح میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

'حقیقت یہ ہے کہ وہ آج بھی تم سے پیار کرتی ہے۔ اور اس شدت سے کہیں زیادہ۔'

'مگر کیسے۔؟ اب وہ اقرار تو نہیں کرتی۔'

ہاں۔ وہ نہیں کرتی اور تمہیں یاد ہوگا وہ تم کو اس شدت سے چاہتی تھی کہ خوف محسوس کرنے لگی تھی......

'ہاں۔'

'مجھے یاد ہے کہ جب میں تمہارے یہاں تھا، وہ ہر کچھ دیر بعد تمہیں دیکھنے کے لیے بھاگ کر آ جاتی تھی......'

'ہاں۔'

'جانتے ہو کیوں؟'

کمال میری طرف دیکھ رہا تھا......

'اس کی محبت نے خوفزدہ ہونا شروع کر دیا تھا۔ وہ تم سے اس قدر پیار کرتی تھی کہ دو سکنڈ کے لیے بھی تم اوجھل ہو جاؤ تو ڈرنے لگتی تھی۔

اوراسی لیےتمہارا کہیں بھی جانا اسے منظورنہیں تھا۔اورجیساتم نے ابھی کہا کہ وہ شروع سے محبت کے لیےترستی رہی تھی۔اوراسی لیےتم ملے تو صوفیہ کومحبت کی منزل مل گئی۔'

'جی۔' کمال میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں مسکرایا۔' کیاتم اب بھی نہیں سمجھ سکے۔'

'بالکل بھی نہیں۔اوراسی لیےتو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔'

'بہت آسان۔' میں زور سے ہنسا۔ پہلے وہ تم سے محبت کرتے ہوئے خوفزدہ تھی۔وہ بار بار ڈرتی تھی......اوراس لیے......' میں نے کمال کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا......

'اب وہ خوف سے پیار کرنے لگی ہے......'

'خوف سے؟' کمال حیران آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

'تم تو آتے جاتے تھے۔اس کے پاس رہتے کہاں تھے۔اس کا خوف بڑھتا جارہا تھا اورانتہا یہ ہوئی کہ اچانک تمہاری جگہ خوف آ گیا۔ تمہارے جانے کے بعدوہ کن خیالوں سے دوچار ہوئی، یہ کون بتا سکتا ہے۔مگرحقیقت یہی ہے کہ محبت اب بھی ہے۔اور یہ محبت کی شدت ہے کہ اس کی جگہ اب وہ خوف کو لے کرآ گئی ہے......'

'کیا وہ واپس ہوگی؟'

'یہ تم پر ہے۔'

کمال گہری سوچ میں گم تھا۔

میں نے کمال کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔'وہ تمہاری وجہ سے خوف میں گرفتار ہوئی ہےاوراس لیےخوف سے باہر لانا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔'

کمال کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ممکن ہے باہر دیکھتے ہوئے وہ جذبات کے خوفناک طوفان سے باہر نکلنے کی سعی کررہا ہو۔وہ جب میری طرف مڑا تواس کے ہونٹوں پرایک طنزیہ مسکراہٹ تھی......

کتنی عجیب بات ہے......اس نے دوباراس لفظ کو دہرایا۔' آپ سمجھ سکتے ہیں۔کتنی عجیب بات......میری زندگی میں دولڑکیاں آئیں......

ایک بغاوت کے راستہ پہاڑیوں میں سما گئی اوردوسری خوف کی وادیوں میں گم ہوگئی۔رہا میں......میرے حصہ میں تو کچھ بھی نہیں آیا......؟'

میں کمال کا چہرہ دیکھ رہا تھا......اس چہرے کے پیچھے ایک گہری دھند دکھائی دے رہی تھی......اوراچانک......مجھےاحساس ہوا......

سے نکل کردوصفر ہوا میں معلق ہوگئے ہوں۔اورجیسا کمال نے کہا،ایک صفر نے پہاڑیوں سے کودکر چھلانگ لگادی y2k اوردوسرے صفر نے اپنے لیےتاریک وادیوں کومنتخب کرلیا......

۳

اس کے ٹھیک دوسرے دن کمال چلا گیا۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ میں نے اس کہانی کو بھول کر ایک نئی کہانی پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر میں اس پوری کہانی سے ابھی بھی مطمئن نہیں تھا۔ خاص کر ناہید کے کردار سے۔ میرا دل کہتا تھا، ناہید مر نہیں سکتی۔ اور میرا دل ناہید کے اس انجام کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس دن......

شام کے ۴ بج رہے ہوں گے۔ ٹھنڈ شروع ہو گئی تھی...... میں پوش ایریا میں کوڑا بننے والے بچوں کی زندگی پر لکھنے کے لیے مواد اکٹھا کر رہا تھا۔ یہ ساؤتھ ایکس کا ایریا تھا۔ یہاں ایک عمارت بن رہی تھی اور دوسری طرف ایک قطار سے شاندار بنگلے بنے ہوئے تھے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک خوبصورت کار رکی۔ جینس پینٹ اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے ایک عورت شان سے گاڑی سے اتری۔ ریموٹ سے گاڑی کو بند کیا...... میری طرف پلٹی اور اچانک میں چونک گیا......

’ناہید......ناہید ناز......‘

میں غور سے اس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے عورت کی آنکھوں میں بھی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے اشارہ کیا...... آجاؤ......وہ شان سے اپنے بنگلہ کی طرف بڑھی۔ ڈوربیل بجائی......

ایک خوبصورت لڑکی نے دروازہ کھولا...... مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک تھی۔

’یہ ماریہ ہے۔ میرے ساتھ رہتی ہے۔‘

وہ مجھے لے کر اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

•••

’قید کو توڑ دے اور آزاد ہو جا۔‘

’میں ایسا راز ہوں جسے پانے میں صدیاں لگتی ہیں۔‘

دو منٹ کہہ کر ناہید اندر کمرے کی طرف گئی اور میں اس شاندار بنگلہ کے حسین ڈرائنگ روم کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ دیوار پر آویزاں قیمتی پینٹنگس۔ قیمتی صوفے۔ باہر ایک چھوٹی سی خوبصورت پھلواری۔ ہزاروں سوال بادلوں کے قافلے کی طرح آئے اور گزر گئے۔ کیا ناہید نے شادی کر لی۔؟ نہیں۔ تو پھر یہ بنگلہ؟ دل کسی صورت یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ صرف چند مہینوں کے اندر ناہید جیسی عورت اس قیمتی بنگلہ کی اکیلی مالک ہو سکتی ہے۔ باہر جو عورت ناہید کی صورت میں نظر آئی تھی، یہ وہ ناہید نہیں تھی، جسے میں نے انڈیا گیٹ پر یا پھر کمال یوسف کے گھر میں دیکھا تھا۔ یہ ایک نئی ناہید تھی۔ اس ناہید میں کسی ملکہ جیسی خصوصیات کے ساتھ زبردست خود اعتمادی بھی شامل تھی۔ اور اس وقت اس کے چہرے پر ایک ایسی مغرور ملکہ کی چمک تھی، جو اپنی سلطنت میں کسی کا دخل نہیں برداشت کرتی، کیا صرف کچھ مہینوں میں اتنی تبدیلی ممکن ہے......؟

فیس بک کے نوجوان مالک مارک زبرگر کا قول یاد آ رہا تھا کہ صرف ایک لمحہ آپ کو کچھ سے کچھ بنا سکتا ہے | مگر ان کچھ مہینوں میں ناہید

میں ایسی تبدیلیاں بھی آسکتی ہیں، کم از کم میں سوچنے سے قاصر تھا۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اکیلا میں تھا جو یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ناہید جیسی عورت کبھی خودکشی بھی کر سکتی ہے۔

میں ایسا راز ہوں جسے پانے میں صدیاں لگتی ہیں......

وہ سامنے آئی تو اچانک مجھے طلسم ہوشربا کی اس ساحرہ کی یاد آگئی جسے دیکھنے والا پتھر کا ہو جایا کرتا تھا...... وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ پاؤں پر پاؤں چڑھا لیا۔ ماریا ایک پلیٹ میں کچھ نمکین، کاجو اور بادام رکھ کر گئی۔ پھر ایک خوبصورت ٹرے میں چائے لے کر آئی اور چائے بناتی ہوئی بھی میری طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

ناہید نے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ کہا 'اس گھر میں مرد نہیں آتے۔ ماریا کو اسی لیے حیرت ہو رہی ہے۔آپ مصنف ہیں اس لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں......'

میں نے محسوس کیا...... ہر لفظ ناپ تول کر بولا گیا تھا۔ٹھہر ٹھہر کر۔اس درمیان چائے کے کپ خالی ہو چکے تھے۔ناہید کی گہری آنکھیں میری آنکھوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

'کیا آپ نے بھی مجھے مردہ سمجھ لیا تھا؟'

'نہیں۔'

'مجھے یقین تھا'، وہ پھر زیرلب مسکرائی۔

اس وقت میرا سابقہ ایک ایسی عورت سے تھا، جس نے اپنے احساس اور جذبات پر اس حد تک قابو پا لیا تھا کہ اس کے چہرے پر کسی بھی طرح کا تاثر پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پاؤں چلا رہی تھی۔ممکن ہے، مجھے دیکھنے کے بعد جونا گڑھ سے لے کر نینی تال تک کے واقعات اس کی نگاہوں میں گھوم گئے ہوں۔مگر وہ انجان بنی ہوئی، تاثر سے عاری چہرہ لیے خلا میں دیکھ رہی تھی......

'زندگی عجیب ہے......'

میں نے دانتوں کے بجنے کی آواز سنی......

'ہاں۔'

'اور پراسرار بھی۔'

'ہاں۔'

'کچھ لوگ ہوتے ہیں، جو جان بوجھ کر آسان زندگی کو مشکل بنا دیتے ہیں۔'

'شاید......'

'ہم اپنی شرطوں پر کیوں نہیں جی سکتے۔؟'

'جی۔'

'اپنی آزادی کے ساتھ......'

وہ اب بھی خلاء میں دیکھ رہی تھی اور کہنا چاہئے...... ہر لفظ کے ساتھ میں دانتوں کے بجنے کی آواز سن رہا تھا۔ ماحول کو ایک مغرور ملکہ کی موجودگی نے گہرے سناٹے میں تبدیل کر دیا تھا۔اس کی مسکراہٹ غائب تھی۔اب وہ میری طرف گھومی......

'تو آپ کو یقین تھا کہ میں......'

'میرے لیے تصور بھی محال تھا۔'

'کیوں......؟'

'کیونکہ اس طرح کے دم خم والی عورت......' میں کہتے کہتے ٹھہر گیا تھا۔اور اس وقت دم خم سے زیادہ بہتر لفظ مجھے کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا...... میں نے ایک ذرا توقف کے بعد کہنا شروع کیا...... کیونکہ ایسی عورت خودکشی کو سوچ بھی نہیں سکتی۔

اس نے کچھ نہیں کہا۔ نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ میں سوالوں کے ہجوم میں تھا مگر کہنا چاہئے، اس وقت سوال بھی سہمے ہوئے تھے......

میں نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا...... 'یہ بنگلہ......'

وہ پراسرار انداز سے مسکرائی...... 'آپ کو کیا لگتا ہے......'

'میں سوچنے سے قاصر ہوں۔'

'پھر بھی......؟ کسی نے تحفہ میں دے دیا......؟'

'نہیں۔'

'شادی کر لی۔ جہیز میں ملا؟' وہ مسکرائی تو پرانی ناہید کی جھلک مجھے نظر آ گئی......

'شاید...... نہیں......'

'شاید......' اس بار وہ کھل کر ہنسی...... زوردار قہقہہ لگایا...... 'آپ بھی شاید کہیں گے۔ مجھے لگا تھا، آپ مجھے جان گئے ہیں...... مسٹر رائٹر...... ایک بات یاد رکھیے۔ دنیا کا ہر رائٹر جھوٹا ہوتا ہے۔ وہ صرف اندازے لگاتا ہے۔ اور کبھی کبھی بیہودہ اور غلط اندازے۔ یہ دنیا اس کے اندازوں سے کہیں الگ ایک نئی پرواز لے رہی ہے یا لے چکی ہے......'

'جی......'

'رائٹر سمجھتا ہے، دعوے کرتا ہے کہ وہ سچ تک پہنچ گیا ہے۔ مگر کیا سچ مچ؟ میرے خیال سے نہیں۔ وہ سچ کے صرف ایک فیصد تک پہنچتا ہے۔ وہ بھی مشکل سے۔ اور اس پر وہ غرور کرتا ہے کہ وہ سچ اور حقیقت کی تہہ تک پہنچ چکا ہے۔

'مجھے وہ تصویر مل گئی تھی......' میں نے آہستہ سے کہا......

ناہید چونک گئی۔ میری طرف دیکھا...... 'وہ بلّی چوہے والی......؟' وہ شک سے میری طرف دیکھ رہی تھی......

'ہاں۔ اس لیے قیاس لگانا مشکل نہیں تھا کہ چوہے کو کھانے کے بعد بلی آزاد ہے۔ اور آزاد بلیاں خودکشی کا راستہ نہیں اختیار کرتیں......'

'گڈ۔ وہ شادی بھی نہیں کرتیں ا' اس کے ہونٹوں پر زہر بھری مسکراہٹ تھی۔ 'چوہے کچلنے کے لیے ہوتے ہیں......' اتنا کہہ کر وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی تھی...... کچھ دیر تک ماحول میں سناٹا چھایا رہا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چاندی کی رنگ آ گئی تھی۔ جسے وہ اپنی انگلیوں سے گول گول گھما رہی تھی......

'اس بنگلہ کے بارے میں بتا دوں آپ کو...... کوئی لمبی چوڑی کہانی نہیں ہے۔'

'جی......'

'وہاں سے میں دلی آ گئی۔ اسی گرلس ہوسٹس میں۔ وہاں تمام چہرے بدل گئے تھے۔ آپ کو ڈکشنری یاد ہے......'

'ہاں۔'

'میں ایک مہینے تک ڈکشنری کی اشاعت کے لیے غیر ملکی لٹریری ایجنٹ سے مسلسل رابطہ کرتی رہی...... پھر ایک دن ایک میل موصول ہوئی۔ لندن کی رائیل پبلشنگ ہاؤس کی میڈم رونا ٹیلر کی طرف سے۔ لکھا تھا۔ آپ اس پر کچھ اور کام کریں۔ آپ کا استقبال ہے۔ آپ پہلی خاتون ہیں جو دنیا کو بدلنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ آپ انڈین ہیں۔ اس لیے انگریزی لغات میں کام کرنے کے لیے آپ کو پریشانی ہوگی۔ مس جنیفر آپ کو ملیں گی۔ اور وہ آپ کو کاپریٹ کریں گی...... یہ ادارہ عورتوں کے لیے کام کرتا ہے اور اس میں کام کرنے والی صرف عورتیں ہیں۔ میری میڈم رونا ٹیلر سے فون پر بھی کئی بار بات ہوئی۔ وہ اس بات سے خوش تھی کہ میں ان کے مشن کو سمجھ رہی ہوں۔ یا میں اس مشن میں ان کے لیے زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے بہت سی باتیں دریافت کیں۔ مثال کے لیے میری پچھلی زندگی ا' ناہید ایک وقفہ کے لیے رکی۔ میری طرف دیکھا۔ پھر کہنا شروع کیا...... وہ اس بات سے خوش تھی کہ میں اب اکیلی ہوں اور اس نظام کا حصہ ہوں...... جہاں...... چوہے۔ صرف کچلنے کے لیے ہوتے ہیں...... ہاں تو، میں آپ کو جنیفر کے بارے میں بتا رہی تھی......

'جی۔'

'تین مہینے جنیفر کے ساتھ میں نے اس پروجیکٹ پر کام کیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس سطح پر سوچنے والی اکیلی میں نہیں ہوں۔ ایک دنیا تمہارے پاگل پن اور کارناموں سے گھبرا چکی ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے، تمہاری مردہ مردانگی سے۔ اور اسی لیے تیز رفتاری سے اسی نئی دنیا میں ایک نیا معاشرہ تیار ہو رہا ہے۔ اور تم سوچ بھی نہیں سکتے، بہت حد تک یہ نیا معاشرہ وجود میں آ چکا ہے۔ جنیفر اور دیگر کئی ممالک کی لڑکیاں، عورتیں ہمارے ساتھ ہیں۔ اور اس لیے اس سسٹم تک پہنچنا ضروری تھا جو تمہارے صدیوں سے ہتھیار رہے ہیں۔' ناہید مسکرائی...... لفظ...... شبد...... ورڈس...... ہم سوشل نیٹ ورکنگ کے ذریعہ بھی بلاسٹ کریں گے اور تمہاری مردانگی کے چیتھڑے اڑا دیں گے...... وہ ہنس رہی تھی...... اور تمہارا وہ منحوس کینچوا...... کیا نام تھا اس کا...... نرمل اساس...... وہ کسی حد تک اس تبدیلی کو سمجھ چکا تھا۔ مگر بیچارہ...... کچھ لوگ خوفزدہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور خوف زدہ ہو کر مر جاتے ہیں......' وہ ایک بار پھر زہر بھری کڑواہٹ کے ساتھ مسکرائی ۔جیسا میں نے بتایا، مجھے ابھی کام شروع کیے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے ہیں...... اور معلوم، ان تین مہینوں کے لیے مجھے کیا انعام دیا گیا......'

ناہید کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی...... یہ بنگلہ۔ اور ایڈوانس کے طور پر دو کروڑ کا چیک۔ رائیلٹی الگ...... وہ چوہا اس کام کی قیمت نہیں سمجھ سکا مگر رونا ٹیلر...... وہ عورت تھی اور جانتی تھی کہ لفظوں کی طاقت کیا ہے......

'جی'

کیا تم نے اس طاقت کا تجزیہ کیا تھا......؟

'نہیں......'

'تم کر بھی نہیں سکتے تھے۔'

میں ناہید کے نئے روپ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس وقت ذہن کے پردے پر رونا ٹیلر اور جینفر کی جو تصویر بن رہی تھی وہ مجھے حیرت میں ڈال رہی تھی۔

'کیا رونا اور جنیفر لیسبئن ہیں؟' میں نے اچانک پوچھا تو وہ زور سے چلائی۔ شٹ اپ...... بالکل نہیں۔'

ماریا باہر نکل کر آ گئی تھی۔ پھر ناہید کو خاموش دیکھ کر واپس لوٹ گئی۔

'ایک دنیا آزادی کے لیے پر تول رہی ہے تو لفظ کیوں قید رہیں گے؟ لفظوں کو آپ لوگوں نے غلام بنا رکھا تھا۔ اب لفظ آزاد ہو رہے ہیں......'

وہ غرور سے مسکرائی......' اور آپ دیکھیں گے، لفظوں کے آزاد ہوتے ہی اس دنیا کا مکمل نظام بدل جائے گا۔'

'آپ کے ہاتھوں میں ہوگا؟'

'کیوں؟ آپ کو ڈر لگتا ہے۔' وہ پھر زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی......

'لیکن آپ کو نہیں لگتا کہ......'

'کیا......؟'

'اس آزادی میں کچھ کمزور لوگ بھی شامل ہیں......'

'صوفیہ......' اس بار اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا......

'جی......' میں نے آہستہ سے کہا......' کیا آپ جانتی تھیں......'

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا...... تلخی اور نفرت بھرے احساس کے ساتھ مسکرائی ۔ میں سب جانتی تھی۔ کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں......'

'جی۔'

'کمزور لوگ، کمزور لوگوں کی پسند ہوتے ہیں اور آزاد لوگوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے......'

ناہید کے چہرے پر غرور آمیز چمک دوبارہ لوٹ آئی تھی......

میں نے آہستہ سے کہا ’یہ سماج ابھی بھی دو حصے میں تقسیم ہے۔ایک طرف گھنی پر چھائیاں ہیں اور دوسری طرف طلوع آفتاب کا طلسم۔ ایک آبادی خوف کی ہے، جو ایک بڑی دنیا کو آزاد ہونے سے روک رہی ہے...... ممکن ہے یہ توازن کے لیے ہو......‘

’کیوں؟‘

’زیادہ آزادی خطرناک بھی تو ہوسکتی ہے۔؟‘

’آزادی کبھی خطرناک نہیں ہوتی۔توازن، غلامی، یہ سب چوہوں کے استعمال شدہ ہتھیار ہیں، جسے وہ آج بھی مہذب دنیا میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔اور انہیں خوف اس بات کا ہے کہ دنیا کی ایک بڑی آبادی نے ہی اس کمزور ہتھیار کو ریجکٹ کر دیا ہے۔‘

’کیا آپ کہہ سکتی ہیں کہ آپ خوش ہیں؟‘

’کیوں؟ کمی کیا ہے میرے پاس......؟‘ اس کی آنکھوں میں اس بار جلاد جیسی چمک تھی ’جسے آپ کمی کہہ رہے ہیں وہ بھی غیر مہذب چوہے سماج، معاشرے اور مذہب کی دہائیاں دیتے ہوئے لائے ہیں۔‘

’فطرت؟ فطری اصول......جسم کی مانگ......؟‘ میں نے غور سے ناہید کی طرف دیکھا......آپ انسان ہیں تو یہ مانگیں لازمی ہیں۔مرد ہو یا عورت ان مانگوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا......آپ ابھی جوان ہیں تو کیا کوئی ایسی مانگ آپ محسوس نہیں کرتیں؟‘

میں غور سے ناہید کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔اس کے چہرے کے رنگ تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ مجھے یقین تھا، دھماکہ ہوگا......اور میرے خطرناک لفظ اپنا کام کر گئے تھے۔

اس بار وہ زور سے چیخی...... ’گیٹ لاسٹ۔بیٹھے کیوں ہو اب تک......اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے......‘

میرے سوال کو نظر انداز کرتی ہوئی وہ پھر غصے سے چلائی......’اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے......‘

میں اچانک کھڑا ہو گیا......مغرور ملکہ نے مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔ کچھ دوری پر ماریا کھڑی ہوئی مجھے زہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس بےعزتی کی چنداں پرواہ نہیں تھی۔مگر مجھے یاد آیا...... یہ جملہ کچھ کچھ سنا ہوا ہے......اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے۔مگر یہ جملہ کب کس نے کہا......اور اچانک میں چونک گیا تھا۔

باہر آنے تک یہ پوری کہانی کچھ ایسے صاف ہوگئی تھی جیسے کانن ڈائیل کے مشہور کردار شرلاک ہومز نے قاتل کے راز کو دریافت کر لیا ہو......

مائی گاڈ...... بنگلہ کے باہر آنے تک میرا جسم لرز رہا تھا...... مجھے یاد آیا...... جب ناہید ناز نینی تال والے گھر میں مجھے اپنی آپ بیتی سنا رہی تھی...... عظیم والے حادثہ کے بعد اس نے گھر چھوڑتے ہوئے اپنی اماں کے سامنے ٹھیک یہی مکالمہ ادا کیا تھا......اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے......میرا ذہنی افق اس وقت روشن تھا......تو اس ’باقی رہ گیا ہے۔‘ کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسے ایک چوہے کی ضرورت تھی۔یعنی کمال یوسف کی......اور جب یہ کام مکمل ہو گیا تو بلّی پورے طور پر آزاد تھی......اپنی شرطوں پر اپنی آزاد دنیا میں......

میں بنگلہ سے باہر آ گیا تھا۔گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ذہن میں سناٹا پسرا ہوا تھا۔اور اچانک میں چونک گیا...... مجھے احساس ہوا...... میرا جسم سکڑتا جا رہا ہے......سکڑتا جا رہا ہے......اور اس وقت فرانز کافکا کے لازوال کردار کی طرح میں ایک معمولی سے کیکڑے......نہیں چوہے میں تبدیل ہو گیا ہوں۔

گھر تک پہنچنے کے لیے مجھے اپنے جسم کو گھسیٹنا پڑ رہا ہے۔آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ عجیب عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔میں شرمندگی سے بچنے کے لیے مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔

ایک معمولی کیکڑا......نہیں...... چوہا......زمین پر رینگنے...... چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

Zauqui2005@gmail.com

مشرف عالم ذوقی

نام	:	مشرف عالم
قلمی نام	:	مشرف عالم ذوقی
پیدائش	:	۲۴؍مارچ ۱۹۶۲ء
وطن	:	آرہ (بہار)
والد کا نام	:	مشکور عالم بصیری
والدہ کا نام	:	سکینہ خاتون
شریکِ حیات	:	تبسم فاطمہ
اولاد	:	عکاشہ عالم

تصانیف

ناول:

۱۔ عقاب کی آنکھیں (پہلا ناول) ۱۹۷۹ء

۲۔ نیلام گھر تخلیق کار پبلشرز (اردو)
نیلام گھر نمن پرکاشن (ہندی)

۳۔ شہر چپ ہے تخلیق کار پبلشرز (اردو)
شہر چپ ہے بھاؤنا پرکاشن (ہندی)

۴۔ ذبح تخلیق کار پبلشرز (اردو)
ذبح بھاؤنا پرکاشن (ہندی)

۵۔ مسلمان (زیر طبع) (اردو)
مسلمان اندر پرستھ پرکاشن (ہندی)

۶۔ بیان تخلیق کار پبلشرز (اردو)
بیان شاشا پبلی کیشن (ہندی)
بیان نیشنل پبلشنگ ہاؤس (ہندی)

۷۔ پوکے مان کی دنیا ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (اردو)
پوکے مان کی دنیا شیلنائن (ہندی)

۸۔ پروفیسر ایس کی عجیب داستان ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (اردو)
پروفیسر ایس کی عجیب داستان سامییک پرکاشن (ہندی)

۹۔ لے سانس بھی آہستہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (اردو)
(ایک چاندنی رات ہوا کرتی تھی) ہندی

۱۰۔ آتش رفتہ کا سراغ

۱۱۔ نالۂ شب گیر
۱۲۔ اردو (زیرطبع)
۱۳۔ سرحدی جنّاح (زیرطبع)
۱۴۔ اڑنے دوذرا (زیرطبع)

افسانوں کا مجموعہ (اردو)

۱۔ بھوکا ایتھوپیا تخلیق کار پبلشرز
۲۔ منڈی ״
۳۔ غلام بخش ״
۴۔ صدی کو الوداع کہتے ہوئے ساشا پبلی کیشنز
۵۔ لینڈ اسکیپ کے گھوڑے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
۶۔ ایک انجانے خوف کی ریہرسل
۷۔ نفرت کے دنوں میں

ویب سائٹ پر

۷۔ ذوقی کے منتخب افسانے۔ تین حصے
(www.oneurdu.com پر ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے)

(ہندی)

۱۔ غلام بخش جن وانی پرکاشن
۲۔ فرشتے بھی مرتے ہیں جن وانی پرکاشن
۳۔ فزکس، کیمسٹری، الجبرا وانی پرکاشن
۴۔ بازار کی ایک رات (ان۔پی۔اچ)
۵۔ مت روسا لگ رام (ان۔پی۔اچ)
۶۔ فرج میں عورت گیان پیٹھ
۷۔ امام بخاری کا نیپکن پین گوئن
۸۔ لیبارٹری کانفلوئنس انٹرنیشنل
۹۔ ذوقی کی سریشٹھ کہانیاں (ان پی اچ)
۱۰۔ ذوقی کی متنوع کہانیاں نمن پرکاشن
۱۱۔ شاہی گلدان اروپرکاشن
۱۲۔ ذوقی کی کہانیاں
۱۳۔ بے حد نفرت کے دنوں میں
۱۴۔ سارا دن سانجھ (بزرگوں کی کہانیاں)
۱۵۔ ایک انجانے خوف کی ریہرسل
۱۶۔ شاہکار کہانیاں

تالیف

سرخ بستی (دو حصے) جن وانی
وبھاجن کی کہانیاں وانی پرکاشن
منٹو پر آٹھ کتابیں وانی پرکاشن
عصمت کی منتخب کہانیاں وانی
بیدی کی منتخب کہانیاں وانی
جوگندر پال کی منتخب کہانیاں وانی
احمد ندیم قاسمی کی منتخب کہانیاں وانی
مسلم بانی عورتوں کا کتھا راجکمل
احمد فراز کی منتخب شاعری وانی
ہنس کا مسلمان نمبر (اصغر وجاہت کے ساتھ معاونت)
اُداس نسلیں جن وانی